

گنجینہ گوہر
(خاک)

شاہد احمد دہلوی

مکتبہ نیادہ و کراچی

فہرست

۷	مقدمہ	جمیل جالبی
۱۷	مولوی نذیر احمد دہلوی	
۳۰	میر ناصر علی	
۴۸	استاد بیچود دہلوی	
۶۴	خواجہ حسن نظامی	
۸۰	بشیر الدین احمد دہلوی	
۹۹	مولانا غنایت اللہ	
۱۱۱	مرزا عظیم بیگ چغتائی	
۱۳۰	میراجی	
۱۴۴	منٹو	

بار اول ————— ۱۱۰۰

۱۹۶۲ء

قیمت ————— چھ روپے

ناشر ————— مکتبہ نیادور کراچی


طابع ————— مطبع سعیدی کراچی

۵

گنجینه گوهر

۴

۱۵۵	چکر مراد آبادی
۱۶۷	حکیم کیت دہلوی
۱۷۱	پروفیسر مرزا محمد سعید
۱۷۸	استاد بند و خال
۱۸۸	ایم اسلم
۲۱۰	جویش طبع آبادی
۲۳۳	جیل جالبی
۲۶۱	شاید احمد دہلوی



مقدمہ

یہ سطور لکھتے وقت میں سوچ رہا ہوں کہ گنجینہ گوہر جیسی اچھی کتاب کو آخر مقدمہ کی ضرورت ہی کیا ہے۔ مقدمہ کی ضرورت تو وہاں پڑتی ہے جہاں مصنف نیا ہو اور اپنے فن اور شخصیت کے تعارف کا محتاج ہو۔ یہاں معاملہ اس کے برعکس ہے۔ مقدمہ نگار تو ایک گننام شخص ہے جسے خود تعارف کی ضرورت ہے اور صاحب کتاب ایک نامور ادیب ہے جسے نہ کسی تعارف کی ضرورت ہے اور نہ تعریف و توصیف کی خواہش۔ وہ اپنی ادبی زندگی کے اس عروج پر پہنچ چکا ہے جہاں انسان شہرت اور ناموری کی خواہش سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ سوچتے سوچتے میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ شاہد صاحب نے ساری عمر چھوٹوں کو بڑا اور بڑوں کو ادب بڑا بنانے کا کام انجام دیا ہے۔ وہ جو کل گننام تھے آج انہی کی بدولت نامور ہیں۔ غالباً مقدمہ کے لئے اس برصغیر کے سارے سقراط بقراط چھوڑ کر میرا انتخاب بھی انہوں نے اسی لئے کیا کہ میرا نام بھی اس بلند پایہ کتاب کی بیساکھیوں کے سہارے شہرت کے پڑوں پر اڑنے لگے گا۔ اسے میں ان کی خاندانی شرافت، ذاتی محبت اور پر خلوص و صنداری

کے علاوہ اور کیا کہہ سکتا ہوں۔ شاہد صاحب سے میری ملاقات کو اب خیرے پندرہ سولہ سال ہو گئے ہیں۔ اس عرصہ میں میں نے انہیں اور انہوں نے مجھے بہت قریب سے ہر رنگ میں دیکھا ہے۔ ہر خوشی اور غم میں ہم ایک دوسرے کے شریک رہے ہیں۔ لکھنا پڑھنا بھی میں نے ساقی سے شروع کیا۔ ساقی کے ادارہ میں بھی کئی سال تک شامل رہا۔ چار پانچ سال تک "باتیں" کے عنوان سے ہر ماہ ادبی کالم لکھتا رہا۔ اور یہ نام آج بھی ساقی کے ادارہ میں شامل رہتا اگر سرکاری ملازمت کا طوق میں اپنے گلے میں نہ ڈال لیتا۔ شروع ہی سے میری یہ خواہش تھی کہ شاہد صاحب ان تمام لوگوں کے حالات قلمبند کر دیں جن سے ان کی ملاقات ہوئی ہے۔ میرا یہ خیال ہے کہ شاہد صاحب کی حیثیت ادب میں اس سنگم کی سی ہے جہاں پرانی اور نئی نسلیں آکر ملتی ہیں۔ جب میرا اصرار بڑھا تو وہ راضی ہو گئے۔ کہنے لگے سب سے پہلے میں ان ناموں کی فہرست مرتب کر لیتا ہوں تاکہ لکھنے میں آسانی رہے اور کوئی نام ذہن سے محو نہ ہونے پائے۔ فہرست بنانے بیٹھے تو فہرست بنی چلا گئی اور مکمل ہونے پر د آئی۔ جب تھک گئے تو نام گنے معلوم ہوا کہ تین سو بہتر نام ہیں اور ابھی بہت سے باقی ہیں۔ کہنے لگے بتاؤ جمیل صاحب اتنے سارے لوگوں کے تاثرات میں کیسے لکھ سکتا ہوں۔ اگر لکھوں تو بھوکا مر جاؤں۔ اس لئے میں نے ارادہ ملتوی کر دیا ہے۔ اطلاقا عزم ہے۔ میں نے فہرست دکھی اور دلیل سنی تو قدری کر لی۔ آخر یہ کام اس افراد تفری کے عالم میں ہو بھی کیسے سکتا ہے۔ اس کے لئے تو وقت چاہئے۔ فراغت چاہئے اور شاہد صاحب ہیں کہ بے چارے صبح سے شام تک اپنے بھرے پُرسے کنبے کا پیٹ پالنے میں لگے رہتے ہیں۔ کبھی ترجمہ کر رہے ہیں۔ کبھی فرائضی مضامین لکھ رہے ہیں۔ کبھی فیچر لکھ رہے ہیں اور کبھی ریڈیو پر کچے گانے گارہے ہیں۔ پیٹ کا دوزخ تو

کسی نہ کسی طرح بھرنا ہی ہے۔ کئی ماہ بعد مجھ پر پھر دورہ پڑا میں نے پھر اصرار کیا۔ دوا خانی جھگڑے اور کہا کہ ان تین سو بہتر ناموں میں سے صرف بارہ شخصیتوں پر لکھ دوں گا اور باقی تین سو ساٹھ پر اس وقت لکھوں گا جب حالات سازگار ہوں گے۔ آج اس بات کو بھی آٹھ دس سال ہو گئے ہیں۔ ان کے حالات ویسے ہی ہیں جیسے کہ تھے۔ مملکتِ ادب میں ساری عمر گزار کر اب گنا بجا کر پیٹ پالتے ہیں اور ہر وقت اس فکر میں گھلتے ہیں کہ کل کیا ہو گا۔ دلی میں تھے تو خوش حال تھے۔ جائیداد بھی تھی اور چلتا ہوا کاروبار بھی۔ مزے سے کھاپی کر اور آرام سے گرمیاں مسوری، شملہ، کشمیر اور نمینی تال میں گزار کر دس پندرہ ہزار خود بخود بچ جاتے تھے۔ یہ ذاتی باتیں ہیں اس لئے لکھ رہا ہوں کہ آپ بھی واقف ہو جائیں کہ ہمارے معاشرہ میں ادیب کا کیا انجام ہوتا ہے اور ساری زندگی ستم پیشہ معاشرہ اس پر کیسے کیسے مصائب اور ظلم ڈھاتا رہتا ہے اور یہ بے چارہ ادب کا دامن تھکائے ان سب آفات و بلیات کو سہتا رہتا ہے۔ بہر حال میرے مسلسل تعاونوں کے بعد شاہد صاحب نے خاکے لکھنے شروع کئے۔ کبھی سال میں ایک اور کبھی دو سال میں ایک۔ ۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۲ء تک بارہ سال کے عرصہ میں انہوں نے جتنے خاکے لکھے وہ اس کتاب میں یکجا کر دیئے گئے ہیں۔ ان میں سے بیشتر ”نیا دور“ میں شائع ہوئے ہیں اور کچھ ایسے ہیں جو غیر مطبوعہ ہیں۔

(۲)

اردو ادب میں خاکہ، مختصر انا کی طرح، ایک نئی صنف ہے۔ اس سے پہلے ہمیں طویل سوانح عمریاں تو ملتی ہیں لیکن ان کی حیثیت عام طور پر ادبی کم اور تاریخی زیادہ ہے۔ غالب کے فوراً بعد کے دور میں سوانح نگاری نے ایک خاص اہمیت حاصل

کر لی اور حالی کی یادگار غالب، حیاتِ سعدی، حیاتِ جاوید، شبلی کی حیاتِ ابوحنیفہ، المامون اور الفاروق وغیرہ سامنے آئیں۔ یہ چیزیں مستقل تصانیف ہیں اور ان میں کسی ایک شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو ہر زاویہ نظر سے دیکھا اور دکھایا گیا ہے۔ ان میں تاریخی اہمیت زیادہ اور کردار نگاری کا عنصر کم ہے۔ انگریزی ادب کے روز افزوں اثرات کے ساتھ ساتھ اردو ادب میں کچھ ایسی مختصر سوانح عمریاں لکھی گئیں جن میں کسی ایک کردار کو صرف اس اعتبار سے دیکھا گیا کہ وہ انسان کی حیثیت سے کیسا تھا۔ اس میں ذاتی، زادی، نظر اور ذاتی، تاثرات کو دلچسپ واقعات کے ساتھ اس طور پر پیش کیا کہ اس شخصیت کے خدوخال اور کردار نمایاں ہو جائیں۔ مرزا فرحت اللہ بیگ کا خاکہ ڈبٹی نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ میری زبانی اس سلسلے میں پیش رو کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے بعد یہ سلسلہ اتنا مقبول ہوا کہ اکثر اہل قلم نے اس کی طرف توجہ دی۔ مولوی عبدالحی نے ”چند ہم عصر“ لکھ کر فنِ خاکہ نگاری میں ایک سبب بہا اضاذ کیا۔ اس مجموعہ میں ایسے لوگ بھی شامل ہیں جو نہ تو ادیب و شاعر ہیں اور نہ سیاسی اور سماجی اعتبار سے اعلیٰ مرتبہ۔ کوئی مالی بے اور کوئی گناہ ساز شخص۔ لیکن لکھنے والے نے جس طور پر اس کی شخصیت کے بانگپن کو دیکھا اور پڑھنے والے کو دکھایا تو نام دیو مال کے کردار کی عظمت کے نقوش بھی دلوں پر ثبت ہو گئے۔ رشید احمد صدیقی نے ”گنج ہائے گرانمایہ“ لکھ کر مختلف ادبی و علمی شخصیتوں کو روشناس کرایا جس میں انہوں نے اپنے مخصوص مزاحیہ انداز میں واقعات جمع کر کے ایسی سنجیدہ چیزیں پیش کیں کہ ان کے پڑھنے سے جیتا جاگتا انسان (جو ہر وقت انسان رہتا ہے) سامنے آ جاتا ہے اور وہ کام جو مصور اپنے موقلم سے نہیں کر سکتا تھا۔ صاحبِ قلم نے قلم سے کر دکھایا۔ اثراتِ صبوحی کی دلی کی عجیب جیتا

بھی اسی سلسلہ کی اہم کڑی ہے معمولی لوگ لیکن اپنے فن اور نہر کے بادشاہ۔ اپنی وضع داری اور خصائل پر جان دیدینے والے اند اس پر اثر صوبی کی نکالی اور نکھری سٹھری زبان۔ اس مجموعہ کے پڑھنے سے قاری ایسی جیتی جاگتی مستیوں سے متعارف ہوتا ہے کہ جنہیں مخصوص اوصاف کی وجہ سے فن کار کا نام دیا جاسکتا ہے۔ چراغ حسن حسرت نے "مردم دیدہ" میں اپنے جادو بیان قلم سے مزاج کے ساتھ ساتھ زندہ انسان پیش کئے ہیں۔ "دوزخی" لکھ کر عصمت چغتائی نے اس صنف ادب کو ایسی فنکارانہ چابکدستی سے استعمال کیا کہ یہ چیز انسان سے قریب آکر انسان سے زیادہ دلچسپ بن گئی۔ اس خاکہ کی تکنیک "اندازِ بیا" اور زادی نگاہ تیکھا اور غیر معمولی تھا۔ بہن نے بھائی پر لکھا۔ وہ چاہتی تو اسے فرشتہ بنا دیتی۔ اسے بھیا کو دوزخی بتایا۔ لیکن پڑھنے والے کو اس دوزخی سے اتنا پیار ہو جاتا ہے کہ اس کی شخصیت کا جادو سرچڑھ کر بولنے لگتا ہے۔ اس خاکہ نے فن خاکہ نگاری کو حد درجہ متاثر کیا۔ اسکے بعد تو گویا یہ صنف ایسی مقبول ہوئی کہ رسالوں میں عام طور پر نظر آنے لگی۔ آج جب بھی کسی ادیب یا شاعر کا خاص نمبر نکالا جاتا ہے تو اسکے فنی پہلوؤں سے زیادہ اس کی شخصیت پر زور دیا جاتا ہے۔ نقوش نے دو ضخیم جلدوں میں اردو ادب کی ادبی و علمی شخصیتوں کے خاکے مرتب کر کے شائع کئے ہیں۔

یہاں یہ بات بے عمل نہ ہوگی کہ خاکہ نگاری اور افسانہ کے مین میں مختصر افسانہ میں کردار نگاری کا سلسلہ شروع ہوا۔ افسانہ نگار عام زندگی میں کسی عام آدمی سے متاثر ہوا اور اسے اس تاثر میں تخیل کی سحر کاریوں کا اضافہ کر کے ایک انسانی کردار پیش کر دیا۔ منظر نے اس قسم کے بہت سے کردار مثلاً بابو گونی ناٹھ موہل

اور کالی مشلوار کا شکر وغیرہ اردو ادب کو دیئے۔ عصمت کرشن چندر اور دوسرے افسانہ نگاروں نے اسی قسم کے خاکہ نگارانے لکھے۔ انتظار حسین کی "لکھی زردیہ" کا کردار بھی اس صنف ادب سے تعلق رکھتا ہے۔ گویا خاکہ ایک ایسی صنف ادب قرار پائی جس میں کسی ایسے انسان کے خدو خال پیش کئے جائیں، کسی ایسی شخصیت کے نقوش ابھارے جائیں جس سے لکھنے والا خلوت اور جلوت میں ملے ہو۔ اس کی عظمتوں اور لغزشوں سے واقف ہو اور تمام تاثرات کو ایسے سنگتہ انداز میں پیش کرے کہ پڑھنے والا بھی اس شخصیت کی عظمت سے واقف ہو کر اسے ایک کردار کے طور پر قبول کرے جو ان تمام انسانوں سے ذرا سا مختلف ہو جن سے ہم اور آپ اپنی زندگیوں میں دوچار ہوئے ہیں۔ خاکہ نگاری میں قوتِ مشاہدہ، ماضی کے واقعات کو یاد کر کے پیش کرنے کا ڈھنگ اور ان سب واقعات کو اپنے زادیہ نظر کی لڑی میں پردہ و خوبصورت ہار یا گلہ مستہ بنانے کا سلیقہ خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ اس اعتبار سے خاکہ نگاری سیرت نگاری کے فن سے بالکل ایک الگ صنف ادب بن جاتی ہے دراصل جدید خاکہ نگاری مختصر افسانہ سے بہت قریب ہے۔ اس نے مختصر افسانہ ہی سے واقعات و تاثرات کی ترتیب سیکھی ہے اور اپنے مزاج اور اندازِ نظر سے خود افسانہ کو متاثر کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان مختصر افسانہ کی طرح خاکہ بھی ادب کی مقبول ترین صنف ہے۔

(۳)

آج کے خاکہ نگاروں میں جن لوگوں نے اچھے اور کامیاب خاکے لکھے ہیں ان میں شاہد احمد دہلوی کا نام سب سے پہلے آتا ہے۔ خواجہ حسن نظامی، عظیم بیگ چغتائی،

بہنو دہلوی، میرزا نصر علی، جوش ملیح آبادی، جگر مراد آبادی اور استاد ہندو خاں وغیرہ ایسے خاکے ہیں جو زلزلے کی سرد گرم ہواؤں سے بے نیاز و ہرگز ہمیشہ دلچسپی سے پڑھے جائیں گے۔ شاہد صاحب کا اپنا لب و لہجہ ہے۔ ان کا اپنا طرز بیان ہے۔ ان کی زبان نکسالی اور با محاورہ ہے اور وہ واقعات کو اس طور پر ترتیب دیتے ہیں کہ بھرپور تاثر قاری کے ذہن کے نہاں خانوں میں داخل ہو جاتا ہے۔ شاہد صاحب کے خاکوں کا ایک وصف، جو اردو میں خال خال نظر آتا ہے، یہ ہے کہ وہ انسان کو ان سمجھتے ہیں۔ اسے فرشتہ نہیں سمجھتے۔ وہ اس کی کمزوریوں کو بھی اتنی ہی اہمیت دیتے ہیں جتنی اسکی خوبئیں کو۔ اسی لئے ان کے خاکوں میں ایک خاص قسم کی بے تکلفی پیدا ہو گئی ہے۔ یہ بے تکلفی واقعات میں بھی ملتی ہے اور انداز بیان میں بھی۔ یہی وہ فنی خلوص ہے جو ان کے خاکوں میں اثر و تاثر کا جادو جگا دیتا ہے بہت سے لوگ اس بے تکلفی پر ہانک بھروز چڑھاتے ہیں لیکن اہل میں دیکھنے کی بات یہ ہے کہ پورا خاکہ پڑھنے کے بعد قاری کے ذہن پر اس شخصیت کا کیا اور کیسا اثر قائم ہوتا ہے۔ کیا وہ انسان تباشر کی طرح بیٹھ جاتا ہے یا مینارہ کی طرح بلند و بالا نظر آنے لگتا ہے۔ اگر تاثر تباشر کا ہے تو خاکہ نگار اپنے فن میں ناکام ہے۔ اگر اثر آفرینی مینارہ کی ہے تو وہ کامیاب ہے۔ اس نقطہ نظر سے ان خاکوں کو پڑھئے تو آپ کو ان ساری شخصیتوں پر پیار آئے گا۔ یہ چھوٹے بڑے لوگ آپ کو اچھے لگیں گے اور دوسرے لوگوں سے ذرا مختلف بھی۔

شاہد صاحب کے خاکوں کی اثر آفرینی، مقبولیت اور دلکشی کا ایک سبب انکا انداز بیان اور طرز ادا ہے۔ ان کی نثر اس سایہ دار درخت کی سی ہے جس کے نیچے بیٹھ کر تنکا ماندہ مسافر ٹھوڑی دیر آرام کر سکے جس کے میٹھے پھلوں کا ذائقہ ایک

طرت اس کی بھوک مناسکے اور دوسری طرت زبان کے چٹخاروں سے روحانی کیفیت حاصل کر سکے۔ میں شاہد صاحب کی نثر کو اسی ذائقہ اور چٹخارہ کے لئے پڑھا ہوں تاکہ جدید نثر کے محرکے اعظم کی طیش اور جھلسا دینے والی کڑی دھوپ سے کچھ دیر کے لئے عافیت پاسکوں۔ ان کی نثر میں مجھے خوشبو کا احساس ہوتا ہے۔ وہ خوشبو جو جدید نثر میں کبیں کہیں اور کبھی کبھی محسوس ہوتی ہے۔ ان کی نثر نہ صرف شگفتہ ہے بلکہ واقعات کے موتیوں کو بھی دل کے تار میں پروتی چلی جاتی ہے۔ ان کی عبارت میں نہ تو انگریزی کے الفاظ آتے ہیں اور نہ فارسی و عربی کے الفاظ شان و شوکت اور گھن گرج پیدا کرنے کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں۔ محاورہ دل کا بر محل استعمال و ذوق کا صحیح تصرف اس طور پر ہوتا ہے کہ ہر لفظ زندہ اور جیتا جاگتا محسوس ہوتا ہے۔ جو آپ سے بات کرتا ہے۔ آپ کو تھپکتا اور جھنجھوڑتا ہے اور الفاظ کے ذریعہ خیال کا احساس کی پوری تصویر پڑھنے والے کے سامنے آکھڑی ہوتی ہے۔

زبان کا صحیح استعمال اور محاوروں کو برتنے کا سلیقہ ان کا خاندانی وصف ہے۔ شاہد احمد دہلوی کی نثر میں دلی اسکول کا وہ سارا باگپن موجود ہے جو ہمیں الگ الگ ڈپٹی نذیر احمد اور محمد حسین آزاد کے ہاں نظر آتا ہے۔ آزاد کی نثر میں استعاروں کی کثرت ہے۔ وہ ایک بات کو کئی کئی استعاروں کے ذریعہ خوبصورت توازن کے ساتھ ادا کرتے ہیں۔ ان کی عبارت رنگین اور تخیل کے زور سے شگفتہ ہو جاتی ہے۔ نذیر احمد محاوروں کو کثرت سے استعمال کرتے ہیں۔ ان کی نثر صاف، طرز بیان رواں اور بے ساختہ ہے۔ شاہد احمد دہلوی کے ہاں نہ استعاروں کی کثرت ہے نہ محاوروں کی۔ ان کی عبارت میں نہ وہ شوخی ہے جو آزاد کے ہاں نظر آتی ہے اور نہ وہ غراوت جو نذیر احمد کے ہاں ملتی ہے۔ لیکن ان دونوں صاحب طرز ادیبوں کی نثر

کے امکانات جس نقطہ پر ملتے ہیں وہاں سے شاہد احمد دہلوی کی نشر پیدا ہوتی ہے۔ جس میں استعارے محاورے روزمرہ اور رچی ہوئی زبان، مزاج کی سنجیدگی اور شگفتگی کے ساتھ مل کر ایک نئے لب و لہجہ کو جنم دیتی ہے۔ ان کی نثر میں محاورے ایسے ٹھٹھاٹ ہاٹ اور ٹھٹے سے استعمال میں آتے ہیں کہ انہیں کسی دوسرے لفظ یا محاورہ سے نہیں بدلا جاسکتا۔ نہ وہ بہت دور تک نذیر احمد کے ساتھ چلتے ہیں اور نہ محمد حسین آزاد کے ساتھ۔ لیکن دونوں کو اپنے ساتھ لئے، دونوں کے مزاجوں کو اپنے مزاج کے خمیر میں گوندھ کر ایک نیا مرکب تیار کرتے ہیں۔ آپ کو ان کے ہاں ان دونوں کی گوج تو ضرور سنائی دے گی لیکن ساتھ ساتھ یہ احساس بھی ہوگا کہ یہ ان دونوں سے مختلف ہے۔ شاہد احمد کی نثر میں نذیر احمد اور محمد حسین آزاد موجود ہیں بھی اور نہیں بھی۔ ان کی نثر نذیر احمد اور محمد حسین آزاد کی نثر کا ایک نیا امکان ہے۔

یہ بات کھ کر میں نے سوچا کہ کیوں نہ دو چار مثالوں سے اپنی بات کی وضاحت کر دوں۔ لیکن مسودہ کی ورق گردانی کر کے میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ ان کے انداز بیان اور لب و لہجہ کی چھاپ ہر ہر سطر میں نمایاں ہے اس لئے پوری کتاب نقل کر دینے سے بہتر یہی ہے کہ آپ میرے اس خیال کی تائید میں سارے خاکے خود ہی پڑھ ڈالنے اور پڑھنے کے بعد انہیں اس بات کی مثال سمجھ لیجئے۔ شکریہ۔

جمیل جالبی

۵ جولائی ۱۹۶۲ء

مولوی نذیر احمد دہلوی

میں نے مولوی نذیر احمد صاحب کو پانچ برس کی عمر میں آخری بار دیکھا اس سے پہلے دیکھا تو مزدر ہوگا مگر مجھے بالکل یاد نہیں۔ مجھے اتنا یاد ہے کہ تم تین بھائی ابا کے ساتھ حیدر آباد دکن سے دہلی آئے تھے تو کھاری باؤلی کے مکان میں گئے تھے۔ ڈیوڑھی کے آگے صحن میں سے گزر کر پیش دالان میں گئے یہاں دو تین آدمی بیٹھے کچھ کھ رہے تھے۔ پچھلے دالان کے دروں میں کیواروں کی جوڑیاں چڑھی ہوئی تھیں جن کے اوپر رنگ برنگ شیشوں کے بستے بنے ہوئے تھے۔ یہ تین دروازے تھے جن میں سے دو کھلے ہوئے تھے اور ایک دائیں جانب کا بند تھا۔ اس کمرے نما دالان میں ہم ابا کے ساتھ داخل ہوئے تو سامنے ایک پلنگ پر ایک بڑے میاں دکھائی دیئے۔ ان کی سفید ڈاڑھی اور کنوٹ مرث یاد ہے۔ ابا جلدی سے آگے بڑھ کر اُن سے لپٹ کر رونے لگے اور ہم حیران کھڑے رہے۔ جب اُن کے دل کی بھڑاس نکل گئی تو ہمیں حکم ہوا کہ دادا ابا کو سلام کر دو۔ ہم نے سلام کیا، انہوں نے پیار کیا، ایک ایک اثرونی مسب کو دی اور ہم کمرے کے اندھیرے سے گھبرا کر باہر نکل آئے اور کھیل کود میں لگ گئے، اس کے بعد انہیں پھر دیکھنا نصیب نہیں ہوا۔

مرزا لار جنگ نے جب انہیں حیدر آباد بلایا تو انہوں نے یہ کہہ کر آنے سے انکار کر دیا کہ میں امرائنٹ گورنمنٹ کو چھوڑ کر دیک گورنمنٹ میں نہیں آتا۔ جب انہوں نے امرار کیا تو تنخواہ

اتنی زیادہ طلب کی کہ وہ کسی قاعدے سے اتنی رقم نہیں دے سکتے تھے۔ اس دشواری کو یوں حل کیا گیا کہ مولوی صاحب کے ساتھ ان کے دو دامادوں کو بھی اچھی تنخواہوں پر رکھ لیا گیا۔

مولوی نذیر احمد کو زمانہ سازی بالکل نہیں آتی تھی۔ سچی بات کہنے میں انہیں باک نہ ہوتا تھا۔ حیدر آباد دکن میں بڑے بڑے عہدوں پر مامور ہوئے مگر خوش کسی کو نہ کر سکے۔ اسی وجہ سے زیادہ عرصے تک دہاں درہ سکے اور پیش قدمی کر دلی چلے آئے۔ ان کے لئے "غیر جنگ" کا خطاب تجویز ہوا تھا۔ مگر انہوں نے اسے قبول نہیں کیا۔

نواب افتخار علی خاں دہلوی ریاست جاوہر کے بھائی نواب سرفراز علی خاں مرحوم بہت بیجا تھے۔ ان کے لئے طبیعوں کی کیا کمی تھی؟ دنیا بھر کے علاج کرائے مگر شفا نہ ہوئی۔ ایک دن انہوں نے مولوی نذیر احمد کو خواب میں دیکھا کہ ان سے کہہ رہے ہیں: "ہمارے قرآن کا ترجمہ چھپوا لو۔ چھپے ہو جائیگا۔" نواب صاحب نے میرے والد کو دلی خط لکھا اور اس خواب کی رو داد بیان کر کے ترجمہ شائع کرنے کی اجازت مانگی، والد صاحب نے اجازت دے دی اور صرف ترجمہ قرآن و دہری خوبصورت جلدوں میں ریاست جاوہر کے چھاپ خانے سے شائع ہوا۔ خدا کی شان کہ نواب صاحب بالکل تندرست ہو گئے اور جب اس واقعہ کے کوئی بیس سال بعد میں ان سے ملا تو سترے بہتر سے ہو چکے تھے۔ مگر وہ ایک بڑا خوب صورت نیا عمل بنوا رہے تھے۔ کیونکہ انہوں نے ایک اور نئی شادی کر لی تھی۔

مولوی احمد حسن صاحب احسن التفاسیر مولوی نذیر احمد کے خویش تھے۔ ایک دن مولوی نذیر احمد کے ہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ مولوی احمد حسن نے دیکھا کہ ڈپٹی صاحب کی گھنٹیاں بہت سیل ہو رہی ہیں۔ اور ان پر سیل کی ایک جڑ چڑھی ہوئی ہے۔ مولوی صاحب سے نہ ہا گیا، بڑے اگر آپ

اجازت دیں تو جھانوسے سے آپ کی گھنٹیاں ذرا صاف کر دیں۔ ڈپٹی صاحب نے اپنی گھنٹیوں کی طرف دیکھا اور ہنس کر کہنے لگے: "میاں احمد حسن یہ سیل نہیں ہے۔ میں جب مجبور سے آکر پنجابی کٹے کی مسجد میں طالب علم بننا تھا تو رات رات بھر مسجد کے فرش پر گھنٹیاں لٹکائے پڑھا کرتا تھا۔ پہلے ان گھنٹیوں میں دھم پڑے اور پھر گتے پڑ گئے۔" دیکھو، اگر تم انہیں صاف کر سکتے ہو تو صاف کر دو۔ اس کے بعد اپنا وہ زمانہ یاد کر کے ابدیدہ ہو گئے۔ اور مولوی احمد حسن بھی رونے لگے۔

مولوی صاحب بڑے فخر سے اپنے بچپن کے مصائب بیان کرتے تھے۔ جس مسجد میں ٹھہرے تھے اس کا قلم بڑا بد مزاج اور بے رحم تھا۔ کڑکڑاتے جاڑوں میں لیک ٹاٹ کی صف میں یہ لپٹ جاتے اور لیک میں ان کے بھائی۔ سات آٹھ سال کے بچے کی بساط ہی کیا، علی الصبح اگر آنکھ نہ کھلتی تو مسجد کا قلم ایک لٹ لٹ سیسہ کرتا اور یہ لٹ لٹکے چلے جاتے اور صف بھی کچھ جاتی اس زمانے کے طالب علموں کی طرح انہیں بھی جتنے کے گھروں سے روٹی مانگ کر لانی پڑتی تھی۔ دن اور گھر بندھے ہوئے تھے۔ اپنی گھروں میں سے ایک گھر مولوی عبدالقادر صاحب کا بھی تھا۔ روٹی کے سلسلے میں جب ان کے ہاں آنا جانا ہو گیا تو نذیر احمد سے اُدپر کے کام بھی لئے جانے لگے۔ مثلاً بانا سے سودا کھانا، مسالہ پینا۔ لڑکی کو بہلانا۔ لڑکی بڑی منڈی تھی۔ ان کا کوٹھا توڑتی۔ اور انہیں مارتی پٹیتی رہتی۔ ایک دفعہ سال پیتے میں مرچوں کا بھرا سوا ڈبہ چھین کر ان کے ہاتھ پکھل ڈائے۔ قدرت کی قسم ظر فی دیکھئے کہ یہی لڑکی آگے چل کر مولانا کی بیوی بنی۔

مولوی نذیر احمد بڑے غیور آدمی تھے۔ سسرال والے خاصے مُردہ الحال تھے۔ مگر انہوں نے اسے گورانا نہ کیا کہ سسرال والوں کے ٹکڑوں پر پڑ رہیں۔ جب ان کی شادی ہوئی تو غالباً پندرہ پٹے کے ملازم تھے۔ اسی میں الگ ایک کھنڈلائے کر رہتے تھے۔ میں نے بڑی بوڑھیوں سے سنا ہے کہ ان کے گھر میں صرف ایک ٹوٹی ہوئی جوتی تھی۔ کبھی بیوی ان لہیروں کو ہٹا لیتیں کبھی میاں۔

دلی کالج سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد انہیں کوئی سرکاری ملازمت نہیں ملی تو سخت پرہم ہوئے۔ پرنسپل سے جا کر ایک دن بولے کہ مجھے سرکاری ملازمت اگر نہیں دی گئی تو اہلوں کی ڈنڈی کمروں کا اور اس پر دلی کالج کی سند لگا دوں گا مگر اس کی نوبت نہیں آئی اور انہیں ملازمت مل گئی۔

مولوی عنایت اللہ مرحوم منشی ذکار اللہ دہلوی کے بڑے صاحب زادے تھے۔ یہ وہی مولوی عنایت اللہ ہیں جو علی گڑھ کالج کے ابتدائی زمانے کے گریجویٹ تھے اور اردو میں ترجمہ ایسا کرتے کہ اس میں طبع زاد تصنیف کا مزہ آتا۔ اخیر میں حیدر آباد دکن میں ناظم الترجمہ بھی رہے۔ کچھ تو منشی ذکار اللہ کی نسبت سے اور کچھ اپنی غیر معمولی قابلیت کی بنا پر مولوی صاحب مرحوم سید احمد خاں کے مقررین میں شامل تھے اور ان کے سرکاری کے فرائض بھی انجام دیتے تھے۔ مولوی صاحب نے بتایا کہ ایک دفعہ سید احمد خاں کالج کے لئے چندہ جمع کرنے لاہور گئے۔ ان کے سب رفیق ہمرکاب تھے۔ سید صاحب کو توقع تھی کہ زندہ دلاں پنجاب سے بہت روپیہ ملے گا۔ سو دوست۔ سو دشمن۔ سید صاحب کے مخالفین میں مولویوں کی ایک بااثر جماعت بھی تھی جس نے سید صاحب اور ان کے ہم خیال لوگوں کو "نیچری" موسوم کر کے خوب مخالفت پر سکینڈ کیا تھا۔ سید صاحب لاہور پہنچے اور شہر کے اخباروں اور پوسٹروں کے ذریعے ان کے آنے اور خطاب کرنے کی خبر شہر کی گئی کہ بعد نماز جمعہ شاہی مسجد میں سید صاحب لکچر دیں گے۔ انہیں امید تھی کہ خلقت کا خوب ہجوم ہو گا مگر مولویوں کی مخالفت جماعت کا زہر پھیل چکا تھا۔ نماز جمعہ کے بعد جب سید صاحب کھڑے ہوئے تو سارے نمازی انہیں نیچری اور کافر کہتے ہوئے باہر نکل گئے۔ صحت مندی بھر آدمی بیٹھے رہ گئے۔ سید صاحب اس ماحول کے لئے بالکل تیار نہیں تھے ایسے روز مجھے اور شکستہ دل ہوئے کہ محبت ہی ہار بیٹھے۔ جانے قیام پر بے حد مایوس ہو گئے اور اپنی ناکامی پر تفت کرنے لگے۔ ان کے رفقاء نے ان کی ڈھارس بہ حوائی مگر کوئی صورت حالات کو سنبھالنے کی

مجھ میں نہ آئی۔ بالآخر سید صاحب نے فرمایا "نذیر احمد کو دلی سے لاؤ تو شاید کچھ کام ہوں سکے۔" منشی ذکار اللہ انہیں لانے کے لئے بھیجے گئے کیونکہ ڈپٹی صاحب خود بڑے مندری اور مثالی طبیعت کے آدمی تھے اور سوائے منشی ذکار اللہ کے اور کوئی انہیں رام نہیں کر سکتا تھا۔ سید صاحب بعض امور میں انہیں اختلاف مزبور تھا لیکن مسلمانوں کی تعلیم و ترقی کے باب میں وہ سید احمد خاں کے حافی و مددگار تھے۔ نذیر احمد کا اس زمانے میں طوطی بول رہا تھا۔ اور وہ ہر طبقے میں لیکچر بت بڑے عالم دین سمجھے جاتے تھے اور لوگوں کو یہ گمان بھی تھا کہ ڈپٹی صاحب نیچریوں کے خلاف ہونے کی وجہ سے سید صاحب کے مخالفین میں سے ہیں اور غالباً وہ اسی وجہ سے اس سفر میں سید صاحب کے ساتھ گئے بھی نہیں تھے۔ لیکن جب ڈپٹی صاحب کو یہ معلوم ہوا کہ سر سید کی لاہور میں یہ درگت بنی تو محبت منشی ذکار اللہ کے ساتھ ہو گئے۔ لاہور پہنچے ہی ایک بڑا پوسٹر شائع کیا گیا کہ نیچریوں سے مقابلہ و مناظرہ کرنے کے لئے دلی سے ایک بہت بڑے جفا داری مولوی کو بلایا گیا ہے اور بعد نماز جمعہ شاہی مسجد میں یہ معرکہ ہو گا۔ شہر میں یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی اور ہر مسلمان کو شوق و تحسین ہوا کہ ان مولوی صاحب کو دیکھنے کو کس کس طرح نیچریوں کو پھنسیاں دیتے ہیں لوگ جوق در جوق آنے لگے اور شاہی مسجد میں تل دھرنے کو جگہ نہ رہی۔ نماز کے بعد مولوی نذیر احمد کھڑے ہوئے اور نیچریوں کی ہوائی سے ان کا لکچر شروع ہوا سننے والوں میں بڑا جوش و خروش تھا۔ نذیر احمد کا لکچر خلا جانے کیسے کیسے پہلو بدلتا ہوا کہاں پہنچا۔ جب لکچر ختم ہوا تو علی گڑھ کے لئے روپیہ برس رہا تھا اور اپنی نیچریوں کے ہاتھ چمے جا رہے تھے، اور لوگوں کو معلوم ہوا کہ یہ جفا داری مولوی نذیر احمد ہیں۔ مولوی عنایت اللہ مرحوم فرماتے تھے کہ جب ہم لاہور سے دلی واپس آ رہے تھے تو ایک ہی ڈبے میں سب سوار تھے پھر سید احمد خاں نے کسی بات کے سلسلے میں کہا "مولوی صاحب! میں اس حال میں بھی نہیں ہوں کہ آپ کے جوتے کے تسمے باندھوں۔" مولوی نذیر احمد کھڑے ہوئے اور تھپتھپاتے آداب بجالائے۔

سر سید احمد خاں عمری مولوی نذیر احمد سے بیس بائیس سال بڑے تھے اور عوام کے علاوہ انگریز حکام میں بھی بہت معزز تھے۔ مولوی نذیر احمد بھی ان کی بڑی عزت کرتے اور داتے دے، قدرے سچے ان کی مدد کرتے۔ ایک دفعہ علی گڑھ کالج میں ایک ہندو ماسٹر نے لاکھوں روپے کا غنیمت کیا اور کالج جاری رکھنا محال ہو گیا۔ اس خبر کو سنکر مولوی نذیر احمد دتی سے علی گڑھ پہنچے اور ہر طرح کی دھار کس بندھائی۔ بولے: اگر روپے کی ضرورت ہو تو یہ روپیہ اس وقت موجود ہے بے لوار بھی دول گا۔ اور اگر کسی خدمت کی ضرورت ہو تو میں حاضر ہوں۔ سر سید اس غلوں سے بے حد متاثر ہوئے۔ اسی زمانے میں مولوی نذیر احمد کے دونوں مشرف الحق اور مشرف الحق علی گڑھ میں پڑھتے تھے۔ (ڈاکٹر اشرف الحق نے بتایا کہ) نانا ابا نے ہمیں سید صاحب کے کمرے میں بلوایا تو ہم نے دیکھا کہ ان کے پاؤں میں بوٹ ہیں اور وہ ٹانگیں میں پسر سید کی طرف کئے نہایت بد تمیزی سے میٹھے تھے میں۔ (ڈاکٹر اشرف نے چپکے سے ان سے کہا) نانا ابا پاؤں نیچے کر لیجئے۔ بولے: یہ اپنی کی تعلیم کا نتیجہ ہے۔ سر سید ہمیں پٹے۔

نامتوسی صاحب (جو غالباً شمال مغربی صوبے کے لفٹنٹ گورنر تھے) مولوی نذیر احمد کے بڑے قد و داں دوست تھے۔ ان کی آمد کی اطلاع پا کر مولوی صاحب ان سے ملنے گئے۔ چیرپائی نے ایک مختصر شکل کے کالے آونی کو دیکھا تو کوٹھی کے دروازے پر روک لیا۔ مولوی صاحب نے لاکھ چاہا کہ کسی طرح تعارفی کارڈ صاحب تک پہنچا دے مگر وہ شس سے مس نہ ہوا۔ اسے یہ بھی بتایا کہ میرے پرنے ملنے والے ہیں مگر وہ بھلا انہیں کیوں گردانتا؟ آخر کار مولوی صاحب نے دو روپے بٹے میں سے نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھے اور کہا: بھائی اب تو لٹہ پہنچا دے۔ یہی تو وہ چاہتا تھا۔ جھٹ کا ڈٹے کر اندر چلا گیا اور فوراً ہی مولوی صاحب کی طلبی ہو گئی۔ مولوی صاحب کمرے میں داخل ہوئے تو نامتوسی صاحب سرودہ کھڑے ہو گئے اور بولے: مولوی صاحب مزاج شریف! یہ کہہ کر انہوں نے ہاتھ ملانے کے لئے اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔ مولوی صاحب نے کہا:

میرا اس وقت ٹھیک نہیں ہے اور میں آپ سے ہاتھ بھی نہیں ملا سکتا۔ نامتوسی نے حیران ہو کر پوچھا: کیا ہوا مولوی صاحب آپ کو؟ بولے: آپ کا چیرپا دو روپے مجھ سے لینے کے بعد آپ تک مجھے لایا ہے۔ صاحب تو یہ سنتے ہی آگ بگولہ ہو گئے۔ اس چیرپا کو آواز دے کر بلایا اور پوچھا: تم نے مولوی صاحب سے دو روپے لئے؟ روپے اس کی جیب میں موجود تھے انکار کیسے کرتا؟ کہنے لگا: جی ہاں! صاحب نے خطی سے کہا: تم ہر فراموشی اور مولوی صاحب سے بولے۔ لائے اب ہاتھ ملاتیے۔ مولوی صاحب نے ہاتھ نہیں بڑھایا اور کہا: مگر وہ میرے دو روپے تو مجھے واپس نہیں ملے۔ صاحب نے پھر اس چیرپا کو آواز دی اور اس سے مولوی صاحب کے دو روپے واپس دولے۔ بولے: اب ہاتھ ملاتیے۔ مولوی صاحب نے اب بھی ہاتھ نہیں بڑھایا۔ صاحب نے متعجب ہو کر پوچھا: اب کیا بات ہے؟ مولوی صاحب نے کہا: میرے دو روپے مجھے مل گئے اس کا تصور معاف کیجئے اور اسے بحال کر دیجئے۔ صاحب جیسے کہیں ہونے مگر مولوی صاحب کی بات بھی نہیں ٹال سکتے تھے۔ آخر بولے: جاؤ مولوی صاحب کے کہنے سے ہم نے تمہیں بحال کیا۔ یہ کہہ کر پھر ہاتھ بڑھایا اور اب کے مولوی صاحب نے بھی ہاتھ بڑھا دیا۔

مولوی نذیر احمد صاحب علی گڑھ کے لئے چند ہاگ انے کے سلسلے میں بہت کار آمد آدمی تھے۔ اس لئے جہاں تک ممکن ہوتا سر سید انہیں اپنے دوروں میں ساتھ رکھتے اور ان سے تقریریں کرتے۔ نذیر احمد کی قوت تقریر کے متعلق کہا جاتا تھا کہ انگلستان کا مشہور مقرر برکٹ بھی ان سے زیادہ موثر تقریر نہیں کر سکتا تھا۔ اب بھی اگلے وقتوں کے لوگ جنہوں نے مولوی صاحب کے لکچر سنے ہیں کہتے ہیں کہ یا تو ہم نے ڈپٹی صاحب کو دیکھا یا اب اخیر میں بیاد یا درجنگ مرحوم کو دیکھا کہ سامعین پر جادو سا کر دیتے اور جو کام ان سے چاہتے لے لیتے۔ جب چاہا انہیں ہنسایا اور جب چاہا ان کی جیبیں خالی کرالیں۔ اور غور و خوض کے زور تک اُتر دالیا کرتے تھے۔ مولوی نذیر احمد جی شوقی و غراقت کا عنصر زیادہ تھا۔ پستی کئے اور چٹ کرنے سے بھی نہیں چمکتے تھے۔ خود مولوی صاحب

کہا کرتے تھے کہ چندہ اگانے کے لئے سرسید نے ہمارا ایک طائفہ تیار کیا ہے۔ حالِ رولوں رولوں
دولوں سادگی بجائے ہیں۔ پیشانی مجھے کھڑا ہے ہیں۔ ہم طبلہ بجا ہے ہیں اور سید صاحب
ہاتھ پھیلا پھیلا کر کہہ رہے ہیں "اچندہ! اچندہ! زعفران سے دیکھئے کیس قدر مکمل تشبیہ ہے۔ کارکردگی کے
اقتدار سے کس قدر مکمل!"

مولوی نذیر احمد بہت سخت گیر آدمی تھے اور بہت نرم دل بھی مسلمانوں میں نجات کا
شوق عام کرنے کے لئے روپیہ قرض دیا کرتے اور منافع میں اپنا حصہ بھی رکھتے۔ اس شوقِ نجات
میں انہوں نے بڑے بڑے نقصان اٹھائے۔ پکا کاغذ لکھوا کر روپیہ دے دیتے۔ اور روپیہ لینے
والا خوب نفع کھاتا اور اخیر میں دیوالیہ ہونے کی درخواست دے دیتا۔ خوش آمد دے آمد سے مولوی
صاحب کو راضی کر کے رقم کا بیشتر حصہ معجز کر جاتا۔ اگر مولوی صاحب سے کوئی کتاب بھی کر آپ
کیوں ایسے جھوٹے اور کھار لوگوں کے قریب میں آتے ہیں تو وہ ناراض ہوتے اور جب غصہ دور
ہو جاتا تو کہتے "میں اپنے روپے سے ان کا ایمان خریدتا ہوں۔ ایک دفعہ کسی کو روپیہ ادا ہوا دیا۔
اُسے خوب روپیہ کھایا اور کچھ مولوی صاحب کو بھی دیا۔ ایک دن مولوی صاحب بازار میں سے
گزر رہے تھے۔ سامنے سے ایک اعلیٰ درجے کی فٹن سنی اور ان کے قریب آکر رک گئی۔ اس میں
سے وہ صاحبِ مشرب کے نشے میں جھومتے ہوئے اُترے اور جو رنڈی ساتھ تھی اس سے ٹھٹھا مار
کر بولے "ان مولوی صاحب کو سلام کر دئیے سب کچھ اپنی کی بدولت ہے۔" مولوی صاحب کو
یہ بات نہایت ناگوار گزری۔ خون کا سا گھونٹ پی کر چپکے ہو رہے اور گھر آکر یہ کام یہ کیا کہ موتی
ساگر دکیل کو بلایا اس شخص کے کاغذات ان کے حوالے کئے اور اس پر نالش کر دی۔ مقدمے نے
طول پکڑا اور خوب خوب روپیہ برباد ہوا۔ فریقِ ثانی نے جب یہ دیکھا کہ اب قید ہونے کے
سوا اور کوئی چارہ نہیں تو ایک دن آکر مولوی صاحب کے پاؤں پکڑ لئے۔ اور ان کے قدموں
میں لوٹ گیا۔ مولوی صاحب نے اسے معاف کر دیا۔

مولوی نذیر احمد عربی میں غیر معمولی استعداد رکھتے تھے۔ کئی کئی سلا سے لوگوں کا ان پر
تھا صاف تھا کہ قرآن مجید کا ترجمہ کرو۔ مگر وہ پس و پیش کرتے اور کہتے کہ یہ کام ان لوگوں کا ہے جو
خدمتِ دین میں اپنی ساری ساری عمر صرف کر چکے ہیں۔ مگر جب ہنسنے لے کر وہ دلی آگئے تو
تیسیر کا ترجمہ شروع کیا اور اس سلسلے میں اکثر آیاتِ قرآنی کا ترجمہ بھی کرنا پڑا۔ اس سے انہیں
اعزازہ ہوا کہ یہ کام اتنا دشوار نہیں ہے جتنی کہ طبیعت میں بھکچکا سبٹ ہے۔ چنانچہ کئی مولویوں اور
عالموں کے مشغولوں سے انہوں نے قرآن مجید کا ترجمہ کرنا شروع کیا۔ ایک ایک لفظ پر زور
قدح ہوتی اور بالآخر ایک رلے ہو کر ترجمہ لکھ لیا جاتا۔ ترجمہ مکمل ہونے کے بعد بھی ایک ناجیا حید
عالم کو چڑھ کر ستایا گیا اور عالم کو نظر ثانی کے لئے باہر بھیجا گیا۔ جب کاپیوں کی تصحیح
ہوئی اور پرور دیکھے گئے تب بھی ان میں ترجمہ کی گئی اور جب تک اس کی طرف سے پورا
پورا اطمینان نہیں ہو گیا اسے شائع نہیں کیا گیا۔ اس میں ڈھائی سال لگ گئے مگر ترجمہ بھی
ایسا مستند و مفت اور بامحاورہ ہوا کہ اب کچھ پچاس برس میں کوئی اور ترجمہ اس سے بہتر شائع
نہیں ہو سکا۔ خود مولوی صاحب کو اپنی تمام کتابوں میں ترجمہ القرآن ہی پسند تھا۔ اور وہ فرماتے
تھے کہ میں نے اور سب کتابیں دوسرے کے لئے لکھی ہیں اور یہ ترجمہ اپنے لئے کیلئے کر ہی میرا
قرشہ آخرت ہے۔

مولوی نذیر احمد نے دلی کی محکمانی اور بامحاورہ اردو میں ترجمہ کیا۔ اول تو ایک زبان
کے الفاظ و خیالات کو دوسری زبان میں پوری صحت کے ساتھ منتقل کرنا ایک ناممکن سی بات
ہے۔ پھر کلام اللہ کا ترجمہ کہ لفظ اور صر سے اُدھر ہوا اور مفہوم بدلا۔ خدا جانے کئی احتیاطوں اور
دشواروں سے یہ ترجمہ مکمل ہوا ہو گا۔ ہم تو یہ جانتے ہیں کہ اگر کسی معمولی مضمون کا ترجمہ بھی کرنے بیٹھے
ہیں تو دم گھٹنے لگتا ہے۔ نذیر احمد جب ترجمہ میں لفظی پابندی سے کام لکھتے نہیں دیکھتے تو مفہوم
ادا کرنے کا بہترین پہلہ اختیار کرتے ہیں۔ چنانچہ تقریراتِ ہند کے ترجمہ میں بھی انہوں نے یہی ترکیب
استعمال کی اور ترجمہ القرآن میں بھی ٹرانسپوزیشن فار لائف کا ترجمہ انہوں نے جس دوام

سر سید احمد خاں عمری مولوی نذیر احمد سے بیس بائیس سال بڑے تھے اور عوام کے علاوہ انگریز حکام میں بھی بہت معزز تھے۔ مولوی نذیر احمد بھی ان کی بڑی عزت کرتے اور دامنے دے، قدرے سٹخنے ان کی مدد کرتے۔ ایک دفعہ علی گڑھ کالج میں ایک ہندو ماسٹر نے لاکھوں روپے کا خن کیا اور کالج جاری رکھنا محال ہو گیا۔ اس خبر کو سن کر مولوی نذیر احمد دلی سے علی گڑھ پہنچے اور ہر طرح کی دھار کس بندھائی۔ بولے: اگر روپے کی ضرورت ہو تو یہ روپیہ اس وقت موجود ہے بے لوار بھی دول گا۔ اور اگر کسی خدمت کی ضرورت ہو تو میں حاضر ہوں۔ سر سید اس غلوں سے بے حد متاثر ہوئے۔ اسی زمانے میں مولوی نذیر احمد کے دونوں مشرف الحق اور مشرف الحق علی گڑھ میں پڑھتے تھے۔ (ڈاکٹر اشرف الحق نے بتایا کہ) نانا ابا نے ہمیں سید صاحب کے کمرے میں بلوایا تو ہم نے دیکھا کہ ان کے پاؤں میں بوٹ ہیں اور وہ ٹانگیں میں پسر سید کی طرف کئے نہایت بد تمیزی سے میٹھے تھے میں۔ (ڈاکٹر اشرف نے چپکے سے ان سے کہا) نانا ابا پاؤں نیچے کر لیجئے۔ بولے: یہ اپنی کی تعلیم کا نتیجہ ہے۔ سر سید ہمیں پٹے۔

عمر ای میرا اس وقت ٹھیک نہیں ہے اور میں آپ سے ہاتھ بھی نہیں ملا سکتا۔ نامتن نے حیران ہو کر پوچھا: کیا ہوا مولوی صاحب آپ کو؟ بولے: آپ کا چہرہ سی دور روپے مجھ سے لینے کے بعد آپ تک مجھے لایا ہے۔ صاحب تو یہ سنتے ہی آگ بگولہ ہو گئے۔ اس چہرہ کی کو آواز دے کر بلایا اور پوچھا: تم نے مولوی صاحب سے دو روپے لئے؟ روپے اس کی جیب میں موجود تھے انکار کیسے کرتا؟ کہنے لگا: جی ہاں! صاحب نے خطی سے کہا: تم ہر فراموشی اور مولوی صاحب سے بولے۔ لائے اب ہاتھ ملائیے۔ مولوی صاحب نے ہاتھ نہیں بڑھایا اور کہا: مگر وہ میرے دو روپے تو مجھے واپس نہیں لئے۔ صاحب نے پھر اس چہرہ کی کو آواز دی اور اس سے مولوی صاحب کے دو روپے واپس دولے۔ بولے: اب ہاتھ ملائیے۔ مولوی صاحب نے اب بھی ہاتھ نہیں بڑھایا۔ صاحب نے متعجب ہو کر پوچھا: اب کیا بات ہے؟ مولوی صاحب نے کہا: میرے دو روپے مجھے مل گئے اس کا تصور معاف کیجئے اور اسے بحال کر دیجئے۔ صاحب جیسے کہیں ہونے مگر مولوی صاحب کی بات بھی نہیں ٹال سکتے تھے۔ آخر بولے: جاؤ مولوی صاحب کے کہنے سے ہم نے تمہیں بحال کیا۔ یہ کہہ کر پھر ہاتھ بڑھایا اور اب کے مولوی صاحب نے بھی ہاتھ بڑھا دیا۔

مولوی نذیر احمد صاحب علی گڑھ کے لئے چند ہاگائے کے سلسلے میں بہت کار آمد آدمی تھے۔ اس لئے جہاں تک ممکن ہوتا سر سید انہیں اپنے دوروں میں ساتھ رکھتے اور ان سے تقریریں کرتے۔ نذیر احمد کی قوت تقریر کے متعلق کہا جاتا تھا کہ اگر گستاخان کا مشہور مقرر برکت بھی ان سے زیادہ موثر تقریر نہیں کر سکتا تھا۔ اب بھی اگلے وقتوں کے لوگ جنہوں نے مولوی صاحب کے لکچر سنے ہیں کہتے ہیں کہ یا تو ہم نے ڈپٹی صاحب کو دیکھا یا اب اخیر میں بیاد یا درجنگ مرحوم کو دیکھا کہ سامعین پر جادو سا کر دیتے اور جو کام ان سے چاہتے لے لیتے۔ جب چاہا انہیں ہنسایا اور جب چاہا ان کی جیبیں خالی کرالیں۔ اور غور توں کے زور تک اُتر دالیا کرتے تھے۔ مولوی نذیر احمد جی شوقی و غراقت کا عنصر زیادہ تھا۔ پستی کئے اور چٹ کرنے سے بھی نہیں چمکتے تھے۔ خود مولوی صاحب

نامتن صاحب (جو غالباً شمال مغربی صوبے کے لفٹنٹ گورنر تھے) مولوی نذیر احمد کے بڑے قد و داں دوست تھے۔ ان کی آمد کی اطلاع پا کر مولوی صاحب ان سے ملنے گئے چہرہ پر نے ایک مختصر شکل کے کالے آونی کو دیکھا تو کوٹھی کے دروازے پر روک لیا۔ مولوی صاحب نے لاکھ چاہا کہ کسی طرح تعارفی کارڈ صاحب تک پہنچا دے مگر وہ لٹ سے مس نہ ہوا۔ اسے یہ بھی بتایا کہ میرے پرنے ملنے والے ہیں مگر وہ بھلا انہیں کیوں گردانتا؟ آخر کار مولوی صاحب نے دو روپے بٹے میں سے نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھے اور کہا: بھائی اب تو لٹ پہنچا دے۔ یہی تو وہ چاہتا تھا۔ جھٹ کا ڈولے کر اندر چلا گیا اور فوراً ہی مولوی صاحب کی طلبی ہو گئی۔ مولوی صاحب کمرے میں داخل ہوئے تو نامتن صاحب سرودہ کھڑے ہو گئے اور بولے: مولوی صاحب مزاج شریف! یہ کہہ کر انہوں نے ہاتھ ملانے کے لئے اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔ مولوی صاحب نے کہا:

کہا کرتے تھے کہ چندہ اگانے کے لئے سرسید نے ہمارا ایک طائفہ تیار کیا ہے۔ حالِ رولوں رولوں میں سادگی بجائے میں بستی مجھے کھڑا ہے میں۔ ہم طبلہ بجائے میں اور سید صاحب ہاتھ پھیلا پھیلا کر کہہ رہے ہیں "اچندہ! اچندہ! زعفران سے دیکھئے کیس قدر مکمل تشبیہ ہے۔ کارہنگی کے اعتبار سے کس قدر مکمل!"

مولوی نذیر احمد بہت سخت گیر آدمی تھے اور بہت نرم دل بھی مسلمانوں میں بجاہت کا شوق عام کرنے کے لئے روپیہ قرض دیا کرتے اور منافع میں اپنا حصہ بھی رکھتے۔ اس شوقِ بجاہت میں انہوں نے بڑے بڑے نقصان اٹھائے۔ پکا کاغذ لکھوا کر روپیہ دے دیتے۔ اور روپیہ لینے والا خوب نفع کھاتا اور اخیر میں دیوالیہ ہونے کی درخواست دے دیتا۔ خوش آمد و آمد سے مولوی صاحب کو راضی کر کے رقم کا بیشتر حصہ معجز کر جاتا۔ اگر مولوی صاحب سے کوئی کتاب بھی کر آپ کیوں ایسے جھوٹے اور کھار لوگوں کے قریب میں آتے ہیں تو وہ ناراض ہوتے اور جب غصہ دُور ہو جاتا تو کہتے "میں اپنے روپے سے اُن کا ایمان خریدتا ہوں۔ ایک دفعہ کسی کو روپیہ ادا ہوا دیا۔ اُسے خوب روپیہ کھایا اور کچھ مولوی صاحب کو بھی دیا۔ ایک دن مولوی صاحب بازار میں سے گزر رہے تھے۔ سامنے سے ایک اعلیٰ درجے کی فٹن سنی اور ان کے قریب آکر رک گئی۔ اس میں سے وہ صاحبِ مشرب کے نشے میں جھومتے ہوئے اُترے اور جو رنڈی ساتھ تھی اس سے ٹھٹھا مار کر بولے "ان مولوی صاحب کو سلام کر دئیے سب کچھ اپنی کی بدولت ہے۔" مولوی صاحب کو یہ بات نہایت ناگوار گزری۔ خون کا سا گھونٹ پی کر چپکے ہو رہے اور گھر پر یہ کام یہ کیا کہ موتی ساگر وکیل کو بلایا اس شخص کے کاغذات ان کے حوالے کئے اور اس پر نالش کر دی۔ مقدمے نے طول پکڑا اور خوب خوب روپیہ برباد ہوا۔ فریقِ ثانی نے جب یہ دیکھا کہ اب قید ہونے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تو ایک دن اگر مولوی صاحب کے پاؤں پکڑ لئے۔ اور ان کے قدموں میں لوٹ گیا۔ مولوی صاحب نے اسے معاف کر دیا۔

مولوی نذیر احمد عربی میں غیر معمولی استعداد رکھتے تھے۔ کئی کئی سلسلے سے لوگوں کا ان پر تھا منا تھا کہ قرآن مجید کا ترجمہ کر دے۔ مگر وہ پس و پیش کرتے اور کہتے کہ یہ کام ان لوگوں کا ہے جو خدمتِ دین میں اپنی ساری ساری عمر صرف کر چکے ہیں۔ مگر جب ہنسنے لے کر وہ دلی آگئے تو تیسیر کا ترجمہ شروع کیا اور اس سلسلے میں اکثر آیاتِ قرآنی کا ترجمہ بھی کرنا پڑا۔ اس سے انہیں اندازہ ہوا کہ یہ کام اتنا دشوار نہیں ہے جتنی کہ طبیعت میں جھکچکا سبب ہے۔ چنانچہ کئی مولویوں اور عالموں کے مشوروں سے انہوں نے قرآن مجید کا ترجمہ کرنا شروع کیا۔ ایک ایک لفظ پر دو دو قدح ہوتی اور بالآخر ایک رات ہو کر ترجمہ مکمل لیا جاتا۔ ترجمہ مکمل ہونے کے بعد بھی ایک مابینا حبیب عالم کو چڑھ کر ستایا گیا اور عالم کو نظر ثانی کرنے کا بھیجا گیا۔ جب کاپیوں کی تصحیح ہوئی اور پر وف دیکھے گئے تب بھی ان میں ترمیم کی گئی اور جب تک اس کی طرف سے پورا پورا اطمینان نہیں ہو گیا اسے شائع نہیں کیا گیا۔ اس میں ڈھائی سال لگ گئے مگر ترجمہ بھی ایسا مستحسن و فائدہ مند ہوا کہ اب کچھ پچاس برس میں کوئی اور ترجمہ اس سے بہتر شائع نہیں ہو سکا۔ خود مولوی صاحب کو اپنی تمام کتابوں میں ترجمہ القرآن ہی پسند تھا۔ اور وہ فرماتے تھے کہ میں نے اور سب کتابیں دوسرے کے لئے لکھی ہیں اور یہ ترجمہ اپنے لئے کیلئے کر ہی میرا قریشِ آخرت ہے۔

مولوی نذیر احمد نے دلی کی محکمالی اور بامحاورہ اردو میں ترجمہ کیا۔ اول تو ایک زبان کے الفاظ و خیالات کو دوسری زبان میں پوری صحت کے ساتھ منتقل کرنا ایک ناممکن سی بات ہے۔ پھر کلام اللہ کا ترجمہ کہ لفظ اور صرے ادھر ہوا اور مفہوم بدلا۔ خدا جانے کئی احتیاطوں اور دشواریوں سے یہ ترجمہ مکمل ہوا ہو گا۔ ہم تو یہ جانتے ہیں کہ اگر کسی معمولی معنوں کا ترجمہ بھی کرنے بیٹھے ہیں تو دم گھٹنے لگتا ہے۔ نذیر احمد جب ترجمہ میں لفظی پابندی سے کام لکھتا نہیں دیکھتے تو مفہوم ادا کرنے کا بہترین پیرایہ اختیار کرتے ہیں۔ چنانچہ قریشِ ہند کے ترجمہ میں بھی انہوں نے یہی ترکیب استعمال کی اور ترجمہ القرآن میں بھی۔ ٹرانسپوٹیشن فار لائف کا ترجمہ انہوں نے جس دوام

برہمچاریہ شہر کیا ہم تو عرقید کرتے۔ مگر اس میں کلمے پانی بھیجے جانے کا مفہوم ادا نہ ہوتا۔ اسی طرح انہوں نے قرآن مجید کے ترجمے میں عورتیں مردوں کا لباس میں۔ اور مرد عورتوں کا لباس لکھنے کے بجائے مرد عورت کا چولی دان کا ساتھ ہے لکھا۔ اور اس سے بڑھ کر یہ کیا کہ مہبوم کو خارج کرنے کے لئے بریکٹ میں الفاظ یا فقرے اپنی طرف سے بڑھائیے۔ اس قسم کی آدھری اکثر علماء کو ناگوار گزری مادہ چاروں طرف سے اعتراضات کی بوچھاڑ ہوئی۔ اور تو اور مولانا اشرف علی تھانوی مرحوم نے "رد ترجمہ دہلیہ" کے نام سے ایک خامی ضخیم کتاب لکھ کر اسی زمانے میں چھپرائی تھی۔ مگر مولوی نذیر احمد نے اپنے ترجمہ میں کوئی تبدیلی نہیں کی اور آج تک وہی ترجمہ مقبول رہا ہے۔ اس ترجمہ کی اشاعت کے لئے مولوی صاحب جہاں بھی لکھ دینے جاتے، بڑے بڑے پوسٹر لگوا دیے اور اکثر اپنی تقریریں میں بھی اس کا تذکرہ کرتے۔ پنجاب کے ایک شہر اخبار نویس کو کلام اللہ کے اس ترجمے سے خدا جانے کیا کاوش ہو گئی کہ وہ مولوی صاحب کی مخالفت پر تل گیا۔ اور لگا ان کے خلاف کالم کے کالم سیاہ کرنے۔ جب مولوی صاحب نے سونے لپے کے دسے اس کا منہ بند نہیں کیا تو وہ اور بھی کمینہ بن پر اتر آیا۔ اور مولوی صاحب کی ذمہ داری پر حملے کرنے لگا۔ مولوی صاحب اس پر بھی طرح دے گئے تو اس نے بہتان تراشی اور افتراء پڑائی شروع کر دی۔ سب مولوی صاحب کو بھی حلال آگیا اور مقدمہ بازی شروع کر دی۔ مولوی صاحب کثیر دولت کے مالک تھے۔ اور وہ اس ترنگ میں تھا کہ میں نے بھی بڑے بڑوں کو مار رکھا ہے۔ یہ سلسلہ خوب دروازہ ہوا۔ یہاں تک کہ مولوی صاحب کو اطلاع میں پہنچے لگیں کہ وہ مقدمے کی زیر بار سے تباہ و برباد ہوا جا رہا ہے۔ اخیر میں چند بھلے مانس بچے میں پڑے۔ اس سے معافی ہر داخل کر آیا اور مولوی صاحب نے اسے معاف کر دیا۔

مولوی نذیر احمد نے اپنی آخری عمر میں ایک کتاب "امہات الائمہ" لکھی تھی۔ اس زمانے میں عام دستور تھا کہ پادری جو ماہوں میں کھڑے ہو کر عیسائیت کی تبلیغ کرتے اور بیکا سکھ کر

لوگوں کو عیسائی کر لیتے۔ عیسائی پادریوں کے اردو اخبار بھی اسی غرض سے جاری تھے اور اکثر کتابچے بھی عیسائی اداروں سے مٹائے جاتے رہتے تھے۔ ایک پادری نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر غلط مسلط اعتراضات کئے۔ بالخصوص ان کے ایک سے زیادہ نکاح کرنے پر۔ اس کا جواب چند علماء نے دیا۔ ایک جواب مسید احمد خاں نے بھی لکھا اور مولوی نذیر احمد نے ایک پوری کتاب اس کے جواب میں لکھ دی۔ یہ کتاب ایسے تو ایک پادری کے اعتقاد اعتراضات کے جواب میں لکھی گئی۔ لیکن فی الحقیقت ہر تنجہ اسلام کا ایک بیش بہا باب ہے جو عقلی تنقید کی روشنی میں لکھا گیا۔ مولوی صاحب سے ادب کی رو میں یہ بے ادبی ہو گئی کہ انہوں نے آنحضرت اور اہل بیت عصبی مقدس ہستیوں کے ناموں کے ساتھ احترام کے الفاظ نہیں لکھے اور چند فقرے ایسے بھی لکھ گئے جو زبان کے اعتبار سے خواہ کتنے ہی صحیح کیوں نہ ہوں احترام بیان کے لحاظ سے ناموزوں بلکہ متنبک آمیز سمجھے گئے۔ اس کتاب کا چھپنا تھا کہ مخالفین نے خوب جلے دل کے پھوٹے پھوڑے، مولوی صاحب سے مطالبہ کیا گیا کہ یہ کتاب ہمارے حوالے کر دو اور ہم اسے جلسہ کر کے جلانیں گے۔ یہ بات مولانا کو بہت ناگوار گزری اور انہوں نے صاف انکار کر دیا۔ اس پر عوام میں آگ اور بھڑکائی گئی۔ علماء کا ایک جلسہ ہو رہا تھا۔ اس میں ان کے خلاف کارروائی کی گئی۔ حکیم اجل خاں کو مولوی صاحب کے پاس بھیجا گیا۔ وہ اس وعدہ پر کہتا ہیں لے آئے کہ اپنے پاس محفوظ رکھیں گے۔ اور کیا یہ کہ کتابیں لاکر بھرے جلے میں مولویوں کے حوالے کر دیں۔ کتابوں کے ذخیرہ میں آگ لگادی گئی اور اس کے مصنف کو کفر کا فتویٰ لے دیا گیا۔ مولوی صاحب اس جادو کا کارروائی سے اس قدر دل پریش ہوئے کہ انہوں نے اس دن کے بعد قلم کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔ اس کتاب کے سلسلے میں مولوی صاحب کہا کرتے تھے کہ اگر آج کل کے سارے مولوی مل کر مجھ پر دلائل کے سنجیدہ سے حملہ کریں تو میں ان کے دلائل کو اس طرح کاٹ دوں گا جیسے قینچی کپڑے کو کاٹ دیتی ہے۔ اور کپڑا دوبارہ بڑھ نہیں سکتا۔ اس سارے جنگ کے کی بنیاد بہت گھٹیا رقابت کے جذبے پر تھی۔ مولانا کے انتقال کے بعد کسی کو شکایت نہیں رہی۔ آج بھی وہی کافر نذیر احمد میں جن کی کتنی تعلیم گاہوں میں پڑھائی

جاری ہیں۔ جن کا ترجمہ القرآن ہر گھر میں موجود ہے اور جن کا ترجمہ ہر کتاب خانہ ہندوستان کی کتابخانوں میں رائج ہے۔

مولوی محمد حسین آزاد اور عمر میں ہر شے و حواس کو مٹھیے تھے۔ ایک دن اپنے گھر سے غائب ہو گئے۔ پہلے لاہور میں انہیں تلاش کیا گیا پھر اور شہروں میں۔ مگر ان کا کچھ پتہ نہیں چلا۔ کئی مہینے غائب رہنے کے بعد وہ ایک ایسی دلی میں روکنا ہوئے۔ لبریاں لگی ہوئیں۔ منگے پاؤں۔ ننگے سر۔ پیڑوں میں چھلے، منہ پر خاک۔ چہرے پر وحشت، لال لال دیدے، سیدھے منشی ذکر اللہ کے مکان میں گھس آئے۔ منشی ذکر اللہ سے ان کا کہن کا یا راز نہ تھا۔ وہ انہیں اس جنون کی کیفیت میں دیکھ کر لرز گئے۔ فرما ان کے کپڑے بدلوائے۔ منہ ہاتھ دھو لایا معلوم ہوا کہ لاہور سے پیدل چلے تھے اور خدا جانے کہاں کہاں کی خاک چھاتے دلی پیدل ہی پہنچ گئے۔

ایک دن مولوی نذیر احمد منشی ذکر اللہ کے ہاں پہنچے تو دیکھتے کیا میں کہ مولانا آزاد ایک مورچہ پر مٹھیے میں اور دوسرے مورچے پر منشی ذکر اللہ مٹھیے ہائی سے حمایت بنوا رہے ہیں۔ نہ جانے مولانا آزاد کو کیا خیال آیا کہ اٹھے اور ہائی کے ہاتھ سے اسے ستر چھین لیا اور بولے۔ آپ تو کیا حمایت بنائے گا ہم بنائیں گے۔ یہ کہہ کر منشی ذکر اللہ کا گلا بنانے لگے اور اسرا خط بھی بنا ڈالا۔ مولوی نذیر احمد نے بعد میں منشی جی سے کہا۔ اماں تم نے غضب کیا کہ اس جنون کے آگے اپنا گلا کر دیا۔ اور جو وہ اڑا دیتا، منشی ذکر اللہ نے کہا۔ نہیں۔ آزاد تو ہمارا دوست ہے۔ ہمارا گلا نہیں کاٹ سکتا۔

مولوی نذیر احمد کی پیش پندرہ سو روپے ہر مہینے آیا کرتی تھی۔ اس دہلے میں نوٹوں کا اتنا دستور نہیں تھا۔ چاندی کا روپیہ لیا دیا جاتا تھا۔ جب منشن کا روپیہ آتا تو مولوی صاحب کے آگے ایک چھوٹی میز پر بس بس روپے کی ڈھیریاں لگا دی جاتیں اور وہ ڈھیریاں بنگال لیتے۔ اگر گھر کا کوئی چھوٹا بچہ کھیلتا ہوا دھرا آتا تو مولوی صاحب اُسے اٹھا کر پوٹوں کی چوڑی

پر بٹھاتے اور خوب ہنستے پھرتے۔ ان کی آنکھوں میں آنسو بھر کر کے اور وہ کہتے۔ "جننی میری پیش آتی ہے اتنی ان میں سے کسی کی تنخواہ بھی نہیں آئے گی۔ اور ان کی یہ پیشین گوئی اب تک تو سچی ثابت ہو رہی ہے۔"

مولوی عنایت اللہ صاحب فرماتے تھے کہ جب میرے والد صاحب کا انتقال ہوا تو میں نے ڈپٹی صاحب کو جا کر اطلاع دی۔ بہت رنجیدہ ہو کر بولے۔ تمہارے ابا نے جانے میں جلدی کی۔ ساتھ ہی چلے۔ آبدیدہ ہو گئے اور کچھ نہیں فرمایا۔ منشی ذکر اللہ ان کے ہمسن اور سب سے پرانے ساتھی تھے۔

میر ناصر علی

اللہ بخشے میر ناصر علی دلی کے ان و صند اشرف نامیں سے تھے۔ جن پر دلی کو فخر تھا۔ عجب شان کے بزرگ تھے۔ بزرگ میں نے انہیں اس لئے کہا کہ میں نے جب سے ہوش سمجھا لا انہیں بزرگ ہی دیکھا۔ سو کھ کر چرخ ہو گئے تھے خوش خوشی و از محی، پہلے تل چاولی تھی، پھر سفید ہو گئی تھی۔ کتری ہوئی لبیں۔ پوچھا منہ۔ دہان پھیل ہوا۔ بے قرار انگلیں۔ ماتھا کھلا ہوا، بلکہ گدی تک ماتھا ہی ماتھا چلا گیا تھا۔ جوانی میں سرو قد ہوں گے، بڑھاپے میں کمان کی طرح جھک گئے تھے۔ چلتے تھے تو چھپے دونوں ہاتھ باندھ لیتے تھے۔ مستانہ وار هجوم کے چلتے تھے مزاج شامانہ، وضع قلندرانہ۔ ٹخنوں تک لمبا کرتا گرمیوں میں موٹی ملل یا گاٹھے کا، اور جاتوں میں فلائین یا فاند کا۔ اس میں چار جیبیں لگی ہوتی تھیں جنہیں میر صاحب کہتے تھے۔ یہ میرے چار ذکر ہیں۔ گنگے میں ٹپکا یا گلو بند، سر پر کھچی کپڑے کی بچھ گول ٹوپی اور کھچی صاف۔ گھرمی دھونی کا کنوٹ بھی پہنتے تھے انداس کے پاکے الٹ کر کھڑے کر لیتے جب جتہ پہنتے تو علمہ سر پر ہوتا۔ اک برا پا جامہ ازار بند میں نگینوں کا گچھا۔ پاؤں میں نری کی سلیم شاہی کسی صاحب بہادری سے ملنے جاتے تو انگریزی جوتا پاؤں میں اٹھا لیتے۔

آپ کبھی بھی میر ناصر علی کوں نہیں؟ یہ دی میر ناصر علی ہی جو اپنی جوانی میں بوڑھے سرسید سے اُچھے سیکھتے رہتے تھے۔ جنہیں سرسید اذرا و شفقت، تاج مشفق، لکھتے تھے۔ تہذیب الاطلاق کے تجدد پسند رجحانات پر امتداد اور سرسید سے سخن گستاخیاں کرنے کے لئے آگرم سے

انہوں نے تیرہویں صدی نکالا، اور پچیسویں کے خلافت اس دورے سے مضامین لکھے کہ ان کی دھوم مچ گئی۔ تیرہویں صدی بند ہوا تو زمانہ زمانہ کے بعد افسانہ ایام اور افسانہ ایام کے بعد ناصر علی نکالا۔ یہ بعد کے دونوں پرچے میر صاحب کے چھوٹے بھائی میر نصرت علی کے نصرت المطالع میں چھپتے تھے۔ جب میر صاحب نیشن لے کر دلی ہی میں رہنے لگے تو انہوں نے اپنا ایک مینڈ پریس لگا لیا۔ اور اس کا نام مطبع ناصر علی رکھا۔ ۱۹۳۲ء میں آئی مطبع سے میر صاحب نے "صلائے عام" شائع کرنا شروع کیا جو ان کے سال وفات ۱۹۳۳ء تک چھپتا رہا۔ یہ سب پرچے اعلیٰ اردو لٹریچر کے لئے وقت تھے اور ان میں بیشتر مضامین میر صاحب ہی کے ہوتے تھے۔ "صلائے عام" کے دو مستقل عنوان تھے "پیرایہ آغاز" اور "مضمون پریشان"۔ "پیرایہ آغاز" رسالے کا نیا پرچہ ہوتا تھا جس میں میر صاحب مضامین نظم و نثر کا تذکرہ بڑے الو کھے انداز میں کرتے تھے۔ مضمون پریشان ٹکڑے ٹکڑے مضمون ہوتا تھا جس کا ہر ٹکڑا ایک مکمل خیال پیش کرتا تھا۔ اسے دل صد پارہ یا ہزار جامہ سمجھا جاتا ہے۔ میر صاحب کبھی سال تک ان عنوانوں کے تحت خود لکھتے رہے۔ اور نہ ہی بت کہتے رہے۔ نازک خیالی اور پاکیزہ بیانی ان کا شیوہ تھا۔ صاحب طرز ادیب تھے۔ ان کے انداز تحریر پر بہت سوں کو رشک آیا۔ بعض نے کوشش کر کے نقل اتارنی چاہی۔ تو دو فقرے بھی نہ لکھ سکے گئے اور خون ہٹو گئے۔ اردو میں انشاء طبع کے موجود میر صاحب ہی تھے۔ ان کا انداز بیان اپنی کے ساتھ ختم ہو گیا۔ غضب کی علمیت تھی ان میں۔ انگریزی، فارسی اور اردو کی مثالی کوئی معرود کتاب ایسی جو جس کا مطالعہ میر صاحب نے کیا ہو۔ کتاب اس طرح پڑھتے تھے کہ اس کے خاص خاص فقروں اور پاروں پر سٹروغ پنل سے نشان لگاتے جاتے تھے اور کبھی کبھی حاشے پر کچھ لکھ بھی دیا کرتے تھے۔ ہزاروں لکھوں شعر فارسی اور اردو کے یاد تھے، حافظ آخر تک اچھا رہا۔ انگریزی اچھی ہوتے تھے اور اس سے اچھی لکھتے تھے۔ ساتھ پنیٹ سال انہوں نے انشاء پر دلی کی داد دی۔

نوک کے محلے میں ادنیٰ ملازم بھرتی ہوئے تھے، اعلیٰ عہدے سے نیشن لی حکومت کی

نظروں میں بھی معزز و محبوب۔ خان بہادر کا خطاب ملا۔ دلی میں آمریدی مجسٹریٹ رہے اور پاٹودی میں نو سال چیف منسٹر۔

میر صاحب فارسی اور اردو اور انگریزی کے بہت بڑے عالم تھے مگر عربی و احباب ہی جانتے تھے۔ ان کے باپ دادا نہایت حبِ رسم کے علماء میں شمار ہوتے تھے۔ اور مناظرہ کرنے میں انہوں نے اتنی شہرت پائی تھی کہ امام المناظرہ کہلاتے تھے۔ مگر میر صاحب کو مذہبیات سے کوئی طبیعتی مناسبت نہیں تھی۔ انہوں نے باپ سے چھپ کر انگریزی پڑھنی شروع کی مگر جب ان کے والد کو اس کی سن گئی تو بہت ناراض ہوئے اور انہیں سختی سے منع کیا۔ مگر میر صاحب کا مطالعہ جاری رہا اور اس کی پاداش میں انہیں گھر سے علیحدہ کر دیا گیا۔ فرماتے تھے کہ گھر سے نکلنے کے بعد ہم نے عرب سرا میں پانچ روپے مہینے کی یوشن کر لی۔ عرب سرائے جانے میں بہت وقت لگتا تھا اس لئے ہم یہ کرتے کہ گھر سے دو کتابیں لے کر چلتے۔ ایک کتاب جلتے میں ختم کر دیتے اور دوسری آتے میں۔ یوں بہادر راستہ بھی کٹ جاتا اور بہادر مطالعہ بھی ہو جاتا۔ مطالعہ کی عادت انہیں ساری عمر رہی اور ساری دنیا کا ادب اور فلسفہ انہوں نے چاٹ لیا۔

میر صاحب کو بحث مباحث کی عادت بالکل نہیں تھی۔ پیسچ کہتے ہو، پیسچ کہتے ہو۔ کہہ کر مال جاتے تھے۔ اگر اتفاق سے کہیں الجھنا ہی پڑ جاتا تو ان کے علم کے سمندر میں جوار بھاگتا آ جاتا۔ پس پھر حریت کا جب تک بیڑا غرق نہ کر لیتے انہیں چین نہ آتا۔ عربی کی کمی کو بعض دفعہ بڑی طرح غمگس کرتے تھے۔ معقولات میں تو بھلا کون ان سے حیثیت سکتا تھا ولہذا جب کوئی معقولات پر اتر آتا تو میر صاحب ایک دم سے خاموش ہو جاتے۔ فرماتے تھے کہ مولوی صاحب عربی کے حوالے دینے لگتے ہیں، میں اس لئے خاموش ہو جاتا ہوں کہ ان کی بات میری سمجھ میں نہیں آتی، اور وہ یہ سمجھ کر خوش ہو جاتے ہیں کہ دیکھو کس دھڑلے سے قائل کیا۔

میر صاحب جب باتیں کرتے تو مسکراتے بھی جلتے۔ ان کی باتیں عموماً منہی مذاق ہی کی ہوتی تھیں۔ انہیں کبھی کسی کے عجیبہ گفتگو کرنے یا علمی بحث کرنے میں نے نہیں دیکھا۔ ہمیشہ

ظرافت کی کوئی بات کہتے، اوروں کو مہناتے اور خود بھی مہنتے، مگر ان کی ہنسی میں آواز نہیں ہوتی تھی۔ مولویوں کا مذاق اکثر اڑتے تھے۔ ایک دفعہ نہ جانے مولویوں کی برات میں کیسے جا چھنے۔ دلہن والوں نے برات کو کھانا بھی دیا تھا۔ میر صاحب دسترخوان پر تو بیٹھ گئے مگر کھانا انہوں نے نہیں کھایا۔ ان کے ساتھ ان کا ایک کم عمر پوتا تھا۔ اس سے بڑے تو کھلے۔ جب لڑکا کھا چکا تو میر صاحب بڑے بے جنت میں حجازہ نہیں دے گا تو مولوی ناراض ہو جائیں گے۔ یہ کہہ کر ایک جفاہی مولوی کی طرف دیکھ کر کہا۔ کیوں صاحب؟ اور پھر لڑکے سے بڑے مذکوری کو اس طرح چاٹ کر تسلی بھی باقی در رہے۔

میر صاحب کو اپنی بیوی سے بڑی محبت تھی۔ ہر سال اپنی شادی کی سالگرہ منایا کرتے تھے۔ تیسرے پہر سے گھر والے اور قریبی عزیز جمع ہوئے شروع ہوتے۔ کھانا پان ہوتا۔ بیوی دلہن جتنی مہالوں کے ہلے میں آکر بیٹھتیں اور میر صاحب انہیں ایک سوئے کی انگلی بھی پہناتے۔ مبارک سلامت کا شور مچتا، منہی مذاق کی باتیں ہوتیں۔ اور ایک ایک کر کے رات گئے تک مہمان رخصت ہوتے۔ بیوی کے انتقال کے بعد میر صاحب میں پچیس سال جینے مگر انہوں نے دوسری شادی نہیں کی، اور ادب و فلسفہ کے مطالعہ میں زیادہ مہنک ہو گئے۔

میر صاحب کی حویلی — حویلی کا بے کو محل سا کہنا چاہئے۔ کے تین حصے تھے۔ زمانہ جس میں کٹا رہا والاں در والاں، مثل خرابوں والے، ان پر پٹاپٹی کے رُوی بھرے دیز پر پڑے پڑے ہونے۔ والوں میں دائیں بائیں کوٹھریاں تھیں۔ پیش والاں کے آگے صحن چبوترہ۔ اس کے پیلوں میں مچھیاں۔ نیچے کے رُخ دائیں جانب ایک سہ دری تھی جس میں کیوڑا رکھ کر کرہ بنالیا تھا۔ اس میں ان کی چھوٹی بیوی رہتی تھیں۔ والاں کے اوپر آئے مہانے دو بڑے کمرے تھے جن میں میر صاحب کے بڑے بیٹے اور ان کا کنبہ رہتا تھا۔ جہاں زمانہ مکان کی خدمت ہوتی تھی۔ اسی سے طواں ایک اور حصہ تھا جس کا ایک دروازہ زمانے کے صحن میں کھلتا تھا۔ اس حصہ میں ایک والاں تھا اور پیلوں میں کمرے تھے۔ مکان کے اس حصے میں میر صاحب کا

کُتبِ حاد اور نوادرِ خاندان تھا۔ زنان خانہ اور کُتب خانہ کی پوری لمبان میں بازار کے رُخ ایک چوڑی پٹی پر مردانہ بنا ہوا تھا۔ نیچے بازار کے رُخ دکائیں اور مجلس کا منگنی شان دار صند دروازہ تھا جس کے بڑے بھاری کیوڑوں میں چٹیا گج کیلیں جڑی ہوئی تھیں۔ اور ایک پٹ میں کھڑکی بسی کھلی ہوئی تھی۔ اس کے اندر ڈیڑھ میٹر لمبی تھی جس میں ایک بڑے سے تخت پر دربان بیٹھا رہتا تھا۔ یہیں سے زمانہ مکان اور کُتب خانے کو راستے جلتے تھے، بالائے پڑائیم طرٹ ایک برآمدہ تھا جس میں میر صاحب کا بیشتر وقت گزرتا تھا۔ اس کے پیچھے ایک سکڑا کمرہ تھا جس میں میر صاحب کی مہری اور کتابوں اور نوادر کی الماریاں تھیں۔ اس کے پیچھے ایک چوکور سا بڑا کمرہ یا بال تھا جس میں ادبی نشستیں ہوتی تھیں۔ بعد میں اسی بال میں باقی ماندہ کُتب خانہ اور نوادر خانہ منتقل ہو گیا تھا کیونکہ نیچے سامان بہت چوری ہونے لگا تھا۔ میر صاحب کی ایک بیٹی سحر اپنے خاندان کے اس خالی حصے میں اٹھ آئی تھیں۔ اوپر بائیں جانب بھی برآمدہ اور کمرہ در کمرہ تھا۔ یہ حصہ پہلے میر صاحب کے چھوٹے بیٹے کے تصرف میں تھا، پھر ان کے پوتے میاں انصاری ناصر اس میں رہنے لگے تھے۔ یہ پورا مکان فرخ خانہ میں نمک دانوں کی حوٹلی کے نام سے مشہور تھا۔ کیونکہ میر صاحب نمک کے ٹکے میں ملازم رہے تھے۔

جب میر صاحب پیشانے کر دی گئے تو یہ حوٹلی بڑی پُر رونق ہو گئی تھی۔ جہاں نمک ممکن ہوتا تھا میر صاحب اپنی اولاد کو اپنے سے جدا ہونے نہیں دیتے تھے۔ بڑے بیٹے نے یکے بعد دیگرے کئی ملازمتیں کیں، آخر کار گھر میں رہے تھے اور ملائے عام کا سارا انشاء میر صاحب نے انہیں سونپ کر دوسروں پر ان کے مقرر کر دیئے تھے۔ چھوٹے بیٹے ملازمت کے سلسلے میں ہمیشہ باہر رہے۔ زمانہ گھر میں دو بیای تیاہی بیٹیاں بھی رہتی تھیں۔ میر صاحب بڑے سیر چشم اور کُنبرے دار آدمی تھے۔ اولاد اور اولاد کی اولاد کو توخیر بھرتے ہی تھے دُور پرے کے رشتہ داروں کا بھی خیال رکھتے تھے۔ ایک صاحب تھے جو کتابت کرتے تھے، خط بہت اچھا نہیں تھا مگر میر صاحب نے انہیں ملائے عام کی کتابت کرنے کے لئے رکھ لیا تھا۔

اپنی صاحب کے ایک صاحب زادے تھے انہیں اپنے مطبعِ نامری کا منجر مقرر کر لیا تھا۔ جنرل منیر میر صاحب کے بڑے صاحب زادے تھے۔ مطبعِ نامری نیچے میر صاحب ہی کی دکانوں میں سے ایک میں تھا۔

بالا خانہ پر ایک بہت بڑی کھلی ہوئی چھت تھی جو دونوں طرف کے عملے کے درمیان صحن کا کام دیتی تھیں۔ اس پر چاروں طرف پھولوں کے گلے لگے ہوئے تھے اور سیلیں چڑھی ہوئی تھیں۔ بیچ میں بازار کے رُخ ایک گز اونچی کرسی تھی کرسنگ مرمر کا ایک شیشی نصب کیا گیا تھا، اس میں بیٹھ کر بازار کی سیر کی جاسکتی تھی اور اسی حصے میں کبھی مشاعرے ہوتے اور کبھی شبِ ماہ منائی جاتی۔

”شبِ ماہ“ جو دھویں کے چاند میں منائی جاتی تھی۔ اس میں خاص اہتمام کیا جاتا تھا کہ جہاں تک ممکن ہو ہر چیز سفید ہو۔ چنانچہ دھوپ ڈھلتے ہی چھڑکاؤ کیا جاتا، شام بہتے ہوئے اعلیٰ اعلیٰ چاندنیوں کا فرش ہو جاتا۔ چاروں طرف سفید گاؤں لگ جاتے۔ چکیروں میں چنبیلی اور موتیا کے بھول رکھے جلتے۔ ادھر چاند کھیت کرتا اور مردمان سفید براق انگڑے دربارہ سفید دوپٹیاں برسر آئے شروع ہو جاتے اور ٹکیوں کے سہارے بیٹھے جلتے۔ بیچاروں سے خیرے کی پیشکشیں ہوتی ہیں چاندی کی تھالیوں میں گندکا جین ڈیمیاں لگی ہوتی ہیں۔ بڑی ڈیمیاں پان، اس سے چھوٹی میں چھایا اس سے چھوٹی ڈیمیاں میں کسی میں چوگر والا پنچیاں کسی میں دردے کی نمئی نمئی گولیاں درق فقرہ میں لپٹی ہوئیں۔ سفید بٹور کے آبِ داخل میں برت پڑی ہوئی ان کے گرد گلاس سجے ہوئے جلسہ شروع ہونے سے پہلے دودھ کے شربت کا دُور چلتا۔ اس سے فارغ ہونے کے بعد مہانوں ہی میں سے کسی کو صند بنا کر بٹھایا جاتا اور محفلِ مشاعرہ شروع ہو جاتی۔ ایسے ایسے کامیاب بھلا گور کہاں۔ دلی کے حیدرہ حیدرہ اہل کمال کہاے جاتے تھے۔ مہندو مسلمان بھی شریک ہوتے تھے۔ سب اپنا اپنا منتخب کلام سناتے اور خاطر خواہ دلا پاتے۔ میر صاحب جیسے سخن سچ سے واہ واہ لینے کے سب مشتاق۔ میر صاحب کا داد دینے کا طریقہ سب سے زالا ہے۔ وہ تڑپ

کرداد دینے کے قائل نہیں ہیں۔ بڑے سکون سے شعر سننے میں اور بڑے اطمینان سے داد دیتے ہیں۔ شعر کے ایک ایک لفظ پر اُن کی نظر رہتی ہے۔ ٹھیک واہ۔ یہ لفظ اچھا آیا۔ یہ ٹکڑا اس میں خوب کیا۔ پہلا مصرع تو شاید کوشش کر کے میں بھی کہہ لیتا، مگر دوسرا مصرع تو میں کوشش کر کے بھی نہیں کہہ سکتا۔ اگر تم یوں نہ کہتے تو میں ناراض ہو جاتا۔ غرض کوئی دو گھنٹے ڈھائی گھنٹے یہ مشاعرہ جاری رہتا اور اسی مشائستگی کے ساتھ برخواست ہوتا اور سالے مہمان مطمئن و خوش رخصت ہوتے۔

میر صاحب کا کتب خانہ ایک دہائی میں دہائی کے بہترین کتب خانوں میں شمار ہوتا تھا۔ یوں تو اس میں تمام علوم کی کتابیں تھیں مگر تاریخ، ادب اور فلسفہ کی کتب کا ذخیرہ بے مثل تھا۔ انیسویں صدی کے کتب خانے کی بہار اُن کی زندگی ہی میں لٹ چکی تھی۔ اس کی بیش بہا کتب چوری ہو کر کڑیوں کے مول روئی خریدنے والے کپڑوں میں پہنچتی رہیں۔ میر صاحب اکثر اپنی کتابیں چوک سے دوبارہ خرید لیا کرتے تھے پھر وہ اپنے لئے پرتال ہو گئے تھے۔ اُن کے انتقال کے وقت بھی اُن کے لئے گئے کتب خانہ میں چار ہزار کتابیں تھیں جو اُن کے ورثا میں تقسیم ہو گئیں اور ان کا کتب خانہ بھی کے دل کی طرح صاف ہو گیا۔

نوادرجع کرنے کا بھی میر صاحب کو شوق تھا۔ کتب خانے کا ایک حصہ عجائب خانہ بنا ہوا تھا۔ اس میں قلمی تصویریں، خطاطی کے نمونے، قطعات، دست کاری کے اعلیٰ نمونے، تاریخی نوادہ، قلمی کتابیں، سسکے اور معجز بے حد قیمتی چیزیں شامل تھیں۔ کتب خانہ اور عجائب خانہ میں کسی کو جاننے کی اجازت نہیں تھی۔ جب میر صاحب خوب جانچ لیتے تھے کہ واقعی کوئی قدماں آپہنچا ہے تو اُسے ازراہ نوادش خود اپنے ساتھ لے جاتے تھے، اندر پھر غائب یہ کرتے کہ اس کا امتحان لیتے۔ اچھا بتاؤ تمہیں اس تصویر میں کیا خوبی نظر آتی ہے؟ میر صاحب کوشش کی اس سعی میں تم نے کیا بات دیکھی؟ اگر کسی نے کوئی قرینے کی بات جواب میں کہہ دی تو میر صاحب خوش ہو کر اُسے ایک ایک چیز دکھاتے، اور اگر کوئی اینڈی اینڈی اس کے منہ سے نکل گئی تو میر صاحب

کی طبیعت مکدر ہو جاتی اور فرماتے۔ کیوں آپ اپنا اور میرا وقت منالغ کرتے ہیں، یہ آپ کے ذوق کی چیزیں نہیں ہیں کہیں اور جا کر اپنا جی بہلایئے۔ اور باہر لا کر اُسے جڑی رکھائی سے رخصت کر دیتے۔ اسی کھرے پن سے لوگ میر صاحب سے گھبراتے تھے اور اکثر انہیں سسکی سمجھتے تھے۔

میر صاحب کا تعلق چونکہ انگریز انسرول سے رہتا تھا اس لئے اپنی کوشش رکھنے کی تدبیریں کرتے رہتے تھے۔ اُن کی یہ کمزوری اس قدر بڑھ گئی تھی کہ جو بھی انگریز دکھائی دیتا اُسے سلام کر لیتے۔ کہتے تھے کہ کیا خبر کوئی بڑا انسر ہو یا کل کو کسی کو بیڑا انسر بن کر آجائے۔ فلا صاحب کو دیکھو نا، پہلے پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ میں اونٹے انسر تھے، پھر محکمہ جنگ میں کسٹرن بن گئے، اور اب دہلی کے چیف کسٹرن بن کر گئے ہیں۔ مگر میر صاحب نے اپنی انگریز پرستی اور کامیابی سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔ ہمیشہ اُن کی خدمت کرنے پر آمادہ اور اُن پر احسان کرنے کی فکر میں گئے۔ وہ ایک دفعہ بہت کچھ سننے سے اپنے لڑکے کی سفر کھل کرنے ایک انگریز انسر کے پاس گئے۔ وہ میر صاحب کا بڑا پرانا دوست دروان تھا۔ میر صاحب سے مل کر بہت خوش ہوا اور بار بار کہتا رہتا تھا میں تمہارے لئے کیا کر سکتا ہوں؟ اور میر صاحب بھی کہتے رہے کہ میں تو حضور کے سلام کو حاضر ہوا تھا۔ غرض صحیح گئے اور سلامت آئے۔ گھر والوں نے جب شکوہ کیا تو بڑے میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا مجھے کسی کی سفارش نہیں ہو سکتی۔ ایک دفعہ گھر والوں نے میر صاحب کو اس پر آمادہ کیا کہ آپ مرث اپنے لڑکے کو اپنے ساتھ لے جائیں، اسی سفارش کچھ کریں۔ میر صاحب بادل، خواستہ چلے تو گئے اور صاحب بہادر اُن سے مل کر خوش ہو گئے بہت ہوئے مگر جب انہوں نے پوچھا یہ آپ کا لڑکا ہے؟ تو میر صاحب کی رگ عزت پھر ٹک گئی۔ بولے یہ تو اس کی ماں ہی بتا سکتی ہے۔ بات تہمتوں میں اڑ گئی اور لڑکے کو بے نیل مرث کے علاوہ پشیمان بھی لوثا پڑا۔

مگر میر صاحب انگریز سے بالکل دب کر نہیں رہ گئے تھے، کبھی کبھی انہیں حرارت بھی آ جاتا

مقام ایک دفعہ کسی یورپی مستشرق کو سلطان جی کی درگاہ دکھانے لے گئے۔ خواجہ حسن نظامی نے درگاہ کے دروازے پر ان کی پذیرائی کی۔ انگریز کے جوتے صاف کر کے خواجہ صاحب نے درگاہ میں داخل کر دیا۔ مگر میر صاحب سے کہا "آپ جوتے اتار کر اندر آجیئے۔" میر صاحب اس امتیاز پر بہرہم ہو گئے۔ بولے "اگر جوتے اتارنا بے عزتی ہے تو میں اس گوئے کے سامنے بے عزت ہو کر اندر جانا نہیں چاہتا۔ چنانچہ میر صاحب وہیں کھڑے رہے اور خواجہ صاحب انگریز کو درگاہ میں گھملائے۔ واپسی پر خواجہ صاحب نے میر صاحب سے کہا "آپ غار باندھ ہوئے ہیں اور مولویوں کا چہرہ بھی بے پھر نفل بوٹ کیوں پہنے ہوئے ہیں؟" میر صاحب نے چٹخ کر جواب دیا "پاؤں میں پہننے سے سر پر تو نہیں اڈ رہا اور ہاں تم ایسے سوال کیوں کرتے ہو؟"

میر صاحب میں پڑنے فلسفیوں کی بددعائی تھی۔ کبھی کبھی ان پر ذرا بھی سوار ہو جاتی تھی۔ حد ہے کہ میر صاحب کی بیٹی کی شادی ہوئی تو وقت رخصت دولہا نے حاضر ہر کر سلام کرنے کی اجازت چاہی۔ میر صاحب نے اجازت نہیں دی۔ اس پر دولہا دالوں میں بڑی جُرم جُرم ہوئی۔ دولہا کے ماموں بھی خان بہادر تھے۔ انہوں نے کہلا بھیجا کہ اگر اجازت ہو تو میں ملاقات کے لئے حاضر ہوں، اس کا جواب یہ آیا کہ "آپ میری طبیعت سے واقف نہیں۔ میں آپ کے مذاق سے آشنا نہیں، آپ دولہا کے ماموں ضرور مد میں مگر اسکے یہ معنی تو نہیں کہ آپ میرا ادا اپنا دولوں کا وقت صانع کریں۔" چنانچہ برات یوں ہی رخصت ہو گئی۔

میر صاحب دراصل اپنے آگے کسی کو گردانتے نہیں تھے۔ زوجاؤں سے تو اور بھی بھڑکتے تھے۔ ایک خاص نامی گرانی ادیب دلی آئے تو قریب عقیدت سے میر صاحب کے گھر ان سے ملنے پہنچ گئے۔ طوفا دکرٹا میر صاحب نے انہیں باریابی کی اجازت دی۔ انہوں نے نہایت ادب سے جھک کر سلام کیا۔ جواب ملا "بندگی۔" وہ بے چارے سٹ پٹ گئے۔ گھبرا کر بے ملامت علم میر سے نام جاری کر دیئے۔ یہ پانچویں ہے میں چند سے کے۔ میر صاحب نے سر سے پاؤں تک انہیں

دیکھا اور بولے "ملائے عام متباری کج میں نہیں آسکتا۔ یہ کہہ کر پھر کتاب پڑھنے لگے عقیدت مند نے بڑی حاجت سے کہا "آپ کو زحمت دینے کی معاف مانگتا ہوں۔" میر صاحب نے تنک کر کہا۔ "میاں صاحب زادے معافی کیا مانگتے ہو؟ بھیک مانگو، بھیک مانگو، وہ بے چارے اپنا سامنے لے کر دہاں سے چلے آئے۔ غلط اُردو سن کر میر صاحب آپس سے باہر ہو جاتے تھے۔

میر صاحب کی نظر ایک ایک لفظ پر رہتی تھی۔ لکھتے میں خود اتنے محتاط تھے کہ جو کچھ لکھتے تھے اسے بار بار پڑھتے تھے۔ اور اگلے دن صبح کو سب سے پہلا کام یہ کرتے کہ اپنے مضمون کی نوک پلک درست کرتے۔ ایک دن ایک صاحب ایک مضمون لکھ کر لے گئے جس کا عنوان تھا "داغ کی شاعری پر ایک نظر" میر صاحب نے عنوان دیکھتے ہی فرمایا "ایک نظر کیوں؟ دو نظر کیوں نہیں؟" یہ کہہ کر مضمون واپس دے دیا۔ یوں بھی وہ ملائے عام میں لگے بندھے آدمیوں کے مضمون چھاپتے تھے۔ جو شخص جواب سائل سے بے دھرم کہہ دیتا ہو "بے یار تو تو جواب ہے" شاعر کہاں ہے۔ وہ بھلا کسی اور کی کیا رکھتا۔

میر صاحب کتابوں اور پرائی چیزوں کی تلاش میں روزانہ عصر کے وقت فراش خانہ سے جامع مسجد تک پیدل جایا کرتے تھے۔ آدھی بجے مینہ جلے ان کا پھیرانا نہ نہیں ہوتا تھا۔ کمر پہا تھا باندھے ٹھیکیاں لیتے ہوئے جلتے۔ پیچھے پیچھے ایک ملازم ہوتا جس سے گھر بلو باتوں سے لے کر فلسفیانہ لکات تک بیان کرتے چلے جاتے اور وہ "جی حضور، جی حضور" کہتا رہتا۔ چوک پر پہنچتے ہی کباڑیے اور پوائی کتابوں والے انہیں گھیر لیتے۔ "باب صاحب، یہاں آئیے۔" "اجی ڈپٹی صاحب" دیکھئے کیا چیز رکھی ہے میں نے آپ کے لئے۔" حضور دیکھئے کیا تحفہ مال لایا ہوں۔" اور میر صاحب ایک ایک چیز کو دیکھتے، مول قول کرتے اور پیوں کی چیز روپوں میں خرید کر خوش خوش گھر لوٹتے۔ کبھی بہت مود میں ہوتے تو کسی برابر سے گزرتے ہوئے ہونڈے کے سر پر چپیت جادیتے وہ پلٹ کر مولی گالی دیتا تو یہ اُس گالی کا مزہ لیتے۔ "ادھر ہو ہو، ادا ہا ہا، دلی کار وڑا ہے، کیا پری دماغ پایا ہے۔" کرتے آگے بڑھ جاتے۔

اپنے بچوں سے اور بچوں کے بچوں سے میر صاحب کو بڑی محبت تھی۔ یوں تو تھا سمجھ کر ان کے پاس ایک بھی نہیں پڑتا تھا۔ مگر میرے پرک چائے میں سب کو جمع ہونے کا حکم تھا۔ اس لئے خوب دل چول رہتا۔ مزے مزے کی باتیں ہوتیں۔ دن بھر کے گھر بڑے ہنگامے سے نکلنے جاتے، بسکٹ، پنیر، ٹیکسٹن چیزوں کا دور چلتا۔ میر صاحب چائے کے بڑے شوقین تھے۔ جس دن لے میں چائے آٹھ آنے پڑتا۔ کبھی تھی۔ میر صاحب سر بند چائے پاچھ روپے پونڈ سے کم کی نہیں پیتے تھے۔ فرماتے تھے کہ اس سے زیادہ کی گھڑ میں بہت نہیں۔ جب پیالوں میں چائے ڈال جاتی تو کہتے "سونے کا پانی ہے" سونے کا پانی "اور جب اس میں دو دو ڈالا جاتا تو کہتے "ادبو ہو، بادل اٹھ رہے ہیں۔"

بد دعا کی کے باوجود کبھی اپنی ناقدری کا ملال بھی انہیں ضرور ہوتا تھا۔ فرماتے تھے "کبھی کبھی اہل کمال کی اُس کے وقت میں نہ قدر ہوئی ہے نہ ہوگی۔ اب ہر شخص کی زبان پر غالب اور مرزا غالب ہے۔ زندگی میں غریب کو کوئی پوچھتا تک نہیں تھا۔ ہم نے دیکھا ہے کہ گریہ کے ادب نے مکان میں پڑے رہتے تھے بے چارے کو نہ گھر کا گھر نصیب رہا نہ آرام سے کھانا نصیب ہوا۔ زندگی بھر مصیبتیں جھیلتے جھیلتے مر گئے۔ اب غالب پرستی شروع ہوئی ہے فرمایاے غالب کے کس کام کی" مکتے چلے آئے ہیں کہ پہنچے جگ بھانا اور کھائے من بھانا، مگر میر صاحب پہنچے اور کھانے دونوں میں اپنی پسند کو ترجیح دیتے تھے۔ خوش خوراک اور نفیس مزاج آدمی تھے۔ کھانا پکانے پر رکاب دار خاں سال ان کے ہاں نہیں رکھا جاتا تھا، مائیں رکھی جاتی تھیں۔ میر صاحب اذراہ نقشن کہتے تھے کہ جب تک آنا گوندھنے میں چڑیوں کی دھوؤں شامل نہ ہو روٹی میں مزہ کیسے آسکتا ہے؟ ویسے اُدپر کے کام پر پڑھے اور لڑکے ہمیشہ ذکر رکھے جاتے تھے۔ دونوں وقت کا کھانا ذمہ میں سے پک کر آتا تھا۔ صبح اور میرے پرک چائے کا اجتمام مردانے میں خود کرتے تھے۔

یہ عجیب بات ہے کہ میر صاحب کو اپنی زندگی میں عورت سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

بلکہ ایک طرح سے عورت سے متفرق رہے جاسکتے ہیں۔ ان کے کسی پرچے میں عورت کا کوئی مضمون یا غزل کبھی نہیں چھپی۔ کبھی کسی غزل کا تذکرہ تک انہیں منظور نہ تھا۔ دراصل جب وہ مردوں کی کو نہیں گانے سنتے تھے تو بھلا عورتوں کو کیا گھاس ڈالتے۔ مگر ان کی یہ نفرت بس اسی حد تک تھی۔ درہ عورت کی تعریف میں تو انہوں نے ایسے ایسے نفیس نفسیاتی جتنے بیان کئے ہیں کہ مہدی افادی جیسا ہانکا ادیب بھی پھرک کر کہتا ہے "میں آپ میں یونانیوں کی سی لطافت خیال پاتا ہوں" اور پھر میر صاحب ہی کے انداز بیان سے متاثر ہو کر اپنا وہ بے پناہ مضمون پیش کرتا ہے جس میں اس نے فلسفہ حسن عشق بیان کیا ہے۔ میر صاحب کے مضامین میں عورت کے متعلق ان گنت نثریں ہاں میں سے چند یہاں نقل کرتا ہوں۔

"عورت جب نہ پھر کر چلنے کے لئے اٹھ کھڑی ہو تو اس کے یہ معنی ہیں کہ یہ چاہتی ہے کہ کوئی دور کر دہن پکڑے۔"

"عورت کے لئے اس قدر بس نہیں ہے کہ مرد کا دل ہاتھ میں رکھے بلکہ جب ہاتھ آجائے تو تنگ رکھے کہ یہی نسخہ تسخیر ہے۔"

"اکیلے سے فوشی پیش میں داخل نہیں۔ کسی عورت کو دین آفت ہو کش کے ساتھ اگر یہ کلفت میسر ہو تو ایسے میں رحمت الہی پر ایمان نہ رکھنا صنعت عقائد میں داخل ہے۔ کسی کے خیال میں اپنی جان کو خوش رکھنا برا نہیں۔ خاص کر ایسی محبت جس میں یار کا شکرنا یہ بتائے کہ ع

"نہ دیکھ اس وقت میں ہوتی ہوں بدنام"

"محبت وہ چیز ہے جو سلمان و مسالک کی محتاج نہیں۔ محبت کے لئے ایک اکیلا دل چاہئے۔"

"عورت کسی ہی آوارہ کیوں نہ ہو مگر پارسائی پر جان دیتی ہے۔"

"مسیبوں کو شاعروں سے سٹ عمر مزاج زیادہ پسند ہیں۔ ان کے لئے موزونی طبع ہے کہ"

ہے۔ ان کو اس خیال میں مزہ آتا ہے کہ کسی کو ہمارا خیال ہوا اور میں کسی کا۔
 "وہ حسین بھونے کی چیز نہیں جو لڑکپن سے نکلتی جوانی میں کسی کے خیال میں ہو۔ یہی عورت
 کو اپنے چاہنے والے سے پسنے کی تاب نہیں کرات زیادہ گئی ہے۔ اس کی ایک رات
 اللہ بیل کی ہزار رات سے بہتر ہے۔"

"یہ عورت جو دامن کشاں چاہی ہے اسکو آپ کی بے انتقامی کا رنج ہے۔ یہ چاہتا ہے
 کہ آپ کی اور کی طرف نہ دیکھیں۔"

"حسین عورت جب کسی سے بچ کر نکلے تو اس کا اس قدر نقصان نہیں جس قدر کہ پہلے ہے۔
 "آپ یہ سمجھیں کہ مرد عورت سے بڑی لے جاتا ہے۔ مرد اگر کسی عورت کو دغا دے تو
 بھی عورت ہی کا ہارا سمجھئے۔"

"تمام عالم میں حسینوں کی کم سن سے زیادہ کوئی چیز دل سے قریب نہیں۔ جن کی گھلی یا
 بندھی سر کی چوٹیاں درازنی عمر کا جواب ہیں۔"

"خدا نے عورت کو بالطبع عیش پسند پیدا کیا ہے۔ عورت کے لئے عیش سلطنت کا جلوس
 ہے۔"

"عورت کے پاؤں فرسٹ ٹھلین چلتے ہیں۔ مرد کے پیر کاٹوں کے تھے بنے ہیں۔
 "مصائب میں عورت کا حال مشائخ گل کا سا ہے جو آندھی میں جھک جاتی ہے اور جہاں
 ہوائی پھر سیدھی ہو گئی۔"

"عورت کا دماغ ہمیشہ مہار کو تھوڑے کچھے جس میں خزاں کو دخل نہیں۔"

"عورت جس بات کا ارادہ کر لے کر گورتی ہے۔ اس لئے محبت میں زیادہ لطف اس محبت
 کہے جو عورت کی طرف سے ہو کہ اگر عورت چاہے تو سو بیاد سے ملے گی۔ وہی نہ
 چاہے تو ملنا معلوم ہے۔"

یہ اگر چاہیں تو پھر کما چاہئے؟

کہتے ہیں کہ محبت میں ہوش نہیں رہتا۔ میری رائے میں مرد کو ہوش نہیں رہتا۔ عورت کو
 ہوش رہتا ہے۔"

"عورت کو معلوم ہے کہ میں کیلی بے کار ہوں۔ میری زندگی کا مدار دوسرے پر ہے۔ جو خیر
 بخش (مرد) ہے۔"

"عورت جس کی عمل داری میں رہتی ہے اس پر حکومت کرتی ہے۔"

"یہ بات عورت کی عادت میں داخل ہے کہ منہ چھپائے اور حسن انکسار کا دعویٰ کرے۔"

"عورت کو چپکے چپکے گھر میں جان دیتے سنا۔"

"مرد جوش کرتے ہیں مگر عورت عیش محبت ہے۔"

"عورت میں محبت کے سوا کسی چیز کی قابلیت ہی نہیں۔"

"محبت بغیر عورت ہی نہیں سکتی۔ مرد اور طرح بھی جی سکتا ہے۔"

"عورت کے دل میں محبت جس قدر جلد اثر کرتی ہے اسی قدر دیر پہنچی ہے۔"

"عورت کے لئے فری پارسی کافی نہیں۔ دل ربائی اور دل فریبی بھی ضروری ہے۔"

میر صاحب کی آدم بیزاری کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ طوالت عمر کی وجہ سے ان کے تقریباً
 سارے ساتھی ایک ایک کر کے اٹھ گئے تھے اور وہ اس بھری دنیا میں اکیلے رہ گئے تھے۔
 حد یہ کہ ان کے چھوٹے بھی ان کے سامنے ہی رخصت ہو گئے۔ مولوی نصرت علی میر صاحب
 کے چھوٹے بھائی جو تین سال چھوٹے تھے ان سے چھ مہینے پہلے سدا ہار گئے۔ یہ بھی عجب
 شان کے بزرگ تھے۔ سو سے زیادہ ان کی تصانیف ہیں، ایک لغت بھی انہوں نے سات
 زبانوں کی مرتب کی تھی۔ اپنا چھاپہ خانہ اور اپنا اخبار تھا۔ سالہا سال تک ان کا اخبار چھپتا
 رہا مگر آج نصرت علی مرحوم کو کوئی بھی نہیں جانتا۔ خود میر ناصر علی کو لوگ ان کی زندگی ہی
 میں بھول گئے تھے۔ ان کے مرنے پر جب ناصر بزرگ ساقی نے نکالا تو لوگ چونکے کہ ہائیں، کوئی
 اتنا بڑا ادیب بھی تھا جو مر گیا، کتنی بے رحم ہے موت اور کتنا بے رحم ہے زمانہ! ناصر علی کی موت

پر ریا حق اور دل گیر جیسے دو چار بڑے کھڑے روئے اللہ ہیں۔ ہماری جے سی تو بھلا اس نہایت عورت کی طرح قائم ہے جس نے اکبر بادشاہ کی سنہ دہائی سن کر کہا تھا کہ جب چھیدو کا باپ نہ رہا تو اکبر کیسے رہ جاتا۔

میر صاحب بڑے کچھ دل آوی تھے۔ وہ جلتے تھے کہ بڑھاپے میں آدمی کس بڑے کو پہنچ جاتا ہے۔ کسی انگریزی کتاب میں انہوں نے پڑھا تھا کہ بڑھاپے میں سب سے دور رہنا ہی ٹھیک ہوتا ہے۔ جب آدمی ساٹھ سال کا ہو جائے تو اسے اپنی زندگی کیسے بدل لینی چاہئے۔ اپنی صورت شکل اور لباس کا دیا وہ خیال رکھنا چاہئے۔ اس سے ہی ذرا ہلکا رہتا ہے کوئی نہ کوئی مشغلہ اس عمر میں ضرور ہونا چاہئے۔ ساٹھ سے نوے سال کی عمر تک جنازوں میں شریک نہیں ہونا چاہئے کیونکہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی کو دفنانے کے بعد اپنے دفنانے جانے کی باری آ جاتی ہے۔ شادی بیاہوں میں اور عام جلسوں میں شرکت مناسب نہیں ہوتی۔ کیونکہ ان سے الجھنیں پیدا ہوتی ہیں اور الجھنوں سے عمر کم ہوتی ہے۔

میر صاحب کے گونا گوں تعلقات تھے، عزیز داری کے، مضمون نگاری کے، وظیفہ خواروں کی انجمن کے۔ مگر میر صاحب کو میں نے ان کے جنازے میں نہیں دیکھا۔ بعد میں پراساد نے البتہ اُسے تھے۔ مگر میں داخل ہوتے ہی بولے چلا گیا۔ ہمارا یار چلا گیا۔ جلدی چلا گیا۔ اچھا آدمی تھا۔

مضمون نگاری، مطالعہ اور نوادہ جمع کرنا، یہ سب شغلے ایسے تھے کہ ان کے بعد میر صاحب کو نہ تو کسی سے ملنے کی فرصت ہوتی تھی نہ ضرورت۔ بچوں کے بچوں سے ان کا جی بہتا ہی رہتا تھا۔ کوئی ملنے جاتا تو انہیں طبیعت پر جبر کر کے اُس سے ملنا پڑتا۔ جانتے تھے کہ کم ملی کی اور سیکھا ہائیں کرے گا۔ اس لئے دکھائی سے ملتے تھے۔ طبیعت بھی بڑی بے نیاز پائی تھی۔ دستا کش کی منانہ سلسلے کی پروا۔ ساری عمر ان کے قدر دان ان سے اصرار کرتے رہے کہ اپنے معنائیں کے منتخب مجموعے چھاپ دیجئے۔ مگر انہوں نے کبھی اس کا خیال بھی نہیں کیا۔ میر صاحب کوئی ساٹھ

بیس کے ہوں گے جب مہدی افادی نے مجموعہ معنائیں نہ چھاپنے کے سلسلے میں انہیں لکھا تھا۔ "اس پاکیزہ مجموعے کی ترتیب سے اردو ادب عالیہ میں آپ کی طرف سے مستقل قیمتی اضافہ ہوتا جو یادگار زمانہ رہتا۔ آپ دعائیں فرمائیں گے یہ بدترین حق تلفی تھی جو آپ اپنی کر سکتے تھے۔۔۔۔۔"

خود مہدی نے اس مجموعے کا نام "افادات نامہ صریح" بھی تجویز کر دیا تھا۔ مگر مہدی مر گئے اور مجرمہ شائع نہ ہوا۔ اس تجویز کے کوئی بیس سال بعد افادہ نامہ صریح اور میں نے ڈرتے ڈرتے میر صاحب سے اجازت چاہی کہ ہم اس خدمت کو انجام دیں۔ میر صاحب اس پر رضامند ہو گئے تھے اور افادہ نامہ صریح "بھی ان کی نظر سے گزر چکی تھی۔ افادہ نامہ صریح نے میر صاحب کی کتاب کا نام "افادات نامہ صریح" رکھنا چاہا تو میر صاحب جیسے یہ جہیں ہو کر رہے "میں مہدی سے گھٹ کر نہیں رہنا چاہتا۔ میں نے مقامات حریری اور مقامات حمیدی کے وزن پر "مقامات نامہ صریح" سوچا ہے۔" مگر میر صاحب کی علالت کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ وہ انتخاب معنائیں کا کام نہ کر سکے اور پھر ان کا وقت آخر آ پہنچا، ان کے مرنے کے بعد اور بہتیرے کچھ بیٹے پھیل گئے۔ اور یہ کام رہ ہی گیا۔

میر صاحب دمندار ایسے تھے کہ ساری عمر ان کے لباس میں کوئی فرق نہیں آیا۔ "صلائے عام" ۲۵ سال جاری رہا، پہلا پرچہ جس کا تب نے لکھا تھا آخر کے پرچے تک وہی کتابت کرتا رہا۔ پریس میں بھی شروع سے آخر تک ایک ہی رہا۔ آخر آخر میں "صلائے عام" کی اشاعت جب بہت کم ہو گئی تو مرنے سے سو سو سو پرچے چھپتے اور قدر و اقدار میں کمی ہو جاتی۔ میر صاحب اس کے لئے دوسروں پر مامور آخر تک دیتے رہے اور پرچہ بند کرنے کو اپنی دمند لری کے خلاف سمجھتے رہے۔ اپنے کسی پرچے میں کبھی کوئی اشتہار نہیں چھاپا۔ روزانہ شام کو جامع مسجد کا پھیرا ضرور ہوتا تھا جب تک ان کے دوست احباب جیتے رہے ان سے ملنے اور باز دید کے لئے جلتے رہے۔ نماز پابندی سے نہیں پڑھتے تھے مگر جب پڑھتے تو بڑے خضوع و خشوع کے ساتھ۔ کبھی کبھی یوں ہی

مجھے میں پڑ جلتے۔ عید، بقر عید کے موقع پر گھر کے سب چھوٹے بڑوں کو جمع کر کے عید گاہ منرو جلتے تھے۔ آخری بقر عید کے موقع پر سخت تکلیف میں مبتلا تھے مگر عید گاہ جا کر ہی نماز ادا کی۔ عید کے دن خاندان کے کل افراد کو دوپہر کے کھانے پر جمع کرتے تھے۔

میر صاحب کو برش سے دانت ماسخنے کی عادت تھی۔ ایک ایک کر کے سب دانت رخصت ہو گئے۔ آخر میں صرف ایک دانت رہ گیا تھا۔ اس کے لئے بھی برش اور کریم کا اہتمام کرتے تھے۔

میر صاحب کو ہزاروں شریا تھیں۔ شر کا رعبہ صرف ان سے بہتر کہیں اور نہیں دیکھا۔ کھنے میں بھی شر بہت کھتے اور بولنے میں بھی بات بات پر شر پڑھتے تھے۔ جب جس بول کی شکایت بڑھ گئی تو میر صاحب زندگی سے بایکس ہو گئے تھے۔ فرماتے تھے س ختم ہی سمجھو زندگی کے دن ۔ کچھ ورق اور یہ منانے کے

انتقال سے چار دن پہلے کا واقعہ ہے کہ مرض الموت کی شدت میں مبتلا تھے۔ ضعف سے آنکھ نہ کھلتی تھی۔ ان کے صاحب زادے نے دل بہلانے کے لئے کہا: "دیکھئے آپ کے بیٹے بیٹیاں پوتے پوتیاں، لو اسے نواسیاں، سب آپ کی خدمت کے لئے جمع ہیں۔ کیا انہیں دیکھ کر آپ کو خوشی نہیں ہوتی؟" خستہ ہو کر بولے ع

"ہو غم ہی جاں گداز تو غم خوار کیا کرے؟" مرنے سے کچھ دیر پہلے جب ان سے پوچھا گیا کہ اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟ تو فرمایا: سفید حب کہ کدے پر آنگا غالب خدا سے کیا ستم و جور نا خدا کہئے؟

میر صاحب کی آخری آرزو ان کے ایک خط میں درج ہے۔ یہ خط انہوں نے اپنے بیٹے انصار علی صاحب کو لکھا تھا۔

خط کی نقل حاصل کر کے درج کی جاتی ہے۔

بیٹا

میری ایک آرزو یہ ہے کہ کتب خانے والا مکان تکلف سے آراستہ ہو جائے اور میں دن رات وہیں پڑا رہوں۔ تم اگر سناؤ چاء پیئے آجاؤ تو کیا کہنا مگر کوئی معمول ذکر کسی کا نہ ہو۔ کہنا: جب مجھے صبح گئے، پکا پکا یا مل جائے اور کوئی لڑکی آکر کھلا جائے۔ کوئی ٹیلیف کتاب یا چیز نظر آئے تو مجھے اتنا مقدور ہو کر فوراً خرید لوں۔ رات کو بے فکر سوؤں اور صبح خوش اٹھوں۔ کوئی مسئلہ فلاسفی کا جو مجھ میں نہ آتا ہو اسے مجھ لوں اور دوسروں کو سمجھا سکوں۔ دنیا کی متنی کتاب میں دل و دماغ کو خوش کر سکیں سب میرے پاس ہوں۔ جاڑے میں ٹیکسٹی ہو اور گرمی میں ہوت۔ بہار میں کمرے کے اندر بیٹھا ہوں اور وہ ٹپکتا ہو۔ رات کو جلنے کے واسطے خوب صورت - CANDLE - STICK کی روشنی ہو اور جو کتاب مجھے پسند ہو وہ میرے سامنے ہو۔ تم اتنا سامان

میرے لئے کر دو تو I WILL DIE HAPPY

یہ نفیس مزاج انسان ۱۳۲۷ھ میں ہم سے رخصت ہو گیا۔ سیلاب اکبر آبادی نے میرزا ناصر علی خاں سے تاریخ وفات ۱۳۲۷ھ نکالی۔

استاد بخود دہلوی

دہلی کے اردو بازار میں کتب خانہ علم و ادب ادیبوں اور شاعروں کا ایک اچھا نام ہے۔
ادیبوں کا گھرانہ۔ یوں تو چلتے پھرتے سبھی یہاں ٹھیک لیتے تھے مگر مغرب کے بعد یہاں بطور خاص
ادیبوں کا پھر جہنم تھا۔ آندھی جائے مہینہ جائے یہاں آنے والوں کا پھیرانا نہ نہیں ہوتا تھا۔ ایک
تو مرکزی جگہ، دوسرے کتب خانے کے مالک سید دمی اشرف کی خوش اخلاق ہشام پڑے ہی
سب اپنے اپنے گھروں سے چل کر کتب خانہ پر پہنچ جاتے۔ روز کے آنے والوں میں ظفر قریشی،
اخلاق احمد صلاح الدین قریشی، صادق الخیری، ہنال سید ہادی، فیہر بیگ چغتائی، میر صاحب نام
پوچھنے کی کبھی ذہبت ہی نہ آئی، یہاں کے رہنے والے تھے، جاگیم حبیب اشرف اور محمد میاں تھے۔ دو
تین گھنٹے مزے مزے کی باتیں ہوتیں۔ چائے کے دو چلتے۔ یہ چائے دو طرح کی ہوتی تھی۔ ایک
تو وہ جو دمی اشرف اٹھاتا پلاتے تھے، اور دوسری وہ جو جہلمے میں پلائی جاتی تھی۔ یہ جہلمہ
شاعروں سے بچنے کیلئے عاید کیا گیا تھا۔ دراصل ہوا یہ کہ شاعروں نے بھانپ لیا کہ یہاں شام کو چند
شریف آدمی جمع ہوتے ہیں۔ پس پھر کیا تھا، اللہ سے اور بندہ لے۔ شاعروں نے یلغار شروع
کردی۔ شروع شروع میں تو تکلف میں انہیں سنا، پھر مروت میں، مگر جب جان منیق میں
آگئی تو تکلف اور مروت دونوں کو بالائے طاق رکھا اور صاف صاف کہہ دیا جاتا کہ یہاں
کا دستور کچھ اور ہے۔ وہ یہ کہ ہر صاحب اپنے کلام بلاغت نظام سے مستفیع فرما چاہی وہ
سامعین کے کام و دہن کو بھی چائے سے نفیس پہنچائیں۔ چنانچہ شاعروں کی یوٹس ختم ہو گئی۔

اس پر بھی قرار شرف نے بہت سوں کو چین سے بیٹھنے دیا اور شاید کوئی محسوس دن ایسا گزرتا
ہو کہ جہلمے کی چائے نہ پی جاتی۔ ہزار تو اور آپس کے بیٹھنے والے نئی گھونٹ بن جاتے۔ اچھے
بچے بیٹھے ہیں کہ لگے پہلو بدلنے۔ اسے بھی خیر تو ہے، کسی نے باہر سے کہا۔ شرنگ رہا ہے شاید
اور ہنال نے محبت لگے میں باہر نکال کر بڑی حاجت سے کہا۔ بھائی غزل ہو گئی ہے بسن لو۔
کہا۔ بھائی سب کو چائے پلائی پڑے گی۔ بے۔ منگو لیجئے۔ مرزا جی چائے والے کا رکھا تو
کاٹا ہی رہنا تھا۔ جھٹلے آتا۔ ہنال ترنم سے اپنی غزل سنائی شروع کرتے تو اخلاق احمد کہتے
تھیں بھئی خمت اللفظ کی ہوئی تھی، اگر تم ترنم سے سنائی چاہتے ہو تو بسکٹ بھی ہوں گے۔ ہنال
کہتے "اچھا بسکٹ بھی منگا لو۔ چنانچہ سب کے تے ایک ایک ٹکین بسکٹ بھی آجاتا۔ پھر غزل سن
جاتی۔ دھواں دھار داہ واہ ہوتی۔ ہنال مرحوم ہنال ہر جاتے۔ کبھی کبھی مرزا نسیم بیگ چغتائی
اپنا مٹھا سا ڈنڈا ہلاتے ہوئے آتے، اور آتے ہی اعلان کر دیتے کہ آج مجھوں نے غزل کہی ہے۔
چائے منگو لیجئے سید صاحب۔ سید دمی اشرف فوراً چائے کا آرڈر دیدیتے، اور مرزا صاحب
کی غزل کا سب لطف اٹھاتے۔ یہ استماع اتنا دلچسپ ہوتا تھا کہ دمی اشرف اپنی دکان داری
بند کر دیتے تھے۔ اگر کوئی جاننے والا اگر کتاب مانگتا تو کہہ دیتے کہ اب تو وقت ختم ہو گیا، اور
اگر کوئی انجانا آجاتا تو کہتے "کل دن کو آپ آئے۔ منگو رکھوں گا۔ غرض رات کے دس بجے تک
خوب دو وقت رہتی۔

اپنی روز کے آنے والوں میں سے ایک حضرت بخود دہلوی بھی تھے جو مغرب کے لگ
بھگ ایڈورڈ پارک کی طرف سے ٹمکتے۔ ٹمکتے آتے تھے۔ عمر زیادہ ہو جانے کی وجہ سے وہ کچھ
پنگے ہو گئے تھے۔ دونوں ٹانگیں کمان کی شکل کی ہو گئی تھیں۔ اور انہیں چلنے میں خامی زحمت
ہوتی تھی۔ مگر وہ شام کو میٹھل سے ایڈورڈ پارک تک ضرور جایا کرتے، اور واپسی میں کتب خانہ
پر ٹھیک لیتے، کبھی کتب خانہ کے سامنے ہی کرسی پر بیٹھ جاتے اور کبھی اندر جا بیٹھتے۔ دمی اشرف صاحب
کے والد سید علی اشرف صاحب ہٹے نیک اور سچے ہونے بزرگ تھے۔ عمر میں بخود صاحب

سے کچھ چھوٹے تھے مگر بیخود صاحب کو ان سے بڑی حقیقت تھی اور اکثر چڑے والی پہاڑی کی چڑھائی چڑھ کر ان کے پاس جایا کرتے تھے۔ ایک دفعہ تو گھر میں بڑی ہنسی پڑی۔ سید صاحب کی ڈیوڑھی پر ایک آدمی رہتا تھا۔ یہ سید صاحب کا مریض بھی تھا، دربان بھی اور وقار خادم بھی، مگر بڑا سادہ لوح، ایک دن بیخود صاحب نے آواز دی، "میاں مرادی نے پوچھا، آپ کا نام؟" انہوں نے کہا۔ "بیخود"۔ امد جا کر میاں مرادی نے فرمایا "بے وقوف صاحب آئے ہیں"۔ سید صاحب کی تیاری پر پہلے تو بے کیا مگر فوراً ہی کھڑک کر دیئے اور بیخود صاحب کو اپنے پاس اندر بلوایا۔ وہ تو خدا نے بڑی خیر کی کہ بیخود صاحب کو میاں مرادی کے قوار کی خبر نہیں ہوئی۔ ورنہ وہیں لے لے ڈالتے۔

ہاں تو وہی اشرف صاحب بیخود صاحب کو دو گونہ قلعہ کی خاطر تھا۔ ایک تو ان کے والد کے تقدس کی وجہ سے اور دوسرے ان کے سرمایہ کتب کے باعث۔ بیخود صاحب کو کتابوں کی چاٹ پڑ گئی تھی۔ روزانہ ایک ناول لے جاتے اور لگے دن واپس کر کے دوسرا لے جاتے۔ وہی اشرف نے انہیں بڑھیا سے بڑھیا اور گھٹیا سے گھٹیا سائے ناول چٹا دیئے مگر بیخود صاحب ہمیشہ یہی کہتے رہے کہ "میاں اس میں مزہ نہیں آیا۔ کوئی اور دوڑ اور وہی اشرف دلی کے جوتے والوں کی طرح روزانہ ایک ناول (تختہ) ناول دیتے اور وہ اُسے اپنے بڑے سے لاکھی رو مال میں پسٹ کر لے جاتے۔ پڑھتے صرف ناول ہی تھے۔

بیخود صاحب اس وقت اتنی سے اوپر پہنچے تھے۔ ہاتھوں میں ریشہ آگیا تھا۔ چہرہ چہرہ کر رہ گیا تھا۔ رنگ گھٹا ہوا گندمی، سفید براق سرسیدی ڈاڑھی، بس ترشی ہوئی، اتنی عمر سننے پر خامسے ٹانٹے تھے اور سیدھے چلتے تھے۔ بتی پوری نقلی چرمی ہوئی تھی۔ جس کا تاوا کٹر ڈھیلا ہو جاتا اور بات کرنے میں پورا جبار ڈیٹھ آ رہتا، پھر اُسے چبا کر ٹھیک کرتے قبات کرتے۔ لہجہ خالص دلی والوں کا تھا، تکلف سے بری، اور آواز آؤچی اور کراری تھی۔ جب موج میں آتے تو بے ساختہ گالیاں بھی شروع کر دیتے، مگر بڑی جہتہ۔ اور جب انہیں جلال چڑھتا تو

پھر چھوٹے بڑے کا ادب لحاظ بھی اٹھ جاتا۔ ایک دفعہ ٹارن ہال میں بہت بڑا مشاعرہ ہوا۔ بیخود صاحب نے مڈنوں سے مشاعروں میں جانا بھی چھوڑ دیا تھا۔ جنگ کا زمانہ تھا۔ اور غالب سرکاری مشاعرہ تھا۔ کنور مہندرسنگھ وغیرہ منت سماجت کر کے انہیں لے گئے۔ بیخود صاحب نے نئی غزل کہی اور مشاعرے میں پہنچ گئے۔ ہال کچا کچھ بھرا ہوا تھا۔ آگے کی قطاروں میں خواتین بھی تھیں مشاعرہ خوب گرم ہو رہا تھا۔ بیخود صاحب ڈانس پر پہنچے تو استاد کے نام کی آوازیں پڑنے لگیں۔ یوں بھی استاد زیادہ دیر کب بیٹھنے والے تھے، یاد نہیں کون صاحب صدارت کر رہے تھے مشاعرے میں انتشار پیدا ہوتا دیکھ کر استاد ہی کے نام کا اعلان کر دیا۔ بیخود صاحب خود نہیں پڑھتے تھے، ان کا ایک غرضش آواز شاگرد تھا، وہ پڑھا کرتا تھا اس دن اتفاق سے وہ شاگرد ساتھ نہیں تھا، ایک اور شاگرد تھا، وہ نہ صرف بد آواز تھا، طبع موزوں بھی نہ رکھتا تھا۔ بیخود صاحب نے اُسے اپنی غزل دی اور وہ بڑے اہتمام سے اُسے پڑھنے بیٹھا، مگر جب اسے مصرعے مانو نہ پڑھنے شروع کئے تو ہال میں ہنسی پھیلنے لگی اور کچھ آواز سے تادیب سے بھی کئے جانے لگے۔ بیخود صاحب پہلے تو اسے داد کھئے، پھر جو معلوم ہوا کہ بیدا ہو رہی ہے تو مائے حق کے بے آپے ہو گئے۔ وہیں سے منقذات شروع کر کے سٹ گر دی طرٹ کھسکے اور اس کے ہاتھ سے غزل چھین کر بائکر دفون پر اُسے گالیاں دینی شروع کیں مشاعرے میں کھلبلی پڑ گئی اور ایک شور قیامت برپا ہو گیا۔ باسے بیخود صاحب کا کرلکا سنا می دیا اور انہوں نے اپنے شعر تحت اللفظ پڑھنے شروع کر دیئے۔ ہال میں سناٹا چھا گیا۔ شعر ختم ہوتا تو داد کا شور ملتا، ہوتا سبحان اللہ! غزل کا تو ان کی جواب ہی نہ ہوتا تھا، مشاعرہ اپنی کے ہاتھ رہا۔

بیخود صاحب کے ہاتھ سے ہزار دانہ کبھی نہ چھوٹا تھا۔ ہر وقت تسبیح گھومتی رہتی تھی۔ باتیں بھی کرتے جھپٹے ہیں اور دلے بھی کھٹا کھٹ چل رہے ہیں۔ میں نے ایک دفعہ ان کے بالکل قریب بیٹھ کر کنکھیوں سے ان کے کھلے ہوئے منہ میں جھانک کر دیکھا، زبان تالو سے ٹکرائی اور نیچے آجاتی، آجہ جاتی پھر نیچے آجاتی، اور یہی دیر و دم جاری رہتا، اس سے اعجازہ ہوا کردہ اللہ کا ورد کرتے تھے۔

بخود صاحب اپنے وقت میں گوسے پڑھایا کرتے تھے اس لحاظ سے انگریزی ابھی خامی جانتے
 مہل گئے، مگر ہم نے اُن کے منہ سے کبھی کوئی انگریزی کا لفظ نہیں سنا۔ ان کے گوسے پڑھانے کا ایک
 واقعہ یاد آیا۔ ایک دفعہ دس تین مہینے کے لئے انہیں دلی سے کہیں باہر جانا پڑ گیا۔ شاگردوں سے
 انہوں نے چھٹی سے لے کر ایک شاگرد کا امتحان قریب آہنچا تھا، اس نے اپنے کسی سہیلین دوست
 سے کہہ کر اسکے دفتر کے ایک کھرک کو لگا لیا۔ کھرک سے اس نے پوچھا پڑھانے کا کیا لوگے؟
 اس نے اپنی دانست میں بہت بڑھا کر پندرہ روپے ہوا رہتا ہے۔ اس زمانے میں کھرک کو
 پچیس روپے تنخواہ ملتی تھی۔ دس روپے کا سلسلہ شروع ہو گیا، اور تین مہینے میں وہ گورافروٹ
 ہو گیا۔ اسے ماسٹر کو پندرہ روپے مہینہ بھی دیا اور کچھ انعام بھی اور بولتا: مہاراجا پلاشتی پچاس روپے
 لیتا تھا اور اس نے میں ایک سال میں کچھ بھی نہیں پڑھایا۔ بخود صاحب جب لوٹ کر آئے تو
 دیکھا کھرک گرد تو فارغ و تحصیل ہو چکا ہے۔ پوچھایا کیا ماجرا ہے؟ معلوم ہوا کہ فلاں فلاں شخص
 نے کورس ختم کرادیا۔ بخود صاحب اسے کچھ جانتے تھے۔ اس کے پاس پہنچے اور بولے: "میاں
 اب کیا — لوگے؟ ان لوگوں کو کہیں اس طرح پڑھایا جاتا ہے؟ تمہیں اپنے شہر کے اس
 جراح کا قصہ یاد نہیں جو تصانی کے لڑکے کا علاج کیا کرتا تھا؟" پوچھا: "جگہ بدودہ است آں
 حکامیت؟" فرمایا: "ایک تصانی کا لڑکا تھا۔ اس کے پاؤں میں ہڈی کی کڑج چھب گئی اور زخم پک
 گیا۔ تصانی اسے لے کر جراح کے پاس پہنچا جراح روزانہ اس کی مرہم پٹی کرتا اور معائنہ میں
 آدھیر گوشت پاتا۔ سلسلہ دنوں چلتا رہا۔ ایک دن جراح کسی وجہ سے دکان پر نہ جا سکا۔ اس
 کے لڑکے نے تمام بھینسی پھوڑوں والوں کی دیکھ بھال کی۔ شام کو باپ نے پوچھا: "سب کے کام سر
 ہو گئے تھے نا؟" بیٹے نے کہا: "ہاں کام تو سب کے ٹھیک ہو گئے، مگر وہ جو تصانی کا لڑکا آتا ہے اس
 کے زخم سے آج ہڈی کی لیک کر پھٹ گئی، وہ میں نے لکال کر پھینک دی۔" باپ نے کہا: "بے
 غضب کر دیا تو نے! اب کیا خاک کھائے گا! بے دہی ہڈی تو آدھیر گوشت روز کھلا رہی تھی۔
 تو میاں ماسٹر صاحب ان حرام نادلوں کو اس طرح نہیں پڑھایا جاتا جس طرح تم نے پڑھایا کرتے تھے"

میں سب کچھ سے چٹا دیا۔ اگر ہم اس طرح پڑھائیں تو بس کھا لیا جے۔

بخود صاحب کو جن اہل علم و ادب آتا تھا۔ اکثر لوگ انہیں بل کر لے جاتے اور وہ جن آثار کر چلے
 آتے۔ ایک دفعہ ہم میں سے کسی نے کتب خانہ پر اُن سے پوچھا: "کیوں حضرت، کیا واقعی جن ہوتے ہیں؟"
 استاد نے فرمایا: "اے ہوتے ہیں، قرآن شریف میں سورہ جن جو موجود ہے۔ جنوں کے علاوہ پلید
 رد میں بھی ہوتی ہیں، مثلاً چیل، بھتی، بھتتا، بن سرا، سرکا، پھل پیری، آسیب وغیرہ پوچھا
 کیا یہ سب ان فلوں کو ستاتی ہیں؟" فرمایا: "بے شک چیل کھج چبا جاتی ہے، بھتی پٹ
 جاتی ہے اور جن غنا کر بولتے ہیں، بن سرا کا سر نہیں ہوتا۔ سرکے کو دیکھو تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ
 ابھی ابھی کسی نے اس کا سر کاٹ لیا ہے۔ پھل پیری کے بچے ایڑی کی طرف ہوتے ہیں۔ جنوں
 سے اگر مصافحہ کیا جائے تو ان کے انگڑٹھے کی ہڈی نہیں ہوتی۔ بعض گھروں میں بدرد میں رہتے
 لگتی ہیں اور طرح طرح سے رہنے والوں کو ستاتی ہیں۔ یہ آسیب کہلاتا ہے۔" تو استاد
 آپ جن کس طرح آتے ہیں؟" میاں جہاں مال مرحوں کی دھونی دی اور حرام زادی کی چوٹی
 میں بل سے کر دو ٹپکے مارے اور جن بھاگا۔ اور اگر ٹپکوں سے نہ بھاگا تو جوتا سنبھالا۔ استاد
 نے اس ترکیب سے بڑے بڑوں کے جن آثار دیئے تھے۔ سخت سے سخت میٹر یا فوراً رخصت
 ہو جاتا اور دشمن و دشمن تو لمحہ بھر میں غائب ہو جاتا تھا۔

استاد بخود بڑے غمخیز مزاج اور غم باز بھی تھے۔ ڈینگ مارنے میں بڑا کمال رکھتے
 تھے۔ یقیناً اس سے اُن کا مقصد یہ نہیں تھا کہ دوسروں پر اپنا رعب کا ٹھٹھا چاہتے تھے بلکہ
 اپنی پریطعت باتوں سے دوسروں کے دل لہجھاتے تھے۔ بات اس انداز سے کہتے تھے کہ بالکل
 سنجیدہ معلوم ہو مشا کہنے لگے: "امین الدین اور ان کے چند دوست جامع مسجد کی سیر میں
 سے روزانہ سویرے دوڑ لگاتے تھے۔ ایک صاحب گھڑی لے کر کھڑے ہو جاتے۔ دوڑ لگانے
 والی ٹولی دلی دروازے سے نکل کر فیروز شاہ کے کوٹلے، بیر کے مکے، پٹانے تلہ کے سائے
 سے ہوتی ہوئی نظام الدین پہنچتی۔ اور ٹولی چھتری کا چکر کاٹ کر پھر اسی راستے سے لوٹی اور جامع مسجد

کی سیرٹھوں پر واپس پہنچ کر دم لیتی۔ یہ کوئی سوا آٹھ ساڑھے آٹھ میل کا چکر ہوتا ہو گا اور اس میں انہیں بیسیس منٹ لگتے تھے۔ ایساں تک تو بات سمجھ میں آئی تھی کہ ایسا ہوتا ہو گا۔ اب استاد کو زمین کی سوچتی اور فرماتے: ایک دن امین الدین کو راستے میں پیاس لگ آئی اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا: تم چلو میں سامنے کوئٹہ سے پانی پانی کر آتا ہوں۔ دوست آگے بڑھ گئے اور امین الدین نے کوئٹہ کا رخ کیا۔ ڈول چرٹی پر ڈال پانی کھینچا۔ خوب جی بھر کے پیا۔ اتنے میں عجیب طرح کی آواز برابر اس سے سنائی دی کہ میں بھی پانی چلا دو۔ امین الدین نے جو مڑ کے دیکھا تو ایک آدمی کھڑا تھا۔ چم ننگا مگر اس کا سر غائب تھا۔ کئی سوئی گردن پتا زہ تادہ خون تھا۔ اور اس میں سے آواز نکل رہی تھی کہ میں بھی پانی چلا دو۔ امین الدین نے کہا: مہربان مزہ تو ہے ہی نہیں پانی کہاں سے چلاؤں؟ سرکٹے نے کہا: میرے نظر سے میں ڈال دو۔ چنانچہ امین نے ڈول بھسکوا کر اس کے نظر سے میں ڈال دیا۔ سرکٹے نے کہا: جڑی پیاس لگ رہی تھی، مگر ایک بات تو بتاؤ تم مجھے دوسے نہیں؟ امین الدین نے کہا: میاں میں سر دلوں سے تو ڈرتا نہیں بن سر دلوں سے بھلا کیا ڈروں گا؟ گھر دیر سے پہنچے تو امین الدین سے ان کے بڑے بھائی نے پوچھا: اے بھئی آج بڑی دیر کر دی کہاں رہ گئے تھے؟ امین الدین نے سرکٹے سے ملاقات کا واقعہ سنایا تو وہ ہنسنے لگے اور مذاق اڑانے لگے۔ امین الدین نے کہا: ان چیزوں کا مذاق نہیں اڑانا چاہیے، ورنہ وہ پریشان کرنے لگتی ہیں مگر بھائی نہ مانے اور مذاق اڑاتے رہے۔ امین الدین ناشتر لینے بازار چلے گئے، وہاں سے جو بیڑیاں اور دودھ لے کر واپس آئے تو دیکھا کہ بھائی اُٹنے لے گئے ہوئے ہیں۔ ہزار کوشش کرتے ہیں مگر سیدھے جیس ہو سکتے۔ بھئی یہ تو خود ہماری آنکھوں کا دیکھا ہوا واقعہ ہے۔

بیخود صاحب کو اپنی شاعری پر بڑا ناز تھا۔ استاد داغ کے انتقال پر مرزا خورشید جاہ نے بیخود صاحب کے جانشینی کی پٹری باندھی تھی۔ فرماتے تھے کہ خود استاد نے وصیت بھی بیخود دین کے حق میں کی تھی۔ یہ تشنہ کا صیف بھی خوب تھا۔ خدا جانے وہ دوسرے بیخود کون

تھے۔ ذاب سراج الدین احمد خاں ساآمل دہلوی نے پھر یہ کیا کہ داغ کے جتنے مشہور شاگرد تھے۔ سب کو استاد کی جانشینی کی سند دے دی۔ یہ ایک الگ قصہ ہے۔ خیز جارج پنچ کی تخت نشینی اور دلی میں دربار کرنے کے موقع پر بیخود صاحب نے ایک قصیدہ لکھ کر پیش کیا تھا۔ قصیدے کے آخر میں خاصی تعسلی بھی تھی۔ منشی محمد دین صاحب کو جب قصیدہ سنایا تو منشی جی نے کہا: آپ نے اپنا مرتبہ بھی بادشاہ کے لگ بھگ ہی کر لیا۔ بیخود صاحب نے فرمایا: اور کیا؟ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ میں ان سے کچھ کم ہوں؟ وہ بادشاہ ملک ہیں تو میں بادشاہ و سخن ہوں۔

بیخود صاحب کو شکار کا بھی شوق تھا۔ شکار چھوٹا بھی کھیلتے تھے اور بڑا بھی۔ مہاراجہ گوالیار سے ان کے خصوصی تعلقات تھے۔ ایک دفعہ گوالیار گئے تو گوالیار کے اسٹیشن پر اترتے وقت انہیں خیال آیا کہ مہاراج کو تو اطلاع ہی نہیں دی کہ ہم آ رہے ہیں۔ اور زمان صاحب کو جن کے ہاں ٹھہرنا تھا۔ فرماتے تھے کہ اپنی بھول پر افسوس کرتا اسٹیشن سے باہر نکلا تو دیکھا کہ کوئٹوں کی ایک قطار اڑتی چلی آ رہی ہے۔ میں نے امین الدین سے کہا ملبدی سے بندوق لکال کر دینا۔ انہوں نے ملبس کھول کر بندوق لکالی۔ اور میں نے کھڑ تو سس لگا کر اس طرح فیر کیا کہ ایک کوچ تو میرے ہی قدموں میں آ پڑی۔ دوسری ان صاحب کے گھر میں گری جن کے ہاں مجھے مہمان ہونا تھا۔ اور تیسری راج محل میں عین مبارک کے سامنے گری۔ میرے میزبان فوراً سمجھ گئے کہ یہ کوچ بیخود صاحب ہی نے گرائی ہے۔ اور جب ہم ان کے گھر پہنچے تو وہ کھانے کے ساتھ ٹھہری ہوئی کوچ بھی رکھی ہوئی تھی، اور مہاراج نے حاضر باشوں سے کہا: کوئٹہ بڑی عمر ہے ابھی ان کا ذکر ہو رہا تھا کہ ان کے بغیر شکار کا کیا مزہ (کوئٹہ کی طرف اشارہ کر کے) اور دیکھو بیخود صاحب آ پہنچے۔ اور کھانے سے فارغ ہو کر کھوڑی دیر بعد ہم مبارک کی خدمت میں جا پہنچے۔

انکے دن شکار کا بہتر گرام تھا۔ ہاتھیوں پر سوار ہر شیر کے شکار کو چلے۔ جنگل میں ہانکا کیا گیا، شیر نکل کر جب سامنے میدان میں آیا تو سب سے پہلی گولی مبارک کی چلی مگر وہ اچھی پڑی۔ شیر ڈھکی ہو کر جھٹلا گیا، اور چھلانگ مار کر مبارک کے ہاتھ سے جا چٹا۔ میں نے فوراً اُٹھا کر گولی چٹائی

اور شیر و ہنر دیکھ کر گیا۔ مہاراج نے بہت راہ واہ کی اور بے اب واپس چلنا چاہئے۔ میں نے کہا "دُنیا میں ہر جانور کا جوڑا پیدا کیا گیا ہے۔ جب شیر ہے تو اس کی شیرنی بھی ضرور ہوگی۔ اُسے بھی ساتھ لینا چاہئے۔ اب شیرنی کی تلاش شروع ہوئی۔ سب نے اپنے اپنے ہاتھی مختلف سمتوں میں ڈال دیئے۔ ہارا ہاتھی جنگل کے ایک گھنے حصے کی طرف چلا۔ کچھ دیر بعد ہاتھی ایک کھوہ پر پہنچ گیا اور شیرنی چھٹ کر ہاتھی کے سامنے آئی۔ اور اس کی ڈانٹ سے ہاتھی نے ڈر کر صف پلٹ دیا۔ مگر اتنی دیر میں میری گولی چلی گئی تھی اور شیرنی مر چکی تھی۔ اُسے ہاتھی پر لاد کر ہم واپس چلے کوہنے فیر کی آواز سن کر مہاراج اور دوسرے شکاری ہم سے آئے۔ مہاراج نے کہا "لو کھنی اب تو جوڑا تیار ہو گیا اب واپس چلو۔" میں نے کہا "اک ذرا ٹھہریے۔ میں ابھی آیا۔ یہ کہہ کر میں کھوہ میں گھس گیا مجھے خیال تھا جب شیر اور شیرنی میں تو ان کے تجھے بھی ضرور ہوں گے۔ اور ہاتھی میں دو بچے کھوہ میں نظر آئے۔ انہیں اچکن کی حبیبوں میں چھپا کر میں نے آیا اور میں نے کہا "اب چلئے۔ مگر نہیں فدا اور توقف کیجئے۔ شیر کا گوشت کھایا تو جاتا نہیں اور وہ شکاری کیا ہوا جس میں کھانے کے لئے گوشت نہ ملے؟" مہاراج نے کہا "ہاں بات تو ٹھیک ہے۔" قضا عند اللہ سامنے سے ایک کالا ہرن اینڈا ہوا اور زار زار گونج بھر کے سینکٹ میں نے دھان میں سے فیر کیا۔ اس نے دھکیل کھائی مگر اٹھ کر تراٹ ہو گیا۔ ہرن کو جاتا دیکھ کر امین الدین لپکے۔ ہرن نے قلابیں بھرنی شروع کر دیں۔ مگر امین الدین نے دُور کرا سے حاد بایا اللہ اسم اللہ اللہ اکبر کہا اُس کے گلے پر پھیری پھیر دی۔ پھر اُس کی گٹھری بنا کر کندھے پر رکھ کر ہارے پاس سے آئے۔ مہاراج نے ان کی پھرتی کی بہت تعریف کی۔ میں نے کہا "اے دُور نگاہ کی مشق ہے۔ یہ تو زخمی ہرن تھا اگر امین الدین جی پر رکھ لے تو دیکھتے ہی دُور کر جنگل سے ہرن پکڑ لے۔"

بخود صاحب شاعر تو بڑے بڑے گوشتے ہی شری بھی اچھی لکھتے تھے۔ مگر انہیں شکر لکھنے کی طرف زیادہ توجہ نہیں تھی۔ کوئی بیستیس سال اُدھر کی بات ہے مولانا عبدالحلیم شرر نے مروجہ پردہ کے خلاف تحریک شروع کی تھی۔ انہوں نے مضامین بھی لکھے تھے اور ایک ناول "تبدیل النساء" کی

مسیبیت بھی لکھا تھا جس میں پردے کی خرابیاں بیان کی تھیں۔ اس پر ملک میں خامی سے بے ہوئی تھی۔ مولانا شرر نے مہندستان کے مشہور ادیبوں اور شاعروں کی حمایت حاصل کرنے کے لئے کئی خطوط لکھے تھے، کہ اس میں ان کے ہم خیال نہیں۔ اور اس سلسلے میں لکھنا شروع کریں۔ میں اس زمانے میں اسکول کی چھوٹی جماعتوں میں تھا اور ادب کے دوسرے آزاد۔ اتنا یاد ہے کہ آبا مجھے ناری پڑھا ہے تھے کہ ان سے ملنے کوئی بزرگ آگئے۔ آبا نے ان سے کہا تھا کہ شرر کا ایسا ایسا خط آیا ہے اور میں نے انہیں لکھا ہے کہ سب سے پہلے تو اپنی بیوی کا پردہ اٹھاؤ۔ جب میں انہیں ہر بازار پر پردہ دیکھوں گا تو تمہارا ساتھ دوں گا۔ استاد بخود دہلوی تھے کہ "میرے پاس بھی شرر کا اسی مضمون کا خط آیا تھا۔ میں نے اُس کا تو کوئی جواب دیا نہیں البتہ اس کے جواب میں ایک ناول "سنگ و نمک" لکھ کر شائع کر دیا تھا۔ اس ناول میں پردے کی خرابیاں اور بے پردگی کی خرابیاں بتائی گئی تھیں۔ افسوس کہ وہ ناول ایک دفعہ چھپنے کے بعد دوبارہ نہیں چھپا۔ اس کا کچھ حصہ میں نے دمی اشرف صاحب کے رسالہ "شاہ جہاں" میں دیکھا تھا۔ پورا ناول دیکھنے کی آج تک ہوس ہے۔

استاد کے سینکڑوں مثنویاں تھیں بخیرنی لے کر شاعر دہانتے تھے۔ بس اس کے بدست گرد اصلاح لیتے رہتے تھے۔ دیتے دلاتے کچھ نہ تھے۔ دلی کلام مل دے لالہ شکر لال ان کے مثنویاں ہوئے تو مرتے دم تک براہِ سلوک کرتے رہے غالباً استاد کو ان کے ہاں سے اس بارشبرہ بھی ملتا تھا۔ آجہانی نہایت موزوں طبیعت تھے مگر شعر کہنے کی انہیں ہلک بھلک تھی بے شک اُنہوں نے مصرعے کہہ کر استاد کو بھیج دیتے۔ استاد انہیں کیا خاک بناتے پوری غزل کہہ کر خود ہی دیتے۔ لالہ جی کو چند بارش عروں میں غزل پڑھتے سنا۔ شاید کبھی بھول کر کوئی مصرعہ بحر میں پڑھ دیتے ہوں تو پڑھ دیتے ہوں، ویسے معلوم ایسا ہوتا تھا کہ بڑی کوشش سے ہر مصرعہ موزوں پڑھ رہے ہیں۔ لالہ مرنی دھڑل لال پور ملو دے بھی استاد ہی کے شاگرد تھے اور استاد کی بڑی عزت و تکریم کرتے تھے۔ ہر سال لالہ پور میں ایک شان دار مشاعرہ ہڑے اتہام سے کرتے، شاعروں کو دُور دُور سے بلاتے،

بڑی بڑی رقمیں دیتے اور وقتِ رخصت سب کو اپنی دل کو بنا ہوا کپڑا وغیرہ بھی دیتے۔ استاد کو خود آکر دلی سے لے جاتے اور جہتی کے پھولے کی طرح رکھتے۔ لالہ شنکر لال کے بعد لالہ مرثی دھڑا استاد کے کفیل ہو گئے تھے۔ پاکستان بننے کے بعد لالہ مرثی دھڑا ہوائی جہاز کے سانچے میں کام آئے۔ ان کے بعد خدا جلنے استاد پر کیا گزری۔ اب آخر آخر میں حکومت ہند نے ڈیڑھ سو روپے ماہوار کا وظیفہ مقرر کر دیا تھا۔ اس سے استاد کی کچھ اشک شوی ہو گئی تھی۔

ہارڈنگ لائبریری میں فیض الدین احمد مرحوم کے اتہام سے ایک آل انڈیا مشاعرہ ہوا تھا۔ بخود صاحب کو بھی فیض الدین احمد کی کسی طرح رضامند کر کے لے گئے۔ صدارت سر رضا علی کر رہے تھے۔ یہ بڑے سچے ہوئے مزاج کے بزرگ تھے۔ ادب و شعر کا عمدہ ذوق رکھتے تھے بڑے حاضر جواب اور فقرہ طراز تھے مشاعرے کو آخر تک سلیقہ مندی سے چلاتے اور کسی کو شکایت کا موقع نہ دیتے۔ پہلے مشاعروں میں بزرگی و استادی کا یہ تصور سایا ہوا ہے کہ جو جتنا بعد میں پڑھے گا وہ اتنا ہی بزرگ و استاد سمجھا جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر شعرا کی ترتیب اور مقدم موخر پر دیکھا دیکھا ہو جائے، آج کل بھی اس کا خاص طور پر لحاظ رکھا جاتا ہے کہ مشاعرہ نوآموزوں سے شروع کر کے استادوں پر ختم کیا جائے۔ مگر سر رضا علی کی صدارت میں کسی کو دم مارنے کی مجال نہ ہوتی تھی، جس کا نام انہوں نے پکار دیا وہ بے چون و چرا اسٹیج پر پہنچ جاتا تھا۔ ہارڈنگ لائبریری کے مشاعرے میں جب سارے مشاعرے چھوڑ چکے تو اخیر میں دو بزرگ بچے رہ گئے۔ ایک حضرت بخود دہلوی اور دوسرے حضرت ثاقب لکھنوی۔ دونوں ایک سے ایک بڑھا اور پرانا دم لگا۔ سب کو یہ اندیشہ کہ دیکھیں کہیں آخر میں بزمِ بزمی نہ ہو جائے۔ مگر سر رضا علی کا تدبیر آٹے آیا۔ انہوں نے کئی صدارت فوراً چھوڑ دی اور کہا "اب میرے دو محترم بزرگ باقی رہ گئے ہیں جو صاحب چاہیں گے پڑھیں گے۔" اس پر بخود صاحب نے فرمایا "پہلے میں پڑھوں گا" اور ثاقب صاحب نے فرمایا "پہلے میں پڑھوں گا" ایک نے

کہا "نہیں بجائی" آپ مجھے اجازت دیجئے "دوسرے نے کہا "یہ نہیں ہو سکتا" آپ مجھے اجازت دیجئے۔ اب یہ انہیں پکڑ رہے ہیں اور وہ انہیں پکڑ رہے ہیں کہ "نہیں پہلے میں۔" مشاعرے میں پہلی چوٹی، قصہ مختصر بخود صاحب نے فرمایا "آپ ہمارے مہان ہیں۔ اس نے پہلے میں پڑھوں گا میرے بعد آپ پڑھیں گے۔" یہ کہہ کر پڑھنے بیٹھ گئے۔

سچ کرنے کے بعد بخود صاحب کا مزاج بہت بدل گیا تھا۔ ان کی تنگ مزاجی و آشفہ سری تقریباً ختم ہی ہو گئی تھی۔ دردِ بے بخود صاحب تھے کہ ناک پر کبھی تک بیٹھنے دیتے تھے۔ نوب سراج الدین سائل کو اگر یہ زعم تھا کہ میں دماغ کا دماغ ہوں۔ تو انہیں اس کا گھنڈا تھا کہ میں استاد کا چہیتا شاگرد ہوں۔ اور استاد نے اپنے شاگردوں کے چاروں رحبڑ میرے سپرد کر رکھے تھے۔ سائل صاحب سے ان کی کبھی نہ بنی۔ ادب کا انہیں نیچا دکھانا چاہتے تھے۔ دلی کے مشاعروں میں دونوں استادوں کے شاگردوں میں آئے دن جھگڑے ہوتے اور مار پیٹ تک نسبت پہنچتی۔ اس بے ہودگی کی وجہ سے صرف ایک رُخے مشاعرے رہ گئے تھے اور بچلے آدمیوں نے مشاعروں میں جانا چھوڑ دیا تھا۔ مگر یہ عجیب طرح کی محاورت تھی۔ شعری سے قطع نظر دونوں استادوں میں خلوص و محبت کے تعلقات تھے۔ نوب سائل نے اپنے بیٹے کو تاکید کر رکھی تھی کہ بخود صاحب سے اصلاح لیا کر دو۔

بخود صاحب نے دیوانِ غالب کی شرح بھی لکھی تھی۔ اشعار کا مفہوم بڑی خوبی سے بیان کرتے تھے۔ ایک دفعہ ہم نے ان سے پوچھا "استاد آپ نے تو غالب کو دکھا ہو گا؟" فرمایا "ہاں دکھا تھا۔ میری عمر اس وقت پانچ سال کی تھی۔ آبا حضرت کے ساتھ ان کے ہاں جایا کرتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ پہلی دفعہ جب ان کے ہاں گیا تو شام کا وقت تھا۔ ان کے آگے بڑی مزاجی اور گلاس رکھا تھا۔ اور شہری میں تلے ہوئے بادام اور پتے تھے۔ چسکی دگاتے جلتے اور دو دو چار چار دانوں کے ٹھنکیر کرتے جاتے۔ آبا حضرت سے ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ اتنے میں مغرب کی افان ہوئی، تو آبا حضرت نماز پڑھنے کھڑے ہو گئے۔ میں

بچپن میں بہت شرمیلا تھا۔ مگر نئی جگہ ہونے کی وجہ سے خاموش بیٹھا تھا۔ دادا غالب مجھ سے مخاطب ہو کر بڑے "یارچہ" کو کچھ کھاؤ۔ میں نے تھوڑے سے بادام ادا پیتے اٹھائے۔ کچھ مہنی مذاق کی باتیں کرتے رہے پھر ایک دم سے بڑے "یارچہ" تم ہمارے سر پر ایک وصول تو کس کر گؤ۔ یہ کہہ کر اپنا گھٹا ہوا سر میرے آگے کر دیا۔ مجھے اتنا شور کب تھا۔ وصول رسید کرنے کے لئے جھٹ کھڑا ہو گیا۔ اتنے ہی میں آبا حضرت نے سلام پھیر کر "ہوں ہوں" کہا اور مجھے گھور کر دیکھا۔ میں پھر دیک کر بیٹھ گیا۔ آبا حضرت نے کہا "مرزا صاحب قبل اللہ نے بڑی خیر کی۔ مجھے تو منہ دکھانے کو جگہ نہ رہی۔ یہ بڑا دلگئی ہے۔ اس کا کیا ہے؟ یہ تو مار بیٹھا، مگر میں تو کہیں کا نہ رہتا۔"

میں اگر کوئی پرانا لفظ یا محاورہ پوچھنا ہوتا تو بخود صاحب سے پوچھ لیتے۔ ان کے سوادہ میں رہ بھی کون گیا تھا؟ تمام بڑے بڑے دیکھتے ہی دیکھتے اٹھ گئے تھے۔ کتب خانہ پر ایک دفعہ خود استاد ہی کے ایک مقطع پر بحث چل گئی۔ سب نے اس کی تاویلیں طرح طرح سے کیں مگر بات کسی کی نہ بنی۔ آخر میں یہ طے ہوا کہ خود استاد ہی سے اس کا مطلب پوچھا جائے۔ شام کو جب استاد آئے تو ان سے مقطع رجوع کیا گیا۔ فرمایا "یہ شعر یوں سمجھ میں نہیں آئے گا۔ اس میں ایک تلخیص ہے مقطع یہ تھا۔"

بخود کے لب بھی تر نہ ہونے وقت کے کشتی

آلودہ شراب گریبان ہی رہا

فرمانے لگے "یہ شعر ایک واقعہ سے متعلق ہے۔ میں غلاں ریاست میں ملازم تھا۔ رئیس کی محفل خاص روزانہ رات کو سجتی تھی۔ جب دور شراب چلتا تو رئیس کی منظور نظر طوائف جام بھر بھر کر مقررین کو پیش کرتی۔ انکا وہی حال کسی کو نہ ہوتا۔ میں بھی اس سے جام لے لیتا اور منہ تک لے جا کر چپکے سے اپنے گریبان میں الٹ لیتا۔ اب یہ شعر بہادری سمجھ میں آجائے گا۔"

بڑے آدمیوں کی ہنسی کمزوریاں، استاد ہر سوال کا جواب ضرور دیا کرتے تھے۔ لعل علی

کا اظہار کرنا غالباً کسبِ شان سمجھتے تھے۔ اور جب کہیں مجبور ہو جاتے تو ناراض ہو کر بات کو ٹال جاتے۔ ایک زمانے میں سہراب مودی کو "غالب" قلم بنانے کا خیال ہوا۔ مکالمے اور سیناریو سعادت حسن منٹو نے لکھا تھا۔ اس سلسلے میں وہ مجھے بھی بھنی بھونا چاہتے تھے۔ مگر دلی دوائے سے دلی کب چھوٹی سمجھتی۔ میں نے انکار کر دیا۔ اس کے بعد ان کے ایک ڈائریکٹر مسٹر نندا صاحب سے ملنے دلی آئے۔ سو سال پہلے کی تہذیب و معاشرت کے متعلق انہیں اکثر باتیں معلوم کرنی تھیں۔ مجھے ان کا بہت کم علم تھا۔ میں انہیں لے کر بخود صاحب کے گھر مٹیا محل پہنچا۔ مردانہ بیٹیک میں خانہ دنی کا فریش تھا۔ میں ایک صاحب نے بیٹھنے کو کہا۔ تھوڑی دیر میں بخود صاحب تشریف لائے تو میں نے نندا صاحب کا تعارف کرایا۔ ملاقات کی غایت سنکر استاد کو کچھ خوش نہیں ہوئے۔ اُپر آکر بڑے "پوچھنے کیا پوچھنا ہے؟" نندا صاحب نے کہا "مجھے یہ معلوم کرنا ہے کہ اُس زمانے کی جو سواریاں تھیں ان کی کیا مشعلیں تھیں۔ مثلاً تختِ رفاں، ہوادار، تمام حجام، پالکی، ناکی۔" استاد حیرت کر بڑے "پالکی پالکی ہوتی ہے، ناکی ناکی۔ پالکی کیسے ہو سکتی ہے اور ناکی پالکی کیسے ہو سکتی ہے؟" میں نے دیکھا کہ استاد کا پارہ چٹھہ گیا، یہاں دال نہ گئے گی، میں نے نندا صاحب سے کہا "آپ ایسا کیجئے کہ جو باتیں معلوم کرنی ہوں ان کی ایک فہرست بنا لیجئے۔ پھر کسی وقت حضرت کو زحمت دیجئے۔" زحمت دینے کی پھر فہرست نہ آئی۔

استاد کو کبوتر اڑانے کا بہت شوق تھا۔ حال اور کابلیں اوپر چھت پر رہتی تھیں۔ چھتری چھپکا سب کچھ موجود تھا۔ اپنی بنگلہ ہی اڑاتے اور دوسرے کبوتر بازوں کی ٹنگڑیوں سے اڑاتے کس شعل میں اگر کوئی ملنے والا اگر حلاج ہوتا تو مزاج برہم ہو جاتا۔ وہیں سے گالیاں بڑبڑا اُترتے اور بڑے استنکار سے ملاقات فرماتے۔ ایک مہربان اپنے صاحبزائے کو لے کر صحن اس وقت پہنچے جب استاد کی جان کبوتروں میں لڑی ہوئی تھی۔ بہت گلدہ ہوئے۔ بڑا بھلا کہتے نیچے آئے۔ مہربان نے مٹھائی کی تو کڑی پیش کی اور بڑے "یہ میرا لڑکا ہے، شکر کہتا ہے" سے مٹا گروی میں قبول فرمایا۔ ذکر کی تو استاد کا ہاتھ لے کر فوراً اُٹھ چلا گیا۔ اور استاد

نے فرمایا: اپنے کچھ شعر سنناؤ۔ وہ شامت کا مارا نہ جانے کس سے لکھواتا تھا۔ لگا ہمزوں شعر سناتے۔ بخود صاحب ایک دم سے بکھر گئے۔ نکل میرے گھر سے۔ باہر نکل۔ اور گالیوں کا سیلاب اُمنڈ پڑا۔ کھڑے کھڑے اسے اور مہربان کو گھر سے لگا لگا اور گندمی لگا اوپر جا کر پھر کبوتر اڑنے لگے۔

شعر گوئی اور زبان سیکھنے کے شوق میں حیدر آباد جا کر کچھ مہینے استاد کے پاس رہے۔ فرماتے تھے: "مگر کبھی پان پان کٹا تک ان کا نہ کھایا۔ ان کے دیوانوں کی ورق گردانی کرتا اور بجز ایک ایک شعر کو دیکھتا۔ اس مطالبے میں مجھے یہ معلوم ہوا کہ ہر دو چار غزلوں کے بعد ایسے شعر آجاتے جو سمجھ میں نہ آتے تھے۔ ایک دن میں نے استاد سے کہہ ہی دیا کہ میری فہم ناقص میں یہ بات نہیں آئی کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ ایسا تو ہو نہیں سکتا کہ ان اشعار کے معنی ہی نہ ہوں۔ ہو نہ ہو یہ میری کچھ کا قصور ہے۔" استاد نے فرمایا: "ہمیں تم ٹھیک سمجھے۔ میری عادت ہے کہ کبھی کبھی میں جان بوجھ کر نثری شعر کہتا ہوں۔ اس وقت تو بات آئی گئی ہوئی۔ مگر ان اشعار کی قدر و قیمت اب معلوم ہو رہی ہے۔ جب ہم قبر میں پاؤں ٹکائے بیٹھے ہیں۔ پوچھا استاد وہ کون سے شعر ہیں؟" بولے "یاد نہیں۔"

فرماتے تھے کہ حکیم واصل خاں نے استاد داغ سے پوچھا: آپ کے بعد آپ کی زبان لکھنے والا بھی کوئی باقی ہے گا؟ استاد نے فرمایا: "بخود۔ خدا کا شکر ادا کرو کہ مہتاری زبان گھر کے گھر میں رہی۔"

ایک دن فرماتے لگے: "استاد کا مطلع ہے۔"

وہ مزے عشق میں آئے ہیں کہ جی جانتے

رنگ بھی ایسے اٹھائے ہیں کہ جی جانتے

مگر میرا مطلع اس سے بڑھ گیا۔

کہا: "استاد اپنا مطلع سنائیے۔"

فرمایا: "یاد نہیں۔"

استاد بخود بہت جتنے بہت جتنے۔ ان کے والد سے اوپر ہو کر گئے تھے۔ استاد بخود پوری نہ کر سکے۔ ایک پیری و صد عیب، آخر عمر میں طرح طرح کی بیماریوں نے انہیں گھیر لیا تھا۔ یونانی علاج کرتے تھے مرنے سے کچھ دن پہلے عطار کے ہاں سے نسخہ بندھا کر لا رہے تھے۔ داکٹر میں دہی بڑے والا نظر آگیا۔ مرض و مرض سب بھول گئے۔ آخر دلی والے تھے، چڑرپن نے زور مارا اور خوب ڈٹ کے دہی بڑے کھائے۔ اس وقت تو مزہ آگیا، مگر بعد میں اس کی کسر نکلی۔ صنعتِ معدہ کے مرض، اسہال شروع ہو گئے۔ بھلا جو شخص ساری عمر اچھے سے اچھے کھانوں کا شوقین رہا ہو وہ ترک غذا کیسے کرے؟ بد پر میزیاں ہوتی رہیں اور امر امن بڑھتے رہے، یہاں تک کہ موت نے آکر سلام کیا۔ استاد تو اس زندگی سے بیزاری تھے، مہنہ خوشی رخصت ہو گئے۔ جب تک جتنے اوروں کو مہناتے رہے، جب مرے تو صاف ماتم بچ گئی۔ ایسے زندہ دل انسان بھلا اب کہے کو پیدا ہوں گے۔ اچھے لوگ تھے، اچھی گزرا گئے۔ اپنے ساتھ دلی کا نام بھی رکھ کر گئے۔ اب نہ ایسا شاعر پیدا ہو گا اور نہ ایسا انسان ع

حقِ منفرت کرے غیب زاد مرد تھا۔

خواجہ حسن نظامی

حضرت خواجہ حسن نظامی دلی کے اُن بزرگوں میں سے تھے جنہیں زمانہ کبھی فراموش نہ کر سکے گا۔ وہ ایک بہت غریب گھر میں پیدا ہوئے۔ افلاس کی وجہ سے ان کی تعلیم نہ ہو سکی۔ مگر انسان کو اتنا بنانے میں صرف تعلیم ہی تو کارآمد نہیں ہوتی۔ یوں لانے کو تو گدھے پر بھی کتابیں لاد دی جاتی ہیں لیکن گدھا تو گرہا ہی رہتا ہے۔ اصل چیز ہے تربیت۔ خواجہ صاحب حضرت نظام الدین اولیاء کے خواہر زادوں کی اولاد میں سے اپنے آپ کو بتاتے تھے۔ ان کی شرافتِ نسب نے انہیں سنبھالے رکھا۔ ان کے والد بھی درگاؤ محبوب الہی کے خادموں میں شامل تھے۔ درگاہ کی آمدنی میں سے حصہ رسد انہیں بھی کچھ مل جاتا۔ یہ یافتہ اس قدر قلیل تھی کہ اس میں جسم و جاں کا رشتہ بمشکل قائم رکھا جاسکتا تھا تاہم غور والدین نے اپنے لڑکے کو کچھ ایسی تربیت دی کہ مفلس و قلاش ہاں باپ کا بیٹا بعد میں دلی کے مکہ چلیوں میں شمار ہوا۔ ادب میں اپنے زمانے کا سب سے بڑا ادیب کہلایا۔ علومِ دینی میں وہ بصیرت حاصل کی کہ فرنگی حکومت نے شمس العلماء کا خطاب دیا۔ معاملاتِ روحانی میں اتنی ترقی کی کہ تین لاکھ مریدوں کا مرشد بکامل بنا۔ مبلغِ اسلام بنا تو اچھوتوں سے لے کر راجہ ہمارا جادوں تک کو معلقہ بگوشانِ اسلام میں لاشامل کیا۔ سیاست میں قدم رکھا تو دیکھتے ہی دیکھتے صفِ اول کے لیڈروں میں جا پہنچا۔ غرض زندگی کے ہر شعبہ میں حیرت ناک ترقی کی یہ سعادت خدائے بخشندہ کی طرف سے تھی کہ خواجہ صاحب نے مٹی میں بھی ہاتھ ڈالا تو سونا بن گئی۔

میں نے جب سے ہوش سنبھالا خواجہ صاحب کو ایک ہی سادہ کچھا۔ انہیں دیکھ کر یہ خیال ہوتا تھا کہ وقت کی رفتار ٹھم گئی ہے۔ زمانے کی گردش رک گئی ہے۔ آخر آخر میں اُن کی ڈاڑھی میں چند سفید بال البتہ آگئے تھے ورنہ خود اُن میں سرِ موزون نہ آیا تھا۔ لمبا اونچا تہ چھریا بلکہ دُبلاندن سر پر کلاہ نہایتیلی ٹوپی۔ لمبا سا چُنڈ۔ بڑے پانچوں کا پاجامہ۔ پاؤں میں دھیری جوتی۔ رنگ شہابی چہرہ کتابی۔ آنکھوں پر تہہ کفریم کی عینک جس میں سے آنکھیں میرے کی طرح جگر جگر چمکی مچھیں۔ سواری ناک۔ موزوں دہانہ۔ لب ذرا موٹے۔ کتر و لبیں۔ منٹھی بھر پھیری ڈاڑھی۔ صراقی دار گردن۔ مٹاؤں پر کاکھیں کالے ناگوں کی طرح لہرائی اور اُنی کی طرح بل کھاتی۔ چلتے تو کڑی کان کے تیر کی طرح بیٹھتے تو لاکھوں من کے بیٹھے معلوم ہوتے۔ خاموشی میں پہاڑ کا سا سکوت ہوتا اور گنت گویا دریا کی سی روانی۔ خوش گفتار ایسے کہ بات کرتے میں منہ سے پھول جھڑتے، سنسنے والے دھیان کا دامن پھیلا کر انمول پھولوں سے اپنے من کی تھولیاں بھر لیتے۔ سنجیدگی اور بُرد باری کے چنڈرائن کے چہرے پر ہوتے رہتے۔ کوئی خوش مذاقی کی بات بھی کرتے تو خندہ دندان نما سے آگے نہ بڑھتے۔ جس مغل میں بیٹھ جاتے طوطی کی طرح چپکے رہتے۔ کیا مجال جو کسی اور کو اُن کے آگے لب کشائی کا یا راجہ۔ بڑوں میں بڑوں کی سی باتیں کرتے اور بچوں میں بچوں کی سی تمام علوم ظاہری و باطنی میں درک رکھتے تھے۔ اُن کے ایک ہاتھ میں دین اور ایک ہاتھ میں دنیا تھی۔ طرذہ طبیعت کے آدمی تھے۔ دلی سے اُن کا نام اس طرح پیوست ہے جس طرح گوشت سے ناخن۔ اس عجیب غریب مستی پر میرا کچھ لکھنا چھوٹا منہ بڑی بات۔ دوسرے یہ کہ خواجہ صاحب کے مقربین میں سے نہیں۔ دوستوں میں سے نہیں۔ وہ میرے والد کے ملنے والوں میں سے تھے۔ میرے بزرگ اور محترم تھے۔ اکثر انہیں دیکھا اور چند بار اُن کی خدمت میں حاضر ہونے کا بھی موقع ملا۔ یوں ساری عمر اُن کے دسائے۔ اخبار۔ کتابیں اور روزنامے پڑھتا رہا۔ اور ان کی البیلی اُردو کے مزے لیتا رہا۔ گزشتہ تیس سال کے چند ناقابلِ فراموش تاثرات ہیں جو ناظرین کی دلچسپی کے لئے لکھتا

ہوں۔ مثلاً ان میں سے کوئی ایسا ہو جو مستقبل کے مؤرخ کے کام آجائے۔ میں صرف ایک اتفاق مرتب پیش کر رہا ہوں۔

خواجہ صاحب کی اخباری زندگی کا آغاز پھیری پرکتا میں اور اخبار نیچے سے ہوا۔ جامع مسجد کی سیرھیوں پر اُن کی بے خواب راتیں گزریں۔ انہوں نے بھوک اور افلاس کا مزہ کھینچا ہی میں چکے لیا تھا۔ اگر اُن میں غیرت نہ ہوتی تو وہ بھی کنگوں کی طرح اپنی پوری زندگی جامع مسجد کی سیرھیوں پر گزار دیتے۔ یہ اُن کے خاندانی شرف کا جو ہری تھا جو انہیں اُن کی پستی کا احساس دلاتا رہا اور اس گری ہوئی زندگی پر وہ قانع نہ ہو سکے۔ اُن کے دل میں ہمیشہ سے ایک بڑا آدمی بننے کی آئینگ تھی۔ دلی کے چوک اور دلی کی گلیوں میں انہوں نے تعلیم پائی۔ یہی وہ مکتب تھے جن میں انہوں نے تعلیم کے ساتھ ساتھ تجربہ بھی حاصل کیا۔ ناموافق حالات نے انہیں سخت کوشش بنادیا۔ وہ بہت کے پر لگا کر اڑے اور شہرت کے آسمان پر کامیابی کا تارہ بن کر چمکے۔ خدا بھوٹ نہ بھولے تو خواجہ صاحب نے اپنے سینکڑوں ہی اخبار جاری کئے روزانہ

مہفتہ وار۔ پندرہ روزہ اور ماہانہ۔ یہ سب پچے شہابِ ثاقب کی طرح مطلع صحافت پر نمودار ہوئے۔ اپنی خیرہ کن چمک دمک دکھاتے اور دیکھتے ہی دیکھتے فضا میں گھل جاتے۔ ان کا اخبار "مناوی" صرف ایک ایسا پرچہ ہے جو میوں چلے بدلنے پر بھی مشائع ہوتا رہا۔ اور اس کے مشائع ہونے کی وجہ یہ بھی ہے کہ اس میں خواجہ صاحب کا دلچسپ روزنامہ مشائع ہوتا رہا۔ یہ روزنامے کی جدت خواجہ صاحب کے غیر معمولی دماغ کی پیداوار تھی۔ صبح سے رات تک کے واقعات اس میں درج ہوتے۔ اس میں شک نہیں کہ روزنامہ کا مقصد محض خواجہ صاحب کا ذاتی پروپیگنڈا تھا۔ لیکن اس کی مقبولیت کا سبب وہ زبان اور بیان تھا یا وہ اندازِ تحریر جو خواجہ صاحب کے ساتھ پیدا ہوا اور خواجہ صاحب ہی کے ساتھ ختم ہو گیا۔ یہ سیدھا سادا اندازِ بیان ہزاروں کوشش پر بھی کسی کو نصیب نہ ہو سکا۔ اُس کی سادہ پرکاری کا گھائل ایک عالم ہے۔ سر عبد القادر کے "خزن" سے لے کر کن کل کے عمدہ ادبی رسالوں تک شاید ہی کوئی ایسا ہو

جو خواجہ صاحب کے معنایں مشائع کرنے کو اپنے اعلیٰ کارناموں میں شمار نہ کرتا ہو۔

دلی کے خاص لوگوں میں سے ایک صاحب میں محمد رفیع تھے جو کچھ چیلان میں رہتے تھے۔ اور دلی کے اچھے آسودہ گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ غصے متحمل آدمی تھے، جاندار بھی کافی تھی۔ عربی، فارسی اور اردو سے شغف رکھتے تھے۔ طبیعت کا رجحان مذہب کی طرف زیادہ تھا۔ ہم نے ہمیشہ سے اُن کے منہ پر چھوٹی سی ڈاڑھی دیکھی۔ ڈاڑھی کی لمبائی ڈاڑھی کی معذرت تھی۔ ادب سے کچھ سی کی وجہ سے اُن کا تعلق گزشتہ چالیس پینتالیس سال پہلے کے تھام اچھے ادیبوں اور شاعروں سے رہتا تھا۔ اُن میں علامہ راشد الخیری۔ خواجہ حسن نظامی اور نیاز فتح پوری جیسے حلیل القدر ادیب شامل تھے۔ ان صاحب سے خواجہ صاحب کا تعلق دو گونہ تھا۔ ایک تو ادب کا اور دوسرے مذہب کا۔ ارفعی صاحب نے بھی کئی رسالے نکلے جن میں درویش بہت مشہور ہوا۔ خواجہ صاحب نے جب حلقہ مشائخِ نواب بڑھن کے کمرے پر قائم کیا تو "نظام المشائخ" کے نام سے محمد رفیع صاحب نے ایک ماہنامہ جاری کیا۔ اس پرچہ میں جہاں اہلِ سلوک کے مسائل پر معنایں ہوتے تھے وہاں اعلیٰ درجہ کے ادبی معنایں بھی مشائع ہوتے تھے۔ خواجہ صاحب نے اُس زمانے میں بہت اچھے اچھے معنایں لکھے۔ محمد رفیع صاحب کو خواجہ صاحب نے "تلا واحدی" کا خطاب دیا جو اتنا مشہور ہوا کہ آج واحدی صاحب کو سب جانتے ہیں اور محمد رفیع کو کوئی نہیں جانتا۔ واحدی صاحب کی دولت اور خواجہ صاحب کی عقل نے مل کر بہت بڑے بڑے کام کئے۔ روپیہ لگانے والے خواجہ صاحب کو ہمیشہ مل جاتے تھے۔ واحدی صاحب کی طرح خواجہ صاحب کے ایک اور بہت بڑے قدر وال بھتیجا احسان تھے جو میرٹھ کے رئیسوں میں شمار ہوتے تھے۔ انہیں بھی علم و ادب کا بہت شوق تھا۔ ان کا ایک اخبار بھی لکھا تھا۔ اسی اخبار کے سلسلے میں خواجہ صاحب سے ان کے دوستانہ تعلقات قائم ہوئے۔ کال ہار کی مسجد کا جب پہلی دفنہ ہو گیا تھا تو خواجہ صاحب میرٹھ ہی میں تھے۔ اور انہوں نے ایک بہت بڑے جلسے میں ایسی دھواں دھار تقریر کی کہ

مسلمانوں میں جوش و خروش پھیل گیا۔ اس تقریر سے خواجہ صاحب کی بہت شہرت ہوئی۔
بھیا احسان اور واحدی صاحب سے خواجہ صاحب کے تعلقات قیام پاکستان تک بنایت
مخلصانہ رہے۔ پاکستان بننے کے بعد خواجہ صاحب تو دلی ہی میں رہ گئے اور بھیا احسان اور
واحدی صاحب کراچی چلے آئے۔ یہاں آکر جو حال اور سب مہاجروں کا ہوا وہی ان
کا بھی ہوا۔

روایت عام کے مطابق خواجہ صاحب کے تین لاکھ مرید تھے۔ مہندو اور عیسائی بھی ان
کے مرید تھے۔ ایک اطالوی شہزادی بھی ان کی مرید تھی۔ فراتے تھے کہ برنارڈ شاہ بھی میرا مرید ہے
اور پرنس آف ویلز (ایڈورڈ ہشتم) نے بھی میرے مریدوں میں شامل ہونے کے لئے مجھے
جسٹس لکھی ہے۔

خواجہ صاحب کو خطابات دیئے اور نام رکھنے کا عجب سلیقہ تھا۔ علامہ راشد الخیری کو
”مصور غم“ خواجہ صاحب ہی نے خطاب دیا تھا۔ میرے والد کو ”وارث الادب“ کہتے اور
لکھتے تھے۔ خود مصور فطرت تھے۔ ان کی بیگم خواجہ بانو میں۔ ایک بیٹی حور بانو اور دوسری روضہ۔
صنیاء الدین احمد کو ان کی تاریخی معلومات کی وجہ سے برنی خطاب دیا تھا۔ کوئی ناسوتی نظامی
تھے اور کوئی ابن عربی۔ ایک صاحب ملتان نظامی کہلاتے تھے۔ بھیا احسان کشنی شاہ تھے۔
ایک صاحب ستری کشنی کہلاتے تھے۔ کوئی جمالی تھا کوئی غزالی۔ ایک تھے قلندر نظامی۔ یہ
قلندر نظامی بھی عجیب چیز تھے۔ ان کی وضع قطع خواجہ صاحب سے مثلاً یہ تھی۔ بلکہ کہا جاتا تھا
کہ خواجہ صاحب کی اُترن ابھی کو ملتی ہے۔ وہی پہلی ٹرپی۔ وہی چنڈ۔ کاکلیں چھٹی ہونیں۔ عمر
میں خواجہ صاحب سے بڑے تھے۔ بہت غریب آدمی تھے۔ وضعدار رہے کسوائے خواجہ
صاحب کے اخباروں کے اور کسی کا اخبار نہ بیچتے تھے۔ دلی والے کہتے تھے کہ خواجہ صاحب
کو پیر و مرشد بنانے میں قلندر نظامی نے بڑا کام کیا ہے۔ روایت مشہور تھی۔ (اور اکثر غلط
روایتیں بھی زیادہ مشہور ہو جایا کرتی ہیں) کہ قلندر نظامی کا کام یہ تھا کہ خواجہ صاحب کو

سجدے کرتے رہیں۔ یہ سجدے بڑے خضوع و خشوع سے کئے جاتے تھے اور دیکھنے والے
ان سے بے حد متاثر ہوتے تھے۔ یہ بھی کہا جاتا تھا کہ ان کا فی سجدہ کچھ مقرر تھا۔ اس طرح
قلندر نظامی نے کافی رستم کائی۔ خیریم نے تو یہ دیکھا کہ قلندر نظامی بہت ضعیف ہو
گئے تھے اور کوئی کام نہیں کر سکتے تھے۔ خواجہ صاحب ہی کچھ سلوک کرتے تھے جو ان کی
زندگی کے آخری دن تیرہتے تھے۔

خواجہ صاحب جدت طرازیوں کے دلدادہ تھے۔ عیسوی، ہجری، فصلی سنوں
کے مقابلہ میں انہوں نے اپنا ایک سن وضع کیا تھا۔ بارہ مہینوں کے نام بارہ اماموں پر
رکھتے تھے اور سات دنوں کے بھی مقدس نام تجویز کئے تھے اپنی بعض کتابوں کے نام بھی عجیب غریب رکھتے تھے۔
کم موت، فرام قبلہ و شملہ، طاہر بر خضار یزید، کانا باقی، مرشد کو سجدہ تعظیم وغیرہ
جب شرمعی نے بہت زور پکڑا تو خواجہ صاحب نے تبلیغ کا کام شروع کر
دیا۔ اس میں اتنے کامیاب رہے کہ ایک چھوٹے موٹے راجہ کو بھی انہوں نے مسلمان
کر لیا تھا۔ مگر سوامی شردھانند کی تحریک بڑھی ہی جاتی تھی۔ اُس کے ساتھ پوری مہندو
قوم کی دولت تھی۔ خواجہ صاحب نے تاڑ لیا کہ یہ یوں نہیں دے گا۔ لہذا انہوں نے سوامی
جی کو مبلغ کا چیلنج دے دیا۔ خواجہ صاحب نے کہا۔ آؤ ہم تم دونوں قطب مینار پر سے
چھلانگ لگاتے ہیں۔ جو سچا ہو گا وہ جی جائے گا۔ اور جو جھوٹا ہو گا وہ مرجائے گا۔ خواجہ
صاحب نے تمام اخباروں میں اس کا اعلان کروا دیا اور اس کا وقت بھی مقرر کر دیا۔ اُس دن صبح ہی
سے قطب مینار پر ٹھٹ کے ٹھٹ لگنے شروع ہو گئے۔ خلقِ خدا اُڑی چلی آئی تھی۔ وقت مقرر
پر خواجہ صاحب آپہنچے مگر شردھانند نہیں آئے۔ خوب غصہ ٹھٹھی ہوئی اور میدان خواجہ
صاحب کے ہاتھ رہا۔ (ایک روایت یہ بھی ہے کہ شردھانند پہنچ گیا خواجہ صاحب نہیں پہنچے)
دلی میں جتنے بھی مسلمان ایڈیٹر اور اشتہاری حکیم تھے سب کے سب بالواسطہ یا بلا
واسطہ خواجہ صاحب کے مرید بن گئے تھے۔ خواجہ صاحب نے کتابوں اور رسالوں کے علاوہ

دوائیں اور غذائیں بھی بھیجی شروع کر دی تھیں۔ فقیر کی جتنی "اور" چودہ چھارے" اور عجیب عجیب ناموں کی دوائیں تھیں۔ دوائیں ان کی کتابوں سے بھی زیادہ کئی تھیں۔ یونانی اور فاسفورس کا تیل تو پاکستان بننے سے پہلے تک مشہور ہوتا رہا۔ تجارت کا اصول یہ سمجھا جاتا تھا کہ کتابوں میں چار آنے کا ایک روپیہ بنتا ہے اور دواؤں میں ایک آنے کا ایک روپیہ۔ اکثر باہر والے کسب معاش کے لئے دلی آئے اور خواجہ صاحب کے ہاں ملازم ہو گئے۔ بختر سے دواؤں میں انہوں نے خواجہ صاحب کا سارا کاروبار سیکھ لیا۔ خریداروں کے پتے ان کے ہاں سے چرانے اور نوکری چھوڑ کر خود اپنا کاروبار لے بیٹھے۔ اور برکت بھی اللہ نے ان کے اس چوری کے کاروبار میں ایسی دی کہ ان میں سے کئی تو اب لکھ پتی ہیں۔ خواجہ صاحب کے رسالے بھی تھک گئے اور دوائیں بھی۔ مگر ان کے رسالے بھی خوب چل رہے ہیں اور دوائیں بھی۔ ان میں سے ایک صاحب شاکی تھے کہ کراچی میں بہت منہگائی ہے، فرماتے تھے کہ جو کچھ شیشی پہلے ایک آنے میں گھر پڑتی تھی۔ اب دو آنے میں تیار ہوتی ہے۔ کئی پہلے بھی تین روپے کی تھی اور اب بھی تین ہی روپے کی بچنی پڑتی ہے۔

ایک زمانے میں خواجہ صاحب کی قوت ارادی غیر معمولی طور پر بڑھی ہوئی تھی۔ ان کی آنکھوں میں وہ قوت تھی جو سمر بزم کرنے والوں میں ہوتی ہے۔ جہاں انہوں نے کسی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں اور وہ موم ہوا۔ ایک دفعہ خواجہ صاحب دوپہر کو اپنے دفتر میں اکیلے بیٹھے تھے کہ ایک لٹھ بند آریہ سماجی غنڈا اندر گھس آیا۔ خواجہ صاحب نے کھتے کھتے قلم روکا، آنکھیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور بے چلے جا رہیاں سے۔ اور وہ کچھ ایسا مرغوب ہوا کہ فوراً واپس چلا گیا۔ ایک دفعہ اور ایک ایسا ہی واقعہ پیش آیا۔ پرانی متلی کتابوں کا ایک ذخیرہ دکھانے کے بہانے سے ایک ہندو خواجہ صاحب کو ایک گھر میں لے گیا۔ جب خواجہ صاحب گھر میں داخل ہو گئے تو اس نے کڑا ہندو کے گنڈی لگالی۔ خواجہ صاحب بالکل ہراساں نہیں ہوئے۔ ڈپٹ کر بولے "کھول دو دروازہ۔ اس نے سہم

کرد دروازہ کھول دیا اور خواجہ صاحب بڑے اطمینان سے اپنے گھر چلے آئے۔ پر وہ پگینڈا خواجہ صاحب کی سب سے بڑی قوت بھی تھی اور مرکز دہری بھی، خلی بھی اور عیب بھی۔ اپنی بات منوانے کے لئے وہ جائز و ناجائز، موزوں اور ناموزوں کا امتیاز اٹھا دیتے تھے۔ مثلاً سلطان جی کی باؤلی پر سے جو گھسیارا بائیں ہاتھ سے اندر جاتا ہے اس کے سرے پر ایک قبر سب سے نمایاں ہے اس پر کتبہ لگوا دیا۔ حسن نظامی کے دادا کی قبر۔ واللہ اعلم بالصواب۔

اردو کا پر وہ پگینڈا کرنے پر آئے تو اپنے ایک گھر کا نام "اردو منزل" رکھ دیا۔ اور اس میں تمام ٹائیل لگوا دیئے جن پر ہر گھر اردو اور گھر گھر اردو لکھا ہوا تھا۔ یہ ٹائیل انہوں نے خود بنوائے تھے اور تلقین فرمائی تھی کہ تمام مسلمانوں کو یہ ٹائیل خرید کر گھروں میں لگوانے چاہئیں۔

خواجہ صاحب کے دماغ میں نئی سے نئی آئی تھیں۔ ایک زمانے میں اعلیٰ پمیلنے پر کتا میں چھاپنے کا اعلان کیا۔ اس کے لئے ایک کمپنی قائم کی جس کا نام دی حسن نظامی ایسٹرن لٹریچر کمپنی لٹیڈ رکھا۔ اس کے مقصد فروخت کئے گئے، خوب روپیہ برسا، مگر کچھ ہی عرصہ بعد یہ کمپنی ایسی غائب ہوئی کہ لوگ اسے بھینکے ہی رہ گئے۔ اسی طرح غالب کے مزار کے لئے کئی دفعہ اپیل کر کے چندہ جمع کیا مگر مزار نہ بن سکا۔ لیکن ان کے عقیدت مندوں کی عقیدت مندی میں کوئی فرق نہ آیا۔

خواجہ صاحب کو غصہ کبھی نہ آتا تھا۔ ہنایت شائستہ اور موثر گفتگو کرتے تھے ہر ایک کی سنی سفارش کے لئے جھٹ تیار ہو جاتے اور دالے۔ درے۔ قدم سخنے اس کی مدد کرتے۔ غرض ان میں نام کو نہیں تھا ہر ایک سے اچھی طرح پیش آتے۔ یہاں تک کہ بدخواہوں اور دشمنوں سے بھی۔

خواجہ صاحب بھی ہوئی طبیعت کے آدمی تھے۔ جہی پیشواؤں میں بھی شمار ہوتے تھے۔

مگر تنگ نظر ملکائیت سے کوسوں دور تھے۔ تھینٹا اور سینا دیکھتے تھے۔ قزاقی تو خیر سائے ہی صوفی سنتے ہیں۔ خواجہ صاحب قزاقی کے علاوہ بھی اور سبب کے گانے سن لیتے تھے۔ کوئی تیس سال اُدھر کا ذکر ہے۔ کرنل اشرف الحق حیدر آباد دکن سے دلی آئے ہوئے تھے۔ یہ بھی ایک عجیب و غریب شخصیت کے آدمی تھے۔ چودہ سال ولایت میں رہ کر ڈاکٹری پڑھی تھی۔ ریاست دکن کی افواج کے بڑے ڈاکٹر تھے۔ ہزل اور خش گوئی میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ مسکرات کے تجربات کرتے ساری عمر گذر گئی۔ تجزیہ اپنے اوپر بھی کرتے تھے اور دوسروں پر بھی۔ مزاج دو ویشا نہ تھا۔ فرقہ و فاعیہ سے منسلک ہو گئے تھے اور خلیفہ بھی ہو گئے تھے۔ ضربیں لگا لیتے تھے۔ کیمیا بنانے کا بھی شوق تھا۔ مگر سونا بھی نہیں بنا۔ ہمیشہ ایک آج کی کسر رہ گئی۔ کرنل صاحب کے تعلقات خواجہ صاحب سے مخلصانہ تھے۔ اس زمانے میں جب دلی آئے تو اپنے آبائی مکان میں اترے۔ یہ مکان ترا بابیرم خاں مفتی والوں کے پھانک میں ہے۔ ٹیڑھا بنا ہوا ہے۔ اس لئے ٹیڑھی جوتی کہلاتا ہے اس ٹیڑھی جوتی کی کھلی چھت پر ایک محفل سماع برپا ہوئی۔ دلی میں دو ہفتے محفل چول کرگانی تھیں۔ یہ مہترانیاں کہلاتی تھیں۔ انہوں نے تو خود کبھی نہیں کیا البتہ ان کے باپ دادا لال لگی تھے۔ انہوں نے بچپن ہی سے گانا سیکھا تھا۔ شرفا کی مجلسوں میں جاتی تھیں۔ ہر جگہ جاتی تھیں۔ صاف ستر لباس۔ اچھے چہرے ہوتے۔ مستملین گنگو، قاعدے قرینے سے واقف۔ ایک بہن ڈھولک لے لیتی۔ برابر میں استاد جی سادگی لے کر بیٹھے پیچھے ہارونیم والا ہوتا۔ ایک بڑے بڑے گچھوں والا آدمی ان کے ساتھ ہوتا۔ یہ ان کا باپ تھا۔ ساز ملے راگ شروع ہوا۔ بھیری آوازیں سماں بندھ جاتا تھا۔ اس محفل میں خواجہ صاحب بھی شریک ہوئے تھے۔ مثنوی مذاق کی باتیں ہوتی جاتی تھیں۔ اس زمانے میں مولانا محمد علی سے خواجہ صاحب کی خوب چل رہی تھی۔ روزانہ خواجہ صاحب کے پوسٹر نکل رہے تھے۔ مولانا محمد علی نے خواجہ صاحب کا نام ہی قد آدم پوسٹر رکھ دیا تھا۔ کوئی غنزل گائی جا رہی تھی۔ پورا شہر یاد نہیں رہا۔ مصرعہ ثانی تھا:

مہتماری بدگمانی چھپ گئی ہے اشتہاروں میں۔

اس پر ایک تہجد پڑا تو خواجہ صاحب چونکے اور سکر کر بولے "کیا ہے؟ کوئی پوسٹر؟ اس پر ایک اور تہجد پڑا اور دیر تک سب ہنستے رہے۔

ایک دفعہ خواجہ صاحب اور مولانا محمد علی میں علی اور اسی علی کہ بھلے آدمی تڑا تڑا چکارا مٹے۔ ایک صاحب تھے ضیاء الحق ہاپڑ کے رہنے والے۔ اپنے وقت کے بڑے مشہور لوگوں میں سے تھے۔ انہیں بڑے بڑوں کو نیچا دکھانے میں مزہ آتا تھا۔ ہر ایک کی ٹوہ لیتے رہتے اور جہاں موقع ملتا چٹک لیتے۔ ان کے کاٹے کا سنتری نہ تھا۔ اپنے اس فن کی وجہ سے ہزاروں کے واسے نیائے کرتے تھے۔ یہ صاحب خواجہ صاحب کے بھی دوست تھے اور مولانا محمد علی کے بھی۔ نہ جانے ان کے جی میں کیا آئی کہ انہوں نے ان دونوں دوستوں کو لڑا دیا۔ خواجہ صاحب کا کوئی خط تھا جس کی بنیاد پر انہیں انگریزوں کا جاسوس ٹھہرا گیا۔ مولانا محمد علی انگریز کے نام سے چلتے تھے ان کے تو تلواروں سے جوگی تو تالو سے نکل گئی۔ ایسے چراغ پا ہوئے کہ اپنے اخلاقی مبدد میں انہوں نے خواجہ صاحب کے خلاف لکھنا شروع کر دیا۔ خواجہ صاحب بھلا کب دینے والے تھے۔ انہوں نے ترکی بہ ترکی جواب دینا شروع کیا اور ایک نیا اخبار اس جنگامہ کے لئے جاری کر دیا۔ دونوں طرف سے وہ گندگی مچھل کر توبہ کیا۔ اس کا یہ برا اثر پڑا کہ دونوں کی قدر و وقعت لوگوں کے دلوں سے جاتی رہی۔ خواجہ صاحب کے اخبار میں ایک کارٹون چھپا جس میں دکھایا گیا تھا کہ ایک دیوبند شخص نہایت خونخوار انداز میں کھڑے ہیں اور اس کے سامنے ایک ننھا سا بچہ بیٹھا ہے۔ بچہ کہہ رہا ہے "تو غرور ہے اور میں بچہ۔ میں تیری ناک میں گھس جاؤں گا۔" بائے کچھ لوگ بچے میں پڑے اور لڑائی بند کر لی گئی۔ خواجہ صاحب نے اس ساری لڑائی کی روداد "جنگ مصیفین" کے نام سے کتابی شکل میں شائع کی۔ یہ کتاب خوب کی۔

خواجہ صاحب کوئی سے نئی سرچھی تھی۔ ایک دفعہ دلی کے ہندو مسلمان بکھڑے

عیسائی سائے ایڈیٹروں کو آموں اور آئس کریم کی دعوت دی۔ بڑا عمدہ انتظام کیا۔ اعلیٰ درجہ کے سردی آم کھلانے اور بڑی خوش ذائقہ آئس کریم۔ انگریزوں کو تو قالی سسزانا تو ان کے لئے ایک عام بات تھی۔ سترھویں کے موقع پر عرس سے ایک دن پہلے خواجہ صاحب میدانِ عرفات میں اپنے انتظام سے قوالی کراتے تھے۔ انہوں نے اپنے احاطوں اور کمروں اور زمینوں کے عجیب عجیب نام رکھے تھے۔ انہی میں سے ایک احاطہ کا نام میدانِ عرفات تھا۔ ایک دادنی اکین تھی۔ ایک ایمان خانہ تھا جو جس گھر میں رہتے تھے اس کا نام رین بسیر تھا۔ قوالی میں شہزادہ باہر کے تمام مشہور آدمی مدعو ہوتے تھے۔ ہندو اور سکھ بھی بڑی عقیدت سے اس محل میں شریک ہوتے تھے۔ خواجہ صاحب تقریر کرتے اور سلطان جی یا امیر خسرو کے واقعات بتاتے۔ ہندوستان کی چیدہ چیدہ لڑیاں قوالی سناتیں۔ ایک زمانہ میں بخشہ قوال کا زور بند صاحب اس پر کسی وجہ سے عتاب ہو گیا۔ تو داعظ قوال نے اپنا رنگ جمایا۔ داعظ قوال صاحب خود پیری مریدی کرتے تھے۔ وہ بھی کچھ عرصہ بعد ممتوب ہو گئے۔ ان کے بعد پریم راگی مشہور ہوئے اور وہ لدگئے تو ایک چھپرگا قوال تھا۔ اُسے نظام راگی کا خطاب دے کر مشہور کیا گیا۔ غرض خواجہ صاحب کے خاص قوال یوں بجاہتے بگڑتے رہے۔

میرے لڑکپن میں خواجہ صاحب نے دلی سے ایک نیا اخبار "زمیت" جاری کیا تھا۔ اُس میں کام کرنے سردار دیوان سنگھ دلی آئے تھے سردار دیوان سنگھ پہلے کہیں کپاڑہ ڈر تھے مگر انہیں ہمیشہ یہ خیال تھا کہ مجھے تو بڑا آدمی بننا ہے۔ اخبار نویسی کا شوق رکھتے تھے۔ اخبار "زمیت" کی ایڈیٹری سے ان کی اخباری زندگی شروع ہوئی۔ خواجہ صاحب نے ان کے غلوں و محبت کو دیکھ کر مفتوں کا خطاب دیا۔ پھر دیوان سنگھ صاحب نے اپنا اخبار ریاست مشائع کرنا شروع کر دیا۔ جو آج تک اردو کے تمام مہنت دار اخباروں میں مسطور ہے۔ مفتوں سے خواجہ صاحب کے تعلقات سالہا سال تک اچھے رہے۔ کبھی کبھی ان

میں کھٹک بھی گئی مگر صلح صفائی ہو ہو گئی۔ پھر ایک معاملے میں ایسی بگڑی کہ ہزار کوششوں پر بھی سردار صاحب کا دل صاف نہ ہو سکا۔ اور آخر تک یہ کشش جاری رہی۔ خواجہ صاحب نے بھی مفتوں کے خلاف بہت کچھ لکھا مگر اخیر میں خود ہی غامخ ہو نا پڑا۔ کیونکہ مقابلہ بڑے بڑے ڈھب آدمی سے تھا۔ خواجہ صاحب نے ایک بات یہ بڑے مزے کی لکھی تھی کہ میں نے سردار دیوان سنگھ کو "مفتوں" کا خطاب دیا تھا جس کے معنی ہیں "فتنہ زدہ"۔

خواجہ صاحب کی مطبوعات کئی سو ہیں۔ یہ کتابیں تین طرح کی ہیں۔ ایک تو وہ ہیں جو خواجہ صاحب نے خود لکھی ہیں۔ دوسری وہ ہیں جو خواجہ صاحب نے لکھوائی ہیں یا ترجمہ کرائی ہیں اور مصنف یا مترجم ہی کے نام سے شائع ہوئی ہیں۔ تیسری وہ خواجہ صاحب نے اپنی نگارانی میں اور اپنے ہی طرزِ تحریر میں لکھوائی ہیں۔ موزوں لاکر کتابوں پر اصل مصنف کا نام نہیں دیا گیا۔ خواجہ صاحب ہی کے نام سے یہ کتابیں منسوب ہیں۔ بعض لوگ اس بات کو خواجہ صاحب کی بددیانتی پر محمول کرتے ہیں۔ لیکن اصل بات یہ ہے کہ خواجہ صاحب نے ان کتابوں میں اپنی اصلاح و ترمیم کی ہے کہ یہ کتابیں حقیقت میں انہی کی ہو گئی ہیں۔ واقعات تو وہی ہیں جو سینکڑوں کتابوں میں بھرے پڑے ہیں۔ انہیں ایک خاص انداز میں سلیقے سے پیش کرنا ہی اصل کمال ہے۔ ظاہر ہے خواجہ صاحب ہندی کے پنڈت نہیں تھے لیکن خواجہ صاحب کا ترجمہ قرآن ہندی میں موجود ہے۔ خواجہ صاحب نے یہ ہندی خود تو لکھی نہیں ہوگی۔ کسی اچھے ہندی جاننے والے سے لکھوائی ہوگی۔ مگر اس کا ایک ایک لفظ خوب نطونک بجا کر دیکھ لیا ہو گا۔ فقرے بھی بدلولے ہوں گے۔ ترجمہ کی صحت کا بھی خیال رکھا ہو گا۔ ترجمہ کی ذمہ داری بھی خواجہ صاحب ہی کے سر ہے اس لئے یہ ترجمہ خواجہ صاحب ہی کا ہوا۔

دلی میں ایک جلیل عالم مولوی عبدالسلام صاحب ہیں۔ انہیں دُنیا بھر کے علوم پر عبور حاصل ہے جس علم سے کہئے خدا کا وجود ثابت کر دیتے ہیں۔ ان کے علم کی دھاک دُور دُور تک مٹتی ہوئی ہے اور واقعہ یہ ہے کہ وہ اپنا جواب نہیں رکھتے مزاج تلخ انداز

ہے۔ اپنے آگے کسی کو نہیں گردانتے۔ اور حسب انہیں جلال چڑھتا ہے تو علوم کے سمندر میں طوفان اُچھلتا ہے۔ پھر مولانا کی جادو بیانی سُننے سے تعلق رکھتی ہے۔ ضلع جگت پر اُتر آتے ہیں تو وہ ناکہ جوڑی کا بچہ کہتے ہیں کہ بیوند پر بیوند لگتا چلا جاتا ہے اور ہزار جامہ تیار ہو جاتا ہے۔ تصوف کے بھی دلدادہ ہیں۔ عرسوں میں شریک ہوتے ہیں۔ قوالی سُننے ہیں۔ رنڈیوں کا گانا بھی سُننے میں حُسن پرست ہیں۔ ہر چیز میں یار کا جال دیکھتے ہیں۔ کسی کے کہنے سُننے کی پروا نہیں کرتے۔ اور کس کی شامت نے دھکا دیا ہے کہ ان سے بھڑے۔ انہیں چھیڑنا تو ایسا ہے جیسے بھڑوں کے چھتے کو چھیڑ دیا۔ پچھیا چھڑانا مشکل ہو جاتا۔ مگر ان کی تقریر کا لطف اُٹھانا ہو تو ایک ذرا انہیں چھیڑنا ہی پڑتا ہے۔ بس پھر آپ چُپکے رہتے اور ان کی گل فشاںی گھنٹوں سُنے جاتیے تو ان مولانا عبد السلام سے خواجہ صاحب کی بھی یاد آتی تھی۔ خواجہ صاحب نے ان سے فرمائش کی کہ آپ ایک کتاب تصوف پر لکھ دیجئے۔ مولانا نے فرمایا: خدا خوش رکھے لکھ دیں گے شیخ۔ مولانا کو لکھنے کا شوق نہیں ہے پھر بھی انہوں نے اپنے خلاف مزاج ایک پوری کتاب تصوف پر لکھ دی۔ کتاب پوری ہوئی تو کسی جمہرات کو سلطان جی پسینے اور فاختہ پڑھ کر خواجہ صاحب کے ہاں گئے۔ خواجہ صاحب تو انہیں خوب اچھی طرح سے جانتے ہی تھے۔ بڑے سلیف سے کتاب کے بارے میں بات چیت کرتے رہے۔ مولانا کی تعریف کی۔ کتاب کی تعریف کی۔ مبادیہ بھی ان سے طے کر لیا۔ اخیر میں بولے کہ آپ کے نام سے مشائع نہیں ہوگی۔ مولانا نے کہا: "کیا مضافۃً ہے شیخ" خواجہ صاحب بولے "میرے نام سے مشائع ہوگی" مولانا کا چہرہ مٹرخ ہو گیا۔ خواجہ صاحب کا کچھ لحاظ ہی کر گئے خواجہ صاحب کے ہاتھ سے کتاب لے کر اس کے چار ٹکڑے کئے اور روٹی کی ٹوڑی میں ڈال دی۔ خواجہ صاحب نے کہا: "یہ آپ نے کیا کیا؟" بولے "خدا خوش رکھے" چار پلاؤ شیخ" اور پی کر چلے آئے گویا کوئی بات ہی نہیں ہوئی۔ اخیر تک خواجہ صاحب سے، اُکی دھنداری سے ملتے رہے۔ وہ کتاب چھپ جاتی تو علی ذوالر میں شامل ہوئی۔

خواجہ صاحب کا اثر مسلمان و الیاء ریاست پر بہت تھا۔ نظام دکن انہیں دو مہینے سو روپیہ ماہوار وظیفہ دیتے تھے۔ حیدر آباد کے تمام اُمراء انہیں بہت مانتے تھے۔ مہاراجہ کرشن پرشاد تو ان کے مُردی ہی تھے اور ایسے مُرد کہ اپنے بڑے لڑکے کا ہم انہوں نے خواجہ پرشاد رکھا تھا۔ خواجہ صاحب کی اس کامیابی نے ان کے بہت سے حاسد پیدا کر دیے تھے۔ انہیں طرح طرح سے بدنام کرنے کی کوششیں کی جاتی تھیں۔ خواجہ صاحب کو کسپہن تک بنایا گیا۔ مگر خواجہ صاحب کی کرامات دیکھنے کر ان کے اقتدار میں ذرہ برابر فرق نہ آیا۔ رامپور مانگر دل مانا وود جادوہ سارے نواب انہیں سر آکھوں پر جگہ دیتے تھے۔ افتخار علی خاں نواب جادوہ خواجہ صاحب کی بڑی عزت و تکریم کرتے تھے۔ بخشہ قوال جادوہ دربار کا خاص قوال تھا وہ گانا بھی اچھا تھا اور کچھ اس اداسے بتاتا بھی تھا کہ دیکھنے والے پھر تک جلتے تھے۔ اس کی اسی ادائیگی پر نواب جادوہ بھی لوٹ تھے۔ نواب جادوہ اور خواجہ صاحب بیٹھے تھے اور بخشہ گا رہا تھا۔ اسنے ایک شعر گایا اور نواب نے ایک توڑا روپیوں کا دے دیا۔ دوسرا شعر گایا اور دوسرا توڑا دے دیا۔ اس طرح کئی توڑے دے دیئے تو خواجہ صاحب اُٹھے اور بخشہ کو خاموشی کا اشارہ کر کے نواب سے بولے "یہ بخشہ ہے تو آپ بھی دل شاہ میں؟" نواب صاحب نے خواجہ صاحب کو سینے سے لگا لیا۔ اس دن سے نواب کا نام ہی دل شاہ مشہور ہو گیا۔ یہاں تک کہ ان کی رعایا بھی انہیں دل شاہ ہی کہنے لگی۔

خواجہ صاحب بڑے زندہ دل اور شگفتہ مزاج آدمی تھے۔ حاضر جواب بھی ایسے ہی تھے۔ مگر پر ان کے قریب ٹیلیفون رکھا رہتا تھا۔ دن بھر میں سینکڑوں ٹیلی فون آتے تھے۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ گھنٹی بجی۔ خواجہ صاحب نے ٹیلی فون اُٹھایا اور بغیر جواب دیئے بند کر دیا۔ پھر خود ہی کہتے کوئی گالیاں دے رہا تھا۔ ایک صاحب نے ٹیلی فون پر پوچھا "خواجہ صاحب آپ روز ناچہ تو لکھتے ہیں شب نامچہ کیوں نہیں لکھتے؟" گھنٹی سُن کر خواجہ صاحب نے ٹیلیفون اُٹھایا کوئی صاحب بی کی بولی بولے "میاؤں؟" خواجہ صاحب نے بے کی طرح "می... آؤں" کہا

اور اسے گھبرا کر ٹپٹی فون بند کر دیا۔

خواجہ صاحب ذرا سی بات میں ناراض ہو جاتے تھے اور ذرا سی بات میں خوش بھی ہو جاتے تھے۔ قائد اعظم سے اجملات ہوا تو غرضہ داد تک اُن کے خلات لگتے رہے۔ پھر اُن کے ہم خیال ہونے تو اس شدت کے ساتھ کہ قرآن کی رو سے مولانا آزاد کے قتل کا فتویٰ تک دے دیا۔ اس کے بعد پھر مولانا آزاد کے بھی دوست ہو گئے۔ علامہ اقبال سے خواجہ صاحب کے ذاتی تعلقات بہت خوشگوار تھے۔ دہانے خواجہ صاحب کو کس بات سے رنجش ہو گئی کہ اقبال کو شاعر مشرق سے گھٹا کر انہوں نے شاعر پنجاب لکھنا شروع کر دیا۔ علامہ اقبال نے سوچا کہ یہ تو بہت بُرا ہوا۔ چنانچہ انہوں نے خواجہ صاحب کو نوک دینے کی ایک ترکیب سوچی۔ خواجہ صاحب کو ایک خط لکھا کہ میرے گھٹنے میں تکتے سے درد تھا۔ میں نے آپ کا فاسفورس کا تیل ملا۔ اس سے درد کو افاقہ ہو گیا۔ اُس دن سے علامہ اقبال پھر شاعر مشرق ہو گئے۔ منادی میں فاسفورس کے تیل کا جو اشتہار چھپتا تھا اُس میں شاعر مشرق سر محمد اقبال کی رائے ضرور شائع ہوتی تھی۔

اگست ۱۹۴۷ء میں جب دہلی میں مسلمانوں کا قتل عام شروع ہوا تو خواجہ صاحب جی نظام الدین جی میں تھے۔ وہ بار بار دہلی کے افسروں کے پاس جلتے مگر کوئی مفید نتیجہ برآمد نہ ہوتا۔ آخر تنگ آ کر پٹیل کے پاس پہنچے۔ اُس نے پہلے تو انتظار کرایا۔ اور پھر ملا تو بڑی بے دینی سے ملا۔ پٹیل کی لڑکی خواجہ صاحب کی بڑی عزت کرتی تھی، وہ بھی دہاں آ گئی تو پٹیل کچھ سیجا بظاہر خواہ نتیجہ تو پھر بھی نہ نکلا۔ اتنا ضرور ہوا کہ سبستی نظام الدین کی حفاظت کا کچھ انتظام ہو گیا مگر خواجہ صاحب دل برداشتہ ہو کر اپنے گھر والوں کو لے کر موہائی جہاز سے حیدر آباد دکن چلے گئے۔ یہاں اُن کے گھر بار پر تائے پڑ گئے اور پہرے بیٹھ گئے۔ جب پوری طرح امن وامان ہو گیا تو خواجہ صاحب دہلی واپس آئے۔ حکومت سے اپنا گھر واکراشت کرایا۔ خدا جلنے کیا ملا اور کیا نہیں ملا۔ کاروبار اُن کے سب بگڑ گئے۔ دہلی کیا ہندوستان ہی میں مسلمان ہوائے ہم

رہ گئے۔ اسلامی ریاستیں خستہ ہو گئیں۔ دوست کم اور دشمن زیادہ ہو گئے۔ واحدی صاحب تک کراچی چلے آئے لیکن خواجہ صاحب بڑی ہمت کے آدمی تھے، ہر قسم کی مصیبت جھیلے رہے مگر بائیں خواجہ کی چوکھٹ اور سلطان جی کا آستانہ نہیں چھوڑا۔ اکبر الہ آبادی بہت پہلے کہہ گئے تھے۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے بلی نہ چھوٹ سکی
خواجہ حسن نظامی سے دہلی نہ چھوٹ سکی

آنکھوں سے معذور ہو گئے تھے۔ صحت نے جواب دے دیا تھا۔ پریشانیوں کا جہنم تھا مگر پہلو میں دل اسی طرح زندہ تھا۔ دل میں اُسی طرح انگ اور تنگ مٹی پرانی چپیش نے دھڑ توڑ دیا تھا۔ مگر خوش رفتاری میں فرق نہ آیا تھا۔ آخری وقت تک چپکتے رہے یہاں تک کہ طائر روح تنفس عنفری سے پرواز کر گیا۔

بشیر الدین احمد دہلوی

کسی دانشور کا قول ہے کہ شخص اپنی پشت پر تاریخ کا ایک پُستارہ لادے پھر رہا ہے۔ ان بے لکھی انگنت تاریخوں میں کیسے کیسے عجیب و غریب واقعات ہوں گے؟ اللہ ہی جانتے۔ اور جب کیفیت یہ ہو کہ

ایک ذرے کا لکڑی کا ٹکڑا ہو جائے

آدمی کثرتِ اوار سے حیراں ہو جائے

تو پھر

کس نکشود و کشاید بہ حرکت میں معتمد رہا

بہ این ادعائے عقل و دانش ہمارے علم کی بجلا کیا بساط ہے؟ اسے سمندر کا ایک قطرہ تصور کرنا بھی مبالغہ ہی ہو گا۔ خصوصاً جبکہ

ہستی اپنی حیا کی سی ہے + یہ ہائش سراب کی سی ہے

ابھی تو اپنے وجود ہی کے بارے میں ہمیں یقین نہیں ہے، اور عالمِ شہود کی ہم طرح طرح سے تاویلیں کر رہے ہیں

بے غیب حیرے جو سمجھتے ہیں بسمِ شہود

ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

خیز یہ تو ابداً لطیفیائی بجائیں میں جن میں پڑنے کا یہ موقع نہیں۔ مجھے یہاں بہت

اختصاص کے ساتھ یہ بتانا ہے کہ مولوی بشیر الدین دہلوی مرحوم کون تھے اور کیا تھے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام ان کے بیٹے حضرت یوسف علیہ السلام کے حسن القصد کا خلاصہ یوں کیا گیا ہے کہ غزوے بود، پیرے داشت، گم شاد، بازیافت۔ یعنی ایک صاحب تھے، ان کا ایک بیٹا تھا، وہ کھو گیا، پھر مل گیا۔ مولوی بشیر الدین احمد دہلوی کے تھے کہ مختصر کرنے پر اگر میں آؤں تو یہ کہہ کر ختم کر سکتا ہوں کہ ”میرے والد تھے، مگر اتنا اجمال بھی کس کام کا کہ بات کچھ پتے ہی نہ پڑے؟ اس لئے مجھے کچھ تفصیل سے کہنا ہی پڑے گا۔ نطف تو جب تھا کہ آپ مرحوم ہی سے ان کی سرگزشت حیات سنئے، مگر افسوس کہ مرنے والے کہانیاں نہیں سناتے۔ اس لئے یہ سعادت پس ماندگان کے حصے میں آتی ہے، خصوصاً اولاد کے حصے میں۔ لہذا یہ مصداقِ عمر اگر پند نہ تو اندر پیر تمام کند — عمر من کرتا ہوں ہنسے۔“

اللہ بخشے میرے والد مرحوم ڈپٹی منڈیر احمد دہلوی کے اکلوتے بیٹے تھے۔ وہی ڈپٹی منڈیر احمد جنہوں نے مرآۃ العروس، توبۃ النصوح اور ابن الوقت لکھی اور کلامِ مجید کا ترجمہ دلی کی محکمی زبان میں کیا۔ دادا آبا ہوش سنبھلتے ہی بچپن سے دلی بزمِ تعلیم آگئے تھے۔ اس زمانے میں یونیورسٹیاں، کالج اور اسکول نہیں تھے۔ امیروں کے بچوں کو پڑھانے میاں جی گھروں پر آتے تھے، اوسط طبقے کے بچے اپنے بچوں کو کسی نامی گزنی عالم کے مکتب یا مدرسے میں بٹھاتے تھے، اور غریب غریباں کے بچے مسجدوں میں ٹھاؤں کے حوالے کئے جاتے تھے۔ غریب کا بچہ نفاذیر احمد سنبھالی کٹرے کی مسجد میں داخل کر دیا گیا۔ مسجد کا مٹا بڑا عالم و جابر آدمی تھا۔ جب اس کا ناریل چٹھا تو بچوں کی کھال اُدھیر کر رکھ دیتا۔ یہ مسجد طالب علموں کے لئے اقامت خانے کا کام بھی دیتی تھی مگر اقامت خانوں کی آسائشوں سے محروم تھی۔ دن بھر اس میں مار مار کر پڑھایا جاتا، جب کھانے کا وقت ہوتا تو طالب علموں سے کہا جاتا کہ جاؤ محلے میں سے روٹی

بانگ لاؤ۔ محلے کے گھروں سے روٹی بندھی ہوئی تھی بچے گھروں میں جاتے اور اپنی اپنی قسمت کا آؤ قرعے آتے۔ نذیر احمد کو جس گھر سے روٹی ملتی تھی وہ ایک حید عالم مولوی عبدالقادر کا گھر تھا۔ مفت روٹی کون کھلاتا ہے؟ نذیر احمد جب روٹی لینے جاتے تو انہیں بازار کا کوڑی بھیر کرایا جاتا۔ سودا سلف لادیا تو مولوی صاحب کی بچی کو بہلانا پڑتا۔ وہ کوٹھار توڑ چکتی تو سالہ پینا پڑتا۔ کبھی یہ بھی ہوتا کہ سالہ موٹا رہ جاتا تو لڑکی بچا چھین کر ان کے ہاتھ کھل دیتی اور یہ سی کر کے رہ جاتے۔ روزی رزق کا معاملہ کچھ کبھی نہیں سکتے تھے۔ مسجد میں طالب علموں کے لئے دو کمرے تھے اور نہ بستر۔ بوٹی مچھنیوں اور انگن میں پڑتے۔ کمر کڑاتے جاڑوں میں نذیر احمد ایک ٹاٹ کی صفت میں لپٹ جاتے۔ صبح جب ملاجی اذان دینے اٹھتے تو ایک لات رسید کرتے اور نذیر احمد لڑھکتے چلے جاتے اور صفت بھی کھل کر بچھ جاتی۔ علم کے شوق میں انہوں نے یہ ساری مصیبتیں جھیلیں۔ کڑے تیل کے چراغ کی روشنی میں رات رات بھر پڑھا۔ جب چراغ میں تیل بھی میسر نہ ہوتا تو سڑک کے کنارے کسی لائین کے نیچے کھڑے ہو کر پڑھتے۔ مسجد میں نصاب پورا کرنے کے بعد حسن اتفاق سے دلی کالج میں داخلہ مل گیا۔ یہاں محمد حسین آزاد اور ملٹی ڈاکا اللہ کا ساتھ ملا۔ آگے چل کر یہ تینوں ہم جماعت شمس العلماء بنے۔ جب تک جیتے رہے ان تینوں بزرگوں میں محبت اور دوستی کا سلسلہ قائم رہا۔

ہاں تو حالات کی ستم ظریفی دیکھنے کو مولوی عبدالقادر صاحب کے اپنی صاحبزادی کے لئے رشتے کی تلاش ہوئی تو ان کی نظر انتخاب نذیر احمد پر پڑی۔ اگلے وقتوں میں مٹی ہوئی دیکھی جاتی تھی۔ نذیر احمد کی ناداری ہی میں انہوں نے اپنی لڑکی کو بیاہ دیا۔ والد آدی تھے، شاید یہ سوچا ہو کہ لڑکا ذہین اور محنتی ہے، گھر داماد رکھ لیں گے مگر غیرت دار نذیر احمد نے اسے گوارا نہیں کیا کہ سسرال کے ٹکڑوں پر چڑ جائیں۔ دلی والوں کی

ایک مثل ہے۔ "ساس گھر جنوائی گئی بہن گھر بھائی گئی"۔ بعد از نذیر احمد نے جو دلی کی زبان کے دیور نے تھے اس مثل کو کیسے بڑھایا ہوگا۔ علیحدہ ایک کوٹھری کرایہ پر لیکر رہے اور اپنی کمائی کی روکھی سوکھی پر قناعت کرتے رہے۔ میں نے اپنے خاندان کی بڑی بوڑھیوں سے سنا ہے کہ اُس وقت ان کے گھر میں صرف ایک ٹوٹی ہوئی جوتی تھی جسے کبھی دادا ابا ملگا لیتے اور کبھی دادی اماں۔ مجھے تعجب دادی اماں پر ہوتا ہے کہ وہ ایک رئیس آدمی کی لاڈوں پٹی بیٹی تھیں، انہوں نے اس مفلسی اور تنگدستی کو خندہ پیشانی سے کیسے انگیز لیا؟ کوئی اور سوال کی ہوتی تو کبھی کی دھتتا بتا چکی ہوتی۔ مگر نہیں، شریفیوں کا یہی دستور تھا کہ ماں باپ نے جس کے ہاتھ میں ہاتھ پکڑ دیا اسی کو اپنا مجازی خدایا مان لیا۔ منہ بھرنا ان کا اصول تھا جس گھر میں لڑکی کا ڈولا آتا تھا اُس گھر سے پھر اُس کی کھاٹ ہی لگتی تھی۔

دلی کالج سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد نذیر احمد کچھ دنوں تک بیکار رہے۔ انہیں بڑا ناؤ آیا۔ ایک دن پرنسپل سے جا کر بھڑ گئے۔ پرنسپل نے پوچھا۔ "آج کل کیا کر رہے ہو؟" بڑے جھک مار رہا ہوں۔ اُپلوں کی ٹال کرنے کا ارادہ ہے۔ اس پر دلی کالج کی سند لگاؤں گا تاکہ سب کو معلوم ہو جائے دلی کالج میں تعلیم پانے کا کیا حشر ہوتا ہے۔ قصہ کوتاہ انہیں پہلے مدد سی اور اس کے بعد اسکول انسپکٹری مل گئی۔ یہی زمانہ تھا کہ ان کے ماں اولاد ہوئی شروع ہوئی، اور خد کے فضل سے ایسی بھاگو ان اولاد ہوئی کہ دن دن دلی رات چوکی ترقی کرتے چلے گئے۔ ڈپٹی کلکٹر بنے اور ڈپٹی صاحب کہلائے۔ ڈپٹی ان کے نام کا جزو ہی ہو گیا اور یہ سابقہ ان کے ساتھ ایسا چٹا کہ حیدر آباد دکن میں رکن صدارت عظمیٰ ہو جانے کے باوجود ڈپٹی "ہی کہلا" نذیر احمد کو کوئی جانتا ہو یا نہ جانتا ہو ڈپٹی صاحب کو سب جانتے تھے۔ ڈپٹی صاحب کی کتا میں، ڈپٹی صاحب کا اصغری اکبری کا قصہ، ڈپٹی صاحب کا ترجمہ قرآن۔

حد یہ کہ تعظیم مہربانک ہم لوگ "ڈپٹی صاحب دلی" کہلاتے رہے۔

میرے والد بہنگ مرشد علیہ السلام جسے عرب عام میں "عندہ" کہا جاتا ہے، کے تین چار سال بعد پیدا ہوئے۔ اُس وقت عسرت ڈپٹی صاحب کے گھر سے رخصت ہو چکی تھی اور روز افزوں فارغ البالی کا دور شروع ہو گیا تھا۔ اس لحاظ سے میرے والد خوش قسمت تھے کہ میرے جد امجد کی طرح انہیں مغلیں میں آنکھیں کھولنی نہیں پڑیں بلکہ انگریزی محاورے کے مطابق "منہ میں چاندی کا چھچھے لے کر پیدا ہوئے تھے"۔ یوں تو ڈپٹی صاحب کے ہاں کئی بچے ہوئے مگر جیسے صرف تین ہی، دو لڑکیاں اور ایک لڑکا۔

ابتداء میں ان کی تعلیم کا انتظام دادا آبا نے خود کیا تھا۔ قرآن شریف دادی اماں نے اپنے سب بچوں کو خود پڑھایا تھا۔ عربی، فارسی اور اردو دادا آبا پڑھاتے تھے۔ اردو میں اُس وقت بچوں کے لئے کتابیں ہی نہیں تھیں۔ دادا آبا نے یہ کیا کہ ایک کتاب لڑکیوں کے لئے اور ایک لڑکے کے لئے لکھ دی۔ اُس وقت دادا آبا سرشتہ تعلیمات میں تھے۔ اتفاق سے اُس وقت کا انگریز ڈائریکٹر صوبے کا دور کرتے کرتے دادا آبا سے ملنے گھر پر چلا آیا۔ اتفاق سے خود سال میاں بشیر بھی کھیلتے کھیلتے ادھر آئے۔ صاحب نے محبت سے بلایا اور پوچھا "کیوں میاں کیا پڑھتے ہو؟ میاں بشیر نے کہا "اپنی کتاب پڑھتا ہوں۔ لاکر دکھاؤں؟" صاحب نے کہا "ہاں لاؤ۔" میاں بشیر دوڑ کر گئے اور گھر میں سے اپنی کتاب لے آئے۔ صاحب نے کتاب کو کہیں کہیں سے دیکھا۔ کتاب کہاں تھی، کتاب کا مسودہ تھا۔ بولے "مولوی صاحب، یہ تو بہت اچھی کتاب ہے۔ آپ اسے چھپوا دیجئے۔" میاں بشیر نے کہا "آپا کی کتاب بھی لاکر دکھاؤں؟" صاحب نے کہا "غور دکھاؤ۔" میاں بشیر لپک کر بڑی آپا کی کتاب بھی لے آئے۔

صاحب نے اسے بھی حبہ حبہ دیکھا اور حیران ہو کر بولے "مولوی صاحب، آپ نے ایسی اچھی کتابیں لکھ کر گھر میں رکھ چھوڑی ہیں، انہیں فوراً چھپوا دیجئے تاکہ سب بچے

ان سے فائدہ اٹھائیں۔ چنانچہ یہ کتابیں دادا آبا نے چھپوا دیں۔ ایک مرآۃ العروس تھی اور دوسری مجھے ٹھیک یاد نہیں کہ چند ہندوستانی منتخب الحکایات۔ ان دونوں کتابوں پر صاحب نے سفارش کر کے سرکار سے انعام دلوا دیا۔ اس سے دادا آبا کو احساس ہوا کہ اچھی کتابیں لکھنے کی ان میں صلاحیت ہے۔ چنانچہ بچپن کے لئے مرآۃ العروس کا دوسرا حصہ بنات انش لکھا اور لڑکوں کے لئے فارسی کی آسان گرامر "صرف مغیر" اور عربی کی گرامر "بانیکی فی الصرف" لکھی۔ جب ڈپٹی صاحب کی یہ کتابیں شہرت کے پردہ گراڑیں اور گھر گھر پھیل گئیں تو "بل من مزید" کی آوازیں چاروں طرف سے آنے لگیں۔ سرسید احمد خاں کی رفاقت کے بدولت ڈپٹی صاحب کو مسلم قوم اور مسلم معاشرے کی بہتر حالت کی طرف توجہ ہوئی اور خشک ہندو وعظ کی بجائے انگریزی کی تقلید میں اصلاحی ناولوں کا سلسلہ شروع کیا۔ تو بہ انصوح، ابن الوقت، فناء مبتلا اور آیائی اکی دور کی یادگار ہیں۔

جب دادا آبا سلسلہ ملازمت دلی سے باہر رہنے گئے تو میاں بشیر کو دلی کالج میں داخل کر دیا، اور گھر پر پڑھانے کے لئے بھی ایک استاد مقرر کر دیا۔ دادا آبا نے میاں بشیر کی طالب علمی میں جو خطوط انہیں لکھے پر فیہر شبانہ مرحوم نے ان خطوں کو "موعظۂ حسہ" کے نام سے کچھ عرصے بعد شائع کر دیا۔ یہ خطوط نامہ و پیام کی حد سے نکل کر نصیحت فرجام کے دائرے میں آجاتے ہیں۔ ڈپٹی صاحب نے بڑی محبت اور بڑی دوسری سے بیٹے کو بار بار دل رگا کر پڑھنے کی تاکید کی ہے۔ خود بھی کئی طویل خطوں میں انگریزی اور عربی کے دوس دیتے ہیں۔ بعض خطوں میں ناراض ہو کر میاں بشیر کو شفقت سے ڈانٹا بھی ہے۔ کہیں محبت پوری سے اُن کا دل پیچ جاتا ہے اور بیٹے سے کہتے ہیں کہ "تعلیم کے لئے جتنا روپیہ چاہو مجھ سے لو۔ اگر تمہیں کالج پیدل جانے میں زحمت ہوتی ہو تو گلی رکھ لو، مگر پڑھنے سے غافل مت ہو۔" میاں بشیر کند ذہن نہیں تھے، محنت

سے بھی جی نہیں چراتے تھے مگر رئیس زادے تھے اور باپ کی طرح اُن پر پیغمبری وقت نہیں پڑا تھا۔ ادب کے علاوہ ان کا جی کسی اور مضمون میں نہیں لگتا تھا۔ تاہم باپ کے ثبوت سے پڑھا اور دلی کالج سے فراغت حاصل کر لی۔ دادا ابا کا کہنا یہ تھا، اور ابا کا بھی کہ "اولاد کو کھلاؤ سونے کا ڈال مگر دیکھو شیر کی نگاہ۔" دادا ابا نے مارنا تو کیسا کبھی میاں بشیر کو پھوہوں کی چھڑی تک نہیں چھوئی مگر اُن کا رعب اس قدر غالب تھا کہ میاں تیاھے ہر جانے کے باوجود ابا اُن سے نظریں اُوچی کر کے بات نہ کرتے تھے۔ یہی حال ہمارا بھی رہا کہ ہم نے اپنے باپ سے کبھی اونچی آواز میں بات نہیں کی، اور نہ کبھی بے ضرورت اُن کی خدمت میں حاضر ہونے کی جرأت کی۔

میرے والد نے سولہ سترہ برس کی عمر ہی میں حیدر آباد دکن میں ملازمت کر لی تھی۔ ملازمت کا آغاز سوم تعلقہ داری سے ہوا اور اپنی اعلیٰ کارکردگی کے باعث اول تعلقہ داری تک ترقی کی۔ صوبے داری انہیں ملنے والی تھی کہ ملکی اور غیر ملکی سازشوں سے متاثر ہو کر قبل از وقت منشن لے کر دلی چلے آئے۔ دلی میں اُن کے لئے بہت سے ضروری کام رکے ہوئے تھے۔ دادا ابا کے انتقال کو پانچ چھ سال ہو چکے تھے۔ مرحوم کو تجارت میں روپیہ لگانے کا شوق تھا۔ خود اُن کی زندگی میں یا لوگ لاکھوں روپیہ کھا چکے تھے تو بھلا اُن کے مرنے کے بعد کیا خاک وصول ہوتا۔ جائداد کا کرایہ کئی ہزار روپے مینے کا تھا۔ وہ سب غمزدہ ہو رہا تھا۔ دادا ابا کی سب کتابیں ۱۰ اور ترجمہ قرآن نایاب ہو چکا تھا۔ غمزدہ دادا ابا کی آنکھ بند ہوتے ہی گھر میں لٹسنے لگی تھی "اوجھ ابا دلی پہنچے تو انہیں گھر سنی کے دل کی طرح صاف بلاؤ خود ابا کو لکھنے پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ چنانچہ آغاز جوانی ہی میں انہوں نے "حسن معاشرت" جیسا اصلاحی ناول لکھ ڈالا تھا جسے دادا ابا بھی دیکھ کر خوش ہوئے تھے اور علامہ اشرف الہی نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ اگر میں یہ نہ بتایا جاتا کہ یہ کتاب مولوی بشیر الدین احمد

تخلیف گو ہے تو ہم بلا تکلف کہہ دیتے کہ "حسن معاشرت" مولوی نذیر احمد کی کتاب ہے بچپن کے لئے۔ "حسن معاشرت" کے بعد ابا نے دو ناول اور لکھے تھے، "اقبال دلہن" اور "اصلاح معیشت"۔ ملازمت ہی کے زمانے میں سات آٹھ سو صفحے کی کتاب "تاریخ بھارت" لکھی اور اس کے بعد دو ضخیم جلدوں میں "تاریخ بھارت" لکھی۔ ان کتابوں پر نظام گورنمنٹ نے گرانٹ در انعام دیا تھا۔ امریکہ کے ڈاکٹر اسٹال نے کوئی پچاس سال اوپر ایک سلسلہ کتابوں کا لکھا تھا WHAT A BOY OUGHT TO KNOW اور WHAT A GIRL OUGHT TO KNOW وغیرہ وغیرہ۔ اسی کی طرز پر ابا نے "حریر طفلان"، "نشاط عمر"، "عصائے پیری" اور بچپن سے دو دو باتیں لکھیں۔ ڈاکٹر اسٹال نے اپنی کتابوں میں جگہ جگہ بائبل کے حوالے دیئے تھے ابا نے ان کتابوں میں قرآن کی آیتیں حسب موقع دیں۔ ان کی یہ سب تصانیف زمانہ قیام حیدر آباد کی ہیں۔

دلی آنے کے بعد ابا نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ دادا ابا کی سب کتابیں غامض بہام سے چھاپیں۔ بڑا قرآن شریف اور کامل اگر وہ میں صوفی قادر علی خاں کے پرس سے چھپوا کر منگائی۔ دادا ابا کی کتابوں کے بعد اپنی سب کتابیں چھپوائیں۔ اسی دوران میں ہلی صاحب "چیت کشتر" دہلی کی فرمائش پر تاریخ دہلی لکھنی شروع کی۔ سرسید کی آثار الصنادید میں جتنی پرانی عمارتوں اور کھنڈروں کا ذکر ہے۔ ایک ایک کو خود جا کر دیکھا۔ کتنی ہی عمارتیں دست برد زمانہ سے معدوم ہو چکی تھیں۔ دلی میں کتنے ہی قبرستان آباد ہو گئے تھے، ان کے کتبوں سے مرنے والوں کا نام نشان معلوم کیا۔ سرسید نے اپنے زمانے کے بعض اکابر دہلی کا تذکرہ آثار الصنادید میں کیا ہے آثار الصنادید میں مشائخ ہوئی تھی۔ تاریخ دہلی اس کے کوئی ستر سال بعد شائع ہوئی۔ مصنف نے اس میں اپنے زمانے کے بزرگوں اور اہل کمال کا تذکرہ کیا ہے پرانی دہلی

کے تمام گلی کوچوں اور محلوں کے علاوہ نئی دلی کا پورا حال بھی اپنی تاریخ میں درج کیلئے
تین موٹی موٹی جلدوں میں یہ کتاب مشائع ہوئی اور اس پر حکومت سے انعام ملا۔
ایک دن بیٹھے بیٹھے خیال آیا کہ اردو میں کوئی مجموعہ شائستہ لطیفوں کا نہیں ہے۔ اس
خیال کا آنا تھا کہ سال بھر کے اندر چھ کتابیں تیار کر کے چھاپ دیں۔ تین حصے
"حکایات لطیفہ" کے ہیں اور تین حصے "لطائف عجیبہ" کے۔

میرے والد بزرگوار نے سختی آدی تھی مگر میوں میں صبح چھ بجے ناشتہ کر کے لکھنے پڑھنے
کے کام پر جرم جاتے۔ میز کرسی نہیں فرسٹ پر بیٹھتے تھے۔ صدر دالان میں چاندنی کا فرش،
پچھے گاؤ نکلیہ، آگے لمبی سی ٹی میز۔ میز پر کاغذوں کے انبار۔ دونوں پہلوؤں میں کتابوں
کے ڈھیر۔ بائیں طرف بڑے سے تھال میں اودھیا سا حقہ حبس کی مشک ان کی گود میں
پڑی رہتی۔ ایک لڑکا صرف حقہ پر فوکر تھا۔ اس کا یہ کام تھا کہ صبح سے رات گئے
تک حقہ تانے کرتا رہے اور چلیں بھرتا رہے۔ میوں قسم کے حقہ گھر میں تھے،
لکھنؤ کے ہر دم تازہ اور گڑا گڑی سے لے کر نصف قدر آدم تک کے حقہ۔ ایک حقہ
چاندی کا بھی تھا جو شادی بیاہوں کے موقع پر لگا لاجاتا تھا۔ حقہ کیا تھا یہ معلوم ہوتا
تھا کہ دو لہا سہرا بدھی پہنے کھڑا ہے۔ خمیر اور مٹکا کو لکھنؤ سے آتا تھا اور اس کی خوشبو
سے سارا گھر مہک جاتا تھا۔ گرمیوں میں دالان کے دروں چرخس کی ٹٹیاں لگ جاتیں۔
ہر گھنٹے دو گھنٹے بعد انہیں ترک کیا جاتا۔ سستی پنکھا فرٹے بھرتا۔ اس پر سکون اور ٹھنڈی
نغمائیں آبا اپنے کام میں لکھو جاتے۔ حقہ بھی خسی ہی کے استعمال کئے جاتے۔ لڑکا انہیں
تازہ کرتا رہتا اور چلیں بدلتا رہتا۔ آبا کو اپنے کام میں اس قدر اہمک ہوتا کہ انہیں
دین دنیا کی کچھ خبر نہ رہتی۔ بارہ ساڑھے بارہ بجے بی مغلانی ہلکے سے کھانٹ کھانٹ کر
دالان میں داخل ہوتیں اور کہتیں "سسر کار کھانا تیار ہے"۔ آبا چونک کر ہاتھ سے قلم رکھ
دیتے۔ آگے دالان میں فرسٹ پر دسترخوان کچھ جاتا۔ اتنے کھانا چٹا جاتا اور ہم سب

قرینے سے ہر بیٹھے۔ ایک لڑکا آفتاب اور سلجی لے کر بیچ جاتا اور آبا ہاتھ دھو، کلی کر
دسترخوان پر آ جاتے۔ ہم سب اپنے باپ سے بہت ڈرتے تھے، اس لئے خاموش
رہتے۔ کھانے کے دوران میں آبا کو بھی اس خاموشی کا احساس ہوتا اور وہ مزے
مزے کی باتیں چھڑ دیتے۔ مثلاً ہائے ہاں چند دسترخوان ایسے تھے جن کے حاشیے پر
نیلے اور لال شیر چھپے ہوئے تھے، منہ بچھا ہوا، دم اٹھی ہوئی، جیسے ابھی حملہ کر دیں گے۔
ہم چونکہ بہت دنوں سے انہیں دیکھتے چلے آ رہے تھے کبھی ہم نے اس پر غور نہیں کیا
کہ ان شیروں میں کیا مصلحت ہے۔ ایک دن حب ان میں سے ایک دسترخوان
بچھا تو آبا نے پوچھا کہ "تباؤ اس پریش کیوں چھپے ہوئے میں؟ ہم کیا جاتے؟
بڑے معلوم نہیں۔ آبا نے کہا۔ حیدر آباد میں ایک چھپی کو یہ دسترخوان دیئے تھے
کہ ان پر خمر چھاپا لکھو وہ کم بخت پریش چھاپ لایا۔ جب اُس سے کہا کہ یہ کیا کیا
تو بولا۔ سرکاری تو بڑے تھے کہ اس پر شیراں چھاپ کو لاؤ۔ اس انکشاف پر ہم سب
سنبتے اور آبا بھی ہائے ساتھ سنبتے لگے۔ ایسی خوش مزاجی کی باتیں آبا اکثر کرتے تھے
مگر نہ جانے کیوں ہم بچوں کا تو ان سے دم ہی نکلتا رہا۔

آبا بڑے خوش مذاق آدمی تھے۔ کھائے من بھانا، پہنے جگ بھانا۔ اچھے سے
چھا بادرجی ملازم رکھتے۔ اور عمدہ سے عمدہ کھانے پکواتے۔ لباس کے بھی بہت شوقین
تھے۔ دلی اور ولایتی سبھی قسم کے کپڑے تھے اور اتنے زیادہ کہ ان کے پہننے کی باری
بھی نہیں آتی تھی۔ ایک زمانے میں انگر کھامی پہنا کرتے تھے۔ ورزشی جسم تھا اس لئے
ان پر پھنٹا بھی خوب تھا۔ خدا جھوٹ دلوئے تو سینکڑوں ہی جوڑے جتے اور جوتوں
کے ان کے پاس تھے۔ لونگ بولس سے لے کر سلیم شاہی تک کوئی قسم جوتی کی نہیں
بچی تھی۔ یہی حال ٹوپوں کا تھا کہ سولا ہیٹ سے دوپٹی تک سبھی موجود۔ چھڑیوں کے
کئی گٹھے تھے جن میں سونے بھی تھے اور تمپیاں بھی۔ سواری کے لئے گھوڑے مہذبہ انکے

پاس رہے۔ دلی گئے کے بعد بھی دو گھنٹیاں گھر پر رہیں۔ موٹر انہوں نے کبھی نہیں رکھی۔ کتابیں ان کے پاس کئی ہزار تھیں۔ دو کمروں میں یہ کتابیں بھری ہوئی تھیں پیشین لینے کے بعد ان کا اڑھنا بچھانا ہی کتابیں ہو گئی تھیں۔ ظہر کی نماز پڑھ کر آرام کرتے اور عصر کے بعد پھر لکھنے بیچے جاتے تو عشاء کے وقت اُٹھتے۔ رات کے کھانے کے بعد لیٹ کر مطالعہ کرتے۔ گیارہ سے پہلے نہیں سوتے تھے اور صبح اذانوں کے وقت اُٹھتے۔ اور اپنے کمرے ہی میں ورزش کر لیتے تھے، خصوصاً سینیٹور کے ڈمبل سامنے سال کی عمر میں چالیس سال کے معلوم ہوتے تھے۔

حیدر آباد میں جب میری والدہ کا انتقال ہوا تو میری عمر چھ برس کی تھی اور بڑے بھائی نو برس کے تھے۔ سب سے چھوٹی بہن چند روز کی تھی، اسی کے چاہے میں اماں کا انتقال ہوا تھا۔ آبا نے ہم چار بھائیوں اور دو بہنوں کو اس اہتمام سے پالا کہ ہمیں اپنی ماں کی کمی شاید کبھی محسوس ہوئی ہو۔ ذکر چاکر اور خادماؤں کے علاوہ ہم پر پورے پین گنڈے نہیں رکھیں، غریب اور یتیموں کو بھی اعلیٰ درجے کے اُن کو نوٹ سکوروں میں پرھوایا جن میں دسی کچوں کا داخلہ نہیں ہوتا تھا۔ مگر آبا حاکم منفع تھے اس لئے اُن کی بات کیے ملتے، پھر جب ہم ذرا بڑے ہو گئے تو ہم تین بھائیوں کو علی گڑھ میں خود لے جا کر داخل کیا۔ اور ڈاکٹر عین الدین مرحوم کو ہمارا نگران مقرر کیا۔ بورڈنگ میں بھی ایک ملازم اور ایک پرائیویٹ ٹیوٹر ہمارے لئے رکھا۔ ڈھائی تین سال کے بعد جب تحریکِ ترکِ موالات چلی تو ہمیں دلی بلا لیا۔ شام کو ہم سب کو دو گھنٹے انگریزانا اور فارسی خود پڑھاتے اور حساب اور دوسرے مضامین پڑھانے کے لئے ٹیوٹر مقرر کرتے۔ آبا نے ہماری تعلیم و تربیت کے لئے کبھی روپے کا منہ نہیں کیا۔ دل کھول کر خرچ کرتے۔ پیسے کی کمی بھی نہیں تھی۔ علاوہ کئی لاکھ کے اندر مٹے کے تین چار ہزار روپے میں کی یا نت تھی۔ سلیٹ منداؤں تھے، کسی عیب میں نہیں تھے۔ سستا سا، ایک پیسے

کے چار سو روپے آتے تھے۔ دلی کے نام نہاد نوابوں سے زیادہ ٹھانڈے کی زندگی گزارتے۔ سرکار میں بھی بابت بنی ہوئی تھی۔ خطاب اور آنریری مجسٹریٹ کی کئی دندہ پیش کش ہوئی مگر یہ کہہ کر رد کر دی کہ اس سے میرے علمی مشاغل میں فرق آتا ہے۔ خان بہادری سے انہیں نفرت تھی۔ شمس العلماء کا خطاب تجویز ہو رہا تھا کہ پیام اجل آگیا۔

آبا بڑے مذہبی خیال کے آدمی ہیں تھے۔ ان کی ابتدائی تصویر دل سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے ڈاڑھی کبھی نہیں منڈوائی۔ بڑی خوبصورت پھیری ڈاڑھی تھی آبا کی، مگر دو انگشت سے آگے کبھی نہیں بڑھی۔ اتنی ہی ڈاڑھی دادا آبا کی بھی تھی۔ مگر چھدری۔ آبا کا خط بھر وال تھا۔ اُس زمانے میں یہ ایڈورٹیشن کی ڈاڑھی کہلاتی تھی۔ بعد میں جامعہ پنجاب کی ڈاڑھی بھی اسی وضع کی رہی۔ نماز پابندی وقت کے ساتھ تنج وقت پڑھتے تھے۔ رمضان شریف میں ترابیاں (تراویح) بھی پڑھنے جاتے تھے۔ قرآن شریف روانی اور خوش الحانی سے پڑھتے اور ماہِ صیام میں ہر تیسرے دن ایک قرآن ختم کرتے۔ ہم سب کو بھی نماز روزے کی تاکید تھی۔ سحری اور افطار میں سب شریک ہوتے۔ محلے کی مسجد میں افطاری ضرور بچھوائی جاتی۔ میلاد اور وعظ بھی ہوتا تھا، خصوصاً مولوی دُہن کا۔ یہ مولوی دُہن بھی ایک خاص وضع کے آدمی تھے۔ دارشویں کی طرح ایک گیر و چادر لپیٹے رہتے۔ زلفوں کے چھتے دونوں شانوں پر پڑے ہوئے، اُبلارنگ، کُشاہ پشانی، لمبوتر چہرہ، کڑی بڑی ڈاڑھی، لبیں ترشی ہوئی۔ سنہری فریم کی عینک جس میں سے سُرنگی آنکھیں جکتی رہتیں۔ پان کھاتے اور سی لگاتے۔ عطر حنا میں بے رہتے۔ وعظ فحشے دار زبان میں کہتے اور نعت منقبت لبک کر سُناتے۔ جی لگتا تھا ان کے وعظ میں۔ ایک آدمہ مرتبہ مولوی احمد سعید کا وعظ بھی سُنا۔ ان کی تقریر عالماہ ہوتی تھی، اور جب ایک دم سے پٹری بدل کر دلی کی ٹنگالی زبان بولنے پر آتے تو سُننے والوں میں ہنسی پڑ جاتی۔ روزِ محشر کے نقشہ مولوی صاحب پیش کر رہے ہیں کہ سوانیرے پر آفتاب ہو گا، آنکھیں بجائے چہرے کے

سردوں پر لگی ہوں گی۔ گرمی کا یہ حال ہو گا کہ گہنگا رنجنوں رنجنوں، گھنٹوں گھنٹوں، کمر کمر اور گردن گردن تک پسینے میں ڈوبے ہوں گے۔ جو اور زیادہ گہنگا ر ہوں گے وہ پسینے میں غوطے کھا رہے ہوں گے۔ مگر بڑا اللہ کے نیک بندے ہوں گے وہ درختوں کی ٹھنڈی چھاؤں میں بیٹھے چائے لیٹا اڑا رہے ہوں گے۔

ذکوا بھی آبا بڑی پابندی سے لگاتے تھے۔ غریب اور مسکین رشتہ داروں اور کنبہ داروں کے ماہانے مقرر تھے۔ بیواؤں اور یتیموں کا حق ان کے بعد آتا تھا۔ ان کے بعد کاؤ خیر کا نمبر تھا۔ جاڑوں میں لحاظ بنوا کر تعظیم کرتے اور گرمیوں میں ٹٹھے مل کے جوڑے۔ حج کو جانے کا ارادہ ہی کرتے رہے۔ ہم سب کی شادیاں کر چکے تھے، صرف میری سب سے چھوٹی بہن رہ گئی تھی۔ اس کی شادی کے بعد جاتے، مگر اس سے پہلے ہی اللہ کو پیار ہو گئے۔

دادا آبا خالص کٹر مولوی تھے، وہ دین کے آگے دنیا کی پروا نہیں کرتے تھے۔ آبا دین اور دنیا دونوں رکھتے تھے۔ تھیں اور سینا دیکھتے اور ہمیں بھی دکھاتے۔ مہاری شادیوں میں ہرات کے ساتھ مینڈ باجر تو نہیں بجا لیکن دو دو تین تین دن تک مشہور طوائفوں کے ناچ گانے اور بھانڈوں کے ٹھیکے اور لٹاؤں کی نقلیں ہوتی تھیں۔ یہ محفلیں مخصوص ہوتی تھیں اور ان میں صرف ان شرفا کو مدعو کیا جاتا جنہیں اس فن کا ذوق ہوتا۔ ان محفلوں میں بلیں نہیں دی جاتی تھیں اور نہ کوئی اور میہودگی روا رکھی جاتی۔

اس پر ایک ناگوار قصہ یاد آیا۔ بھائے ایک دو پرے کے عزیز جو بڑے کٹر اہل حدیث ہیں یوں تو آبا کے پاس ہمیشہ آتے رہے مگر آبا کے جنازے میں نہیں دکھائی دیئے۔ بعد میں انہوں نے بڑے بھائی سے کہا کہ "بھائی بشیر رنڈی کا ناچ دیکھتے تھے، اس لئے میں ان کے جنازے میں شریک نہیں ہوا۔" بھائی نے کہا "مگر تم تو آپ کے جنازے میں شریک ہوں گے اور آپ کو کندھا بھی دیں گے۔" بہت ناراض ہوئے اور پیر پٹختے

ہوئے چلے گئے۔

آبا ساری عمر بڑے بڑے عہدوں پر رہے اور چونکہ صنعت کے حاکم ہوتے تھے اس لئے ہر قسم کے مقدمات کی سماعت کر کے فیصلے لگتے تھے مگر بڑے رحم دل اور خالص بھولے آدمی تھے۔ پچاسی کا حکم جہاں تک ممکن ہوتا نہیں سناتے تھے۔ حیدر آباد میں پچاسی نہیں دی جاتی تھی بلکہ گردن ماری جاتی تھی۔ یعنی مشکیں کسے اور دو زانو کرنے کے بعد جلا دھتیا سسر اڑا دیتا تھا۔ اس وقت ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو بھی موجود رہنا پڑتا تھا۔ اس نے آبا عموماً عمر قید کی سزا دیا کرتے تھے۔ ان کی اس نرم دلی سے رعایا تو بہت خوش رہتی مگر حکومت کی "بری کتابوں" میں ان کا نام چڑھتا رہتا۔ مگر آبا نے کبھی اس کی پروا نہیں کی۔ اور جب ان کی بہت مخالفت ہو گئی تو نوکری چھوڑ چھا کر دلی چلے آئے۔

دادا آبا اور آبا کی کتابیں لکھنے کے لئے کئی کاتب ہمارے مردانے گھر ہی میں بیٹھ کر کتابت کیا کرتے تھے۔ ان میں ایک خوش نویس عنایت الدین بھی تھا جو خوش خط تو بہت تھا مگر بڑا غیر ذمہ دار۔ اجرت ملتے ہی کئی کئی دن کے لئے غائب ہو جاتا۔ آبا اس کے قابل کو اس کی خوشحالی کی وجہ سے ٹال جاتے۔ مگر حد ہوتی ہے برداشت کی بھی۔ عنایت بہانے بنا کر رستم پیشگی بھی لے جاتا اور کام پر بھی نہ آتا۔ آبا خفا ہوتے تو ٹمٹمسی صورت بنا کر کہیں اپنے باپ کے مرنے کی خبر سنا دیتا اور کہیں اپنی مال کے فوت ہونے کی۔ غرض رفت رفتہ آسنے اپنے تمام بڑوں کو مار ڈالا۔ آبا کو جب عرصہ آتا تو بس پھر اللہ دے اور بندہ بے۔ ایک چرخ ان کی زمین پر اور ایک آسمان پر ہوتی۔ تھ چھٹ بھی تھے۔ دو چار تھپڑوں ہی میں آدمی کا بھر کس نکل جاتا۔ مگر عنایت اپنی چالاکیوں سے بچتا رہا۔ ایک دن غائب ہو کر حاضر ہوا تو اہلے ڈانٹا۔ سوکھا سامنہ بنا کر بولا۔ گھر والی کا جاپا بگڑ گیا ہے۔ اسے ہسپتال لے کر گیا تھا۔ آبا نے کہا۔ اچھا تو جاؤ کام کرو مگر عنایت

مصر جھبکے وہیں کھڑا رہا۔ ابا نے کہا: جلتے کیوں نہیں؟ "بولا: "کچھ پیسے چاہئیں خرچہ کے لئے۔" ابا نے کہا: جاؤ اشتیاق (منجر) سے لے لو۔ وہاں سے خوش خوش آیا اور اشتیاق صاحب دس بیس روپے لے کر پھر غائب ہو گیا۔ جب وہ پیسے اڑا چکا تو پھر آ گیا۔ کاتبوں نے کہا: "ڈپٹی صاحب صبح سے کئی دفعہ تجھے پوچھ چکے ہیں۔ کہہ گئے ہیں کہ اُسے آتے ہی میرے پاس بھیجنا۔ آج تیری خیر نہیں ہے۔ سر سے تو باندھ کر جانو۔" سارے کم کو مار چکا۔ پیشگیاں الگ مارتا ہے۔ آج بٹیا وہ مار پڑے گی کہ بڑی پسلی ایک ہو جائے گی۔ مگر میاں غیاث بنایت اطمینان سے ابا کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ ابا جھبکے ہوئے بیٹھے تھے۔ نظر اٹھا کر دیکھا تو دیکھا کہ غیاث سر اور ڈاڑھی کے بال پریشان کئے میلے چمکٹ کپڑے پہنے کھڑے ہوئے ہیں اور خسار آنسوؤں سے تر ہیں۔ اس سے پہلے کہ ابا کچھ کہیں خود انہوں نے رو کر کہا "مرگئی۔" ابا کا چہرہ اس وقت دیکھنے کے لائق تھا۔ یا تو مارے غصے کے ایک رنگ آ رہا تھا اور ایک جا رہا تھا یا ایک دم سے سُت گیا اور گھبرا کر بولے: "جاؤ جاؤ، اشتیاق سے کچھ لے کر فوراً گھر جاؤ۔" یاد نہیں کون پاس بیٹھا ہوا تھا۔ اُس سے بولے: "اے ہے، بچا سے کی بیوی مر گئی یا غیاث وہاں سے اُنٹے قدموں ٹوٹے اور ڈیوڑھی سے نکلے ہی ٹھٹھے لگانے اشتیاق صاحب کے پاس پہنچے کہ "لایے دوپٹے دو اپنے، ڈپٹی صاحب نے کہہ دیا ہے۔" سبے حیرانی سے اُس کی طرف دیکھا۔ پوچھا: "ابے کیا منتر مارا آج؟ تیری تو آج خبر ہی آنے والی تھی؟" غیاث نے مہنس کر لطیف سنایا جیستی صاحب نے کہا: "ہا کجنت، منحوس، تو نے جو رو کو جیستی جی مار ڈالا۔" بولے: "جی حضور! درہ آج میں مارا جاتا۔"

ابا نے ایک کتاب لکھی شروع کی تھی۔ "تمثال الامثال۔" اس میں محاورے ضرب الامثال اور کہاوتیں جمع کرنی شروع کی تھیں۔ اپنے سب جاننے والوں اور خاندان کی پڑھی لکھی عورتوں میں سادی کا پیاں تقسیم کر دی تھیں کہ جو محاورہ یاد آئے اس

میں لکھ لیں متنی کتاب میں اس سکین خریدیں یا مستعار لیں۔ یہ کام اتنا پیچیدہ کہ پرچیاں اور کاغذ کے پلندے دیکھ کر ہی ہمارا دم لکھتا تھا۔ کوئی مددگار انہوں نے اپنا مقرر نہیں کیا۔ خود ہی سارا کام کرتے۔ تمام شاعروں کے دیوان اور ادیبوں کی کتابیں خود ہی پھلتے رہتے۔ فرنگ آصفیہ اور نور اللغات تو کبھی کی مسودوں میں کھپ چکی تھیں۔ سند کے لئے اشعار بھی پھلانے چاہئے تھے۔ مگر یہ کتاب تو پھیل کر زبان کی انٹیکو پیڈیا بنی جا رہی تھی۔ پہلیاں، کہہ مکرمیاں، دو سٹخن، سر سٹخن، اہل، ڈھکوسلے، اور خدا جانے کیا کیا اس میں شامل کئے جانے لگے۔ شاید ابا بھی اس سے گھبرا گئے تھے، اس لئے انہوں نے جی بہلانے کے لئے شاعری شروع کر دی۔ مگر یہ شاعری تو ان کے گلے کا بار ہو گئی۔ ایک ایک دن میں دس دس بیس غزلیں ہونے لگیں۔ پھر انہیں خیال آیا کہ لاؤ کسی استاد سے مشورہ بھی کر لیا جائے۔ پہلے استاد بخود سے رجوع کیا، تھوڑے دن تو بھی اس کے بعد ان سے چٹخ گئی۔ استاد بڑے منہ بھٹ اور بد لحاظ آدمی تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ یہ شاگرد تو اصلاح پر محبت کرتا ہے، صاف جواب دے دیا کہ آپکو اصلاح کی ضرورت نہیں ہے۔ استاد بخود کے بڑے پن سے بیزار ہو کر نواب سائل سے بات جوڑا۔ ان سے دوستی پہلے ہی تھی۔ وہاں بھی اصلاح پر اختلاف ہوا نواب کہتے کہ "اس مصرعہ کو یوں کر لویا کہتے" نہیں جی، میرا یہ مصرعہ ٹھیک ہے۔ نواب سائل مدد بخ آدمی تھے مگر شائستہ۔ انہوں نے کچھ عذر معذرت کر کے اپنے استاد بھائی نوح ناردی سے اصلاح لینے کا مشورہ دیا۔ نوح صاحب کے میزان پٹ گئی۔ وہ مرغیاں مرغی قسم کے آدمی اور بڑے پڑنے تجربہ کار دو چار ہی خطوں میں جان گئے کہ یہ شاگرد اصلاح سے چڑتا ہے۔ یہاں سے غزلوں کا پلندہ مارا جاتا اور دو چار مصرعوں کی تبدیلی کے بعد جوں کا توں آجاتا۔ غرض سال ڈیڑھ سال میں مرثیہ دیوان تیار ہو گیا اور "دیوان بشیر" کے نام سے مشائع بھی ہو گیا۔

اسی عرصے میں خیال آیا کہ لاؤ گے ہاتھوں بادشاہوں کے فرمان ہی جمع کر لیں۔
خبر نہیں کہاں کہاں سے فرمان، ان کی تصویریں اور ان کی نقلیں منگوائی گئیں۔ انہیں
مرتب کر کے ان کے ترجمے اور حواشی لکھے۔ ایک سال میں خاصی موٹی کتاب ڈرامین
سلاطین، شائع ہو گئی۔ پھر لکھنؤ کے لئے "انشائے بشیر" لکھی۔ اس سے پہلے میری
بہن کے جہیز میں دینے کے لئے دو حصوں میں "نعتِ جگر" لکھی تھی۔ غرض تا بڑا توڑ تانی
کتاب میں لکھیں کہ اس زمانے میں سوئے مولوی عبدالحلیم شہر کے کسی اور نے اتنی کتابیں
نہ لکھی ہوں گی۔

شہر کو بھی ایک واقعہ یاد آگیا۔ انہوں نے پردہ کے خلاف ایک ناول "بدرا النسا"
کی مصیبت لکھا تھا۔ ابا کو انہوں نے اس کی ایک کاپی بھی اور خط لکھا کہ مولوی صاحب!
آپ بھی آج کل کے پردے کے خلاف لکھئے۔ اور میری تائید کیجئے۔ ہر چند کہ ابا کسی قدر
آزاد خیال مولوی تھے اور عورتوں کے حقوق اور عورتوں کی حمایت میں بہت کچھ لکھتے رہتے
تھے مگر اتنے آزاد خیال بھی نہیں تھے کہ مذہب کے ادا مرفوظی کو بالائے طاق رکھ
دیتے۔ بہائے گھر میں سختی سے پردہ کیا جاتا تھا۔ گھر کی عورتیں کہیں ملنے یا شادی
عنی میں جاتیں تو گھر کی بند لکھی میں یا ڈول میں۔ اور ڈول کے پردے پر بھی ایک چادر
ڈال دی جاتی۔ بارہ برس سے زیادہ عمر کا لڑکا زمانہ گھر میں ملازم نہیں رکھا جاتا تھا۔
شہر کا خط حب آیا تو ابا خوش مذاقی کے موڈ میں تھے۔ جواب میں لکھا کہ "ایسا کیجئے کہ
پہلے آپ اپنی بیوی اور بچیوں کو لا کر میسر سامنے کیجئے پھر میں آپ کی تائید کروں گا۔
کاؤنٹر گھر سے شروع ہونا چاہئے۔" خبر نہیں اس کے بعد کیا گزری۔ شہر تو آئے نہیں۔
شاعری اور دوسری کتابوں میں الجھ جانے سے یہ ہوا کہ "تمثال الامثال" رہ گئی۔
دراصل یہ کام ایک آدمی کے کرنے کا تھا بھی نہیں۔ اس کے لئے ایک معقول ادارہ
کی ضرورت تھی۔ ہاں اگر آیا چار پانچ سال اور ہی جاتے تو شاید خود ہی ختم کر لیتے۔

ہم نے تو اس پشاور کے کو ایک مضبوط کپڑے میں باندھ کر چان پر ڈال دیا تھا۔ ہمارے
پاکستان چلے آئے کے بعد خدا جانے اس کا کیا حشر ہوا۔ اس دفتر کا گڑبگڑ و گاؤرا
تصاوت بردہ۔

۱۹۲۶ء میں جازوں کے دن تھے۔ ایک صبح جو اٹھے تو انہیں اپنا دایاں ہاتھ
اور پاؤں سن محسوس ہوا۔ فرانس خانہ دلے حکیم سراج الدین کا ہمسایے ہاں علاج ہوتا تھا۔
حکیم جی کو بلوایا گیا۔ انہوں نے بتایا کہ فالج کا اثر ہے۔ بہت توجہ سے حکیم جی نے علاج کیا۔
منجھ دیئے، ہفتہ مطبوخ کے خطاب دیئے۔ پھر تیرہ دس پائیں۔ مگر اثر کم نہ ہوا۔ ابا
کہتے تھے کہ موت کا پیام آگیا، اس کا کوئی غم نہیں ہے۔ مرنا برحق ہے غم اس کا ہے
کہ میرا بچہ صحتاً لکھنا سب بند ہو گیا۔ کتنے کام ادھورے رہ گئے۔ حکیم سراج الدین کے
بعد حکیم بھوسے میاں اور حکیم ظفر خاں کا علاج بھی کیا گیا، حالت گرتی ہی گئی۔ بہار
سے ایک دیدہ کو بھی بلایا تھا۔ اس کے علاج سے بھی افادہ نہ ہوا۔ دو سال تک یہی
کیفیت رہی۔ اللہ کا اتنا کرم ضرور رہا کہ چل پھر لیتے۔ اور اپنے چھوٹے موٹے کام
خود کر لیتے۔ آخر آخر میں ڈاکٹر انصاری کو ہم نے بلوایا۔ اچھے طبیب اور اچھے
آدمی تھے ڈاکٹر انصاری۔ ابا کو دیکھ کر رنجیدہ ہوئے۔ ابا سے تو انہوں نے
بھی کہا کہ آپ اچھے ہو جائیں گے مگر باہر نکل کر سہم سے کہا کہ اُمید بچنے کی
نہیں ہے۔ بھائی نے ان کی فیس پیٹ کی تو متبول نہیں کی۔ اور بڑے "میرے
لئے یہ فخر کیا کم ہے کہ بڑے ڈپٹی صاحب کا علاج بھی میں نے کیا اور چھوٹے ڈپٹی صاحب
کا بھی۔" ابا کو جب تک ہوش رہا پلنگ پر نہیں پڑے۔ نماز پابندی سے پڑھتے
رہے۔ آخر کے دو تین دن ایسے گزرے کہ بے سُدھ پڑے رہتے۔ کبھی جو شیار
ہوتے تو بولنے کی کوشش کرتے مگر زبان نہیں اٹھتی تھی۔ غذا بالکل بند ہو گئی تھی۔
تیار دار خود دوائیں مانگنے لگے تھے کہ یا اللہ ان کی مشکل آسان کر۔ اور ایک دلی

رات کے دو بجے میں بتایا گیا کہ آجا رہے ہیں۔ ہم سب دوڑ کر ان کے پاس پہنچے۔ سبکیاں آرہی تھیں۔ عجیب بے کسی کا وقت تھا۔ سب کھڑے تکتے رہے۔ ماموں جان حسین سنا رہے تھے۔ دو تین جھکیاں آئیں اور گردن کا منکا ڈھلک گیا۔ اور دنیا ہماری آنکھوں میں اندھیر ہو گئی۔

إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ

مولانا عنایت اللہ

مولانا عنایت اللہ دہلوی ترجمہ کرنے میں غیر معمولی صلاحیت رکھتے تھے۔ یوں تو ان کے والد شمس العلماء منشی ذکاء اللہ دہلوی بھی اپنے وقت کے مشہور مترجم تھے اور انہوں نے بھی بہت ترجمے کئے مگر ان کے ترجموں میں وہ روانی اور بے ساختگی نہیں ہے جو مولانا عنایت اللہ کے تراجم میں پائی جاتی ہے۔ ان کی اس صلاحیت کا احساس سب سے پہلے سرسید احمد خاں کو ہوا۔ منشی ذکاء اللہ عمر میں سرسید سے بہت چھوٹے تھے مگر انہیں سرسید کے رفقا میں سب سے زیادہ قربت حاصل تھی۔ اسی وجہ سے مولانا عنایت اللہ ایم۔ اے۔ او کالج کے زمانہ طالب علمی میں سرسید سے بہت قریب رہے۔ بلکہ ان کے کاموں میں ان کا ہاتھ بٹلتے رہے۔ سرسید نے ان سے آرٹلڈ کی کتاب دی پر کینگڈنز آف اسلام کا ترجمہ کرایا اور مولانا کا ترجمہ دیکھ کر سرسید پھر پاک گئے۔ اپنے کئی خط میں انہوں نے منشا منشی ذکاء اللہ کو لکھا تھا کہ ”میاں تم اپنے لڑکے سے ترجمہ کرنا سیکھو۔ مولانا کا یہ ترجمہ ان کی شہرت کا سنگِ بنیاد ہے۔ سرسید کی تم جلدی میں اس جوہر قابل پر اور چلا ہوئی اور اس میں وہ چمک دمک پیدا ہوئی جو عمر کے ساتھ بڑھتی گئی۔ اور ان کا نام نامی رہتی دنیا تک آفتاب بن کر چمکتا رہے گا۔“

مولانا کا نام میں نے پہلی مرتبہ اُس وقت سنا جب میں کالج میں پڑھتا تھا اور مولانا کا ترجمہ ”تائیس“ دارالاشاعت لاہور سے شائع ہوا۔ اس کو کم و بیش پچیس سال ہو گئے

ہوں گے۔ اردو میں تائیس پڑھنے میں عجیب لطف آیا۔ یہ کتاب سرے سے ترجمہ ہی معلوم نہیں ہوئی۔ مجھے تو اتنا طولِ فرانس کا نام بھی مولانا کی اسی کتاب سے معلوم ہوا تھا۔ مولانا کا ترجمہ پڑھنے کے بعد انگریزی میں *THIS* پڑھی۔ مگر وہ لطف نہ آیا جو اردو میں آیا تھا۔ ایک بار پھر ان کا ترجمہ پڑھا تو یہ عکس مہاکہ مولانا کا ترجمہ اصل کتاب سے زیادہ دلکش اور زیادہ مؤثر ہے۔ کہانی کا موضوع اردو کے مزاج سے زیادہ میل کھاتا تھا۔ میر تقی میر کی باتاری حسینہ تائیس کی داستانِ تفتیش اور پھر راسب پشناطوس کا تائیس کا بچپنا لینا، فلسفیوں کی علمی بحثیں، تائیس کا بے پناہ سن، راسب کا فریبِ نفس جس کا حسن نگاہ بھر کے دیکھنے سے میلا ہوتا ہوا سے یسوع کی رہن بنانے کی کوشش، اس میں کامیابی اور آخر میں پشناطوس کے جلال کا تائیس کے جلال سے شکست کھانا اور نفس کا روح کے شکنجے کو توڑ کر پشناطوس پر چھاپنا، اس کی ساری عمر کی ریاضت کا ایک لمحہ میں خاک میں مل جانا اور مردودِ ملعون ہو کر خونِ شامِ خفاش بن جانا۔ ایک ایسی داستان ہے جو اردو کے قالب میں ڈھل کر ایک خاصہ کی چیز بن گئی ہے۔ سرسید کے پوتے راس سود فرماتے تھے کہ فرانسیسی میں بھی جس میں کہ انھوں نے یہ ناول لکھا ہے اس کہانی کا وہ لطف نہیں آتا جو اردو میں آتا ہے۔ میں نے اس کے وجہ پر غور کیا تو یہی اندازہ کر سکا کہ مولانا اعلیٰ درجے کی محاسنی اردو لکھتے تھے ہار دو زبان و بیان میں محاورے اور روزمرہ کی وہ ساری خوبیاں برقرار رکھتے تھے جو دلی کے خاص خاص گھراؤں کے لئے مخصوص تھیں۔ ان کے ترجمے میں گنجلک فقرے کہیں نہیں آتے پاتے۔ ان کے ترجمے میں دریا کی سی روانی ہے۔ جب لفظ پر لفظ جملتے ہیں تو گویا انگوٹھی میں نگینہ بٹھلتے ہیں۔ میں نے انہیں ایک ایک لفظ کے لئے دونوں سرگرداں دیکھا ہے۔ اپنے چھوٹوں سے پوچھنے میں انہیں کوئی عار نہ ہوتی تھی۔ لفظوں کے نازک فرق کو ادلی تو خود خوب سمجھتے تھے اور اگر کہیں شبہ ہو جاتا تو دوستوں سے، عمدوں سے یا خط کے ذریعے کسی اہل زبان سے پوچھ لیتے تھے۔ اردو کے بے شمار پڑنے لفظ پراپاندھے ان کے

ذہن میں کھڑے رہتے اور وہ انہیں خوب جانچ پرتال کے بعد انتخاب کرتے۔ ایک دفعہ خنگا۔ خنگا اور دلی خنگر کے باسے میں مجھے لکھ کر پوچھا اور میں نے دلی کے بڑے بڑے ہونے سے پوچھ کر ان کو جواب لکھا اس ایک چھوٹی سی مثال سے ان کی تلاش کا پتہ چلتا ہے اور اس کا کچھ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی بے ساختگی کس قدر خون جلا نے کے بعد پیدا ہوئی ہوگی۔

مولانا سے میرا غائبانہ تعارف تائیس کے ساتھ ہوا اور جی سے ان سے ملنے کا اشتیاق پیدا ہوا مگر یہ آرزو سترہ تک پوری نہ ہوئی۔ مولانا اس وقت دارالترجمہ حیدر آباد دکن کے ناظم تھے۔ سترہ میں ساقی جاری ہوا تو ادیبوں اور شاعروں سے رابطہ قائم ہونے لگا۔ ستمبر سترہ میں ساقی کا "دلی نمبر" شائع ہوا۔ اس میں صرف دلی والوں کے مضامین نظم و نثر شامل کئے گئے تھے۔ اس وقت مولانا سے کچھ خط و کتابت ہوئی تھی۔ ساقی کا "دلی نمبر" کئی سال تک چھپتا رہا اور اس میں مولانا کا مضمون بھی ہوتا تھا۔ یوں ان سے نصف ملاقات ہو چکی تھی۔ سترہ میں فی حیدر آباد گیا تو مولانا سے پہلی دفعہ ملاقات ہوئی۔ شہر کے باہر وہ ایک عالی شان کوٹھی میں رہتے تھے۔ کوٹھی میں نہایت نفیس فرنیچر لگا ہوا تھا۔ اور اس کے سامنے کمرے کے ہونے تھے۔ ایک چھوٹے کمرے میں مولانا کی رہائش تھی۔ اسی میں ان کی مسہری بھی لگی ہوئی تھی۔ چھٹی کا دن تھا، اور مولانا سفید قمیص اور سفید ایکڑا جامہ پہنے کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ سر پر سرخ غل کی ٹکڑی ٹوپی تھی۔ عمر ساٹھ سے اوپر مگر چہرہ سرخ و سپید۔ گورا رنگ، کشادہ پیشانی۔ آنکھوں پر سنہرے فریم کی عینک جس میں آنکھیں میرے کی طرح جھپکی تھیں۔ تپلی ستواں ناک۔ موزوں دہانہ۔ اس پر سفید کتراں مونچھیں۔ اکبر جیم بڑے نازک سے آدمی دکھائی دیتے۔ وزیر حسن صاحب نے میرا تعارف کر لیا تو بڑی محبت سے ملے۔ نیچے اور ہلکی آواز میں ہتے رہے۔ اسی نائن میں انہیں ان کی ایک کتاب "جزا فیہ اندلس" پر حکومت دکن نے غالباً دس ہزار روپے انعام یا معافہ کے دیئے تھے۔ فرماتے تھے کہ میں نے اس کتاب پر اپنی ساری عمر صرف کی ہے اور ایک ایک شہر اور مقام کا پڑانا نام معلوم کرنے کے لئے بیسیوں کتابیں دیکھی ہیں۔

پھر اس کتاب کو کوئی کئی بار خوش خط لکھوایا۔ جتنا انعام ملا ہے اس سے زیادہ اس پر میرا روپیہ خرچ ہو چکا ہے۔ چلے ہی کیا کم ہے کہ میری محنت ٹھکانے لگی اور کتاب چھپنے کی توجہ تو آئی۔ وہ کتاب مولانا نے اپنی باقی تمام کتابوں کے ساتھ مجھے تحفہً بعد میں دی تھی۔ مجھے اُس کے پڑھنے کا تو بھلا دماغ کہاں تھا البتہ اُسے حسبِ جستہ میں نے دیکھا تھا۔ مولانا نے اس میں بڑی جان لگا ہی تھی۔ واقعی ایسے کام کیلئے ایک عمر تو درکار ہوتی ہے، کام کرنا عشق بھی درکار ہوتا ہے۔

تائیس کے تجربے کا بھی اسی ملاقات میں ذکر ہوا۔ اپنی تعریف سن کر خوش ہوئے مگر اناطول ہی کی تعریف کرتے رہے کہ کس غضب کا لکھنے والا ہے کہتے تھے کہ اُس کی اور کوئی کتاب اس پایہ کی نہیں ہے۔ تراجم کے سلسلے میں انہوں نے اپنا ایک اور ترجمہ دکھایا۔ یہ فلسفہ سائز کے کوئی پانسو صفحے کا ٹائپ کیا ہوا مسودہ تھا مولانا نے کہا یہ رائیڈر میگزین کی کتاب "دی مارنگ اسٹار" کا ترجمہ "نجم اسحر" ہے۔ اس کی کہانی مجھے تائیس سے زیادہ پسند ہے۔ اس میں بھی مصر کی قدیم تہذیب پیش کی گئی ہے۔ فراعنہ کے زمانے کی۔ معلوم ہوا کہ یہ کتاب مصر کی صورت میں اسلئے بھی ہوئی ہے کہ اس کے لئے چھاپنے والا کوئی موزوں ادارہ نہیں ملا۔ اور مولانا خود چھپانے کے جھکندن میں پڑنا نہیں چاہتے۔ میں نے اُن سے کہا "میں اسے ساتھی بک ڈپوسٹ سٹال کر دوں گا" مولانا نے تعجب و مسرت سے میری طرف دیکھا اور بے "اس پر کیا لاگت آئے گی؟" میں نے کہا "پانچ سو روپے" کہنے لگے "میرے پاس تو اس وقت اتنا روپیہ نہیں ہے" میں نے کہا "روپیہ تو میں لگاؤں گا۔ آپ یہ بتا دیجئے کہ رائٹنگ آپ کیا لیں گے؟" انہوں نے پھر استہواب سے دیکھا اور بولے "روپیہ بھی آپ لگائیگی اور رائٹنگ بھی دیجئے! یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ بس یہ کتاب چھپ جائے۔ مجھے کچھ نہیں چاہئے، اور میں نے اب تک کسی سے کچھ لیا اور نہ کسی نے مجھے کچھ دیا" اسکے بعد مجھے یہ معلوم کر کے افسوس ہوا کہ ہمارے دو نہایت ذمہ دار اداروں نے مولانا سے روپیہ لیکر

اُن کی کتابیں چھاپیں اور انہیں رائٹنگ دینا تو کیسا اصل قسم بھی واپس نہیں دی۔ اور ایک جناب نے تو انہیں اسامی ہی بنا رکھا تھا کہ مولانا سے کتاب بھی لے جاتے اور روپیہ بھی۔ اور دو چار سو روپیہ واپس دینے کے بعد نقصان کی بشارت دے کر روپیہ معاف کرا لیتے "خیر تو" "نجم اسحر" کا مسودہ میں ان سے لے آیا۔ اس کے چند باب پہلے ساتھی میں چھپے اور پھر پوری کتاب چھپی مولانا بہت خوش ہوئے کہ اُن کی محنت ٹھکانے لگی۔

اُسی دن کی ملاقات کا ایک لطیف واقعہ بھی سن لیجئے۔ مولانا کچھ بے چین دکھائی دیتے تھے حکومت کی بد نظمی کا کچھ تذکرہ ہوا تو فرمایا کہ یہاں تو پارٹی بندیاں رہتی ہیں سچ اُس پارٹی کا زور ہے کل اُس پارٹی کا۔ رعایا میں ٹوٹ کھوٹ مچی ہوئی ہے۔ خود اعلیٰ حضرت کو روپیہ جمع کرنے کا ہنر ہو گیا ہے۔ دوسرے کرتے ہیں پائیگا ہوں اور چھوٹی چھوٹی ریاستوں سے چھکڑے بھر کر کے سونا چاندی لاتے ہیں۔ رئیسوں میں مسابقت ہو رہی ہے ایک کہتا ہے کہ اگر اعلیٰ حضرت یہاں تشریف لائیں تو دس لاکھ کی نذر گزاروں گا۔ دوسرا کہتا ہے میرے یہاں تشریف لائیگی تو میں گیارہ لاکھ پیش کروں گا۔ چنانچہ اعلیٰ حضرت پہلے دس لاکھ دالے سے دس لاکھ وصول کرتے ہیں اور پھر گیارہ لاکھ دالے سے گیارہ لاکھ۔ اس طرح گویا دونوں کو خوش کر دیتے ہیں۔ یہ روپیہ کیسے جمع کیا جاتا ہے؟ رئیس اپنے تعلقداروں سے کہتا ہے کہ دس لاکھ روپیہ جمع کرو۔ تعلقدار تحصیل داروں سے کہتے ہیں تحصیلدار پٹواریوں سے کہتے ہیں اور پٹواری رعایا کی کھال اُٹھاتے ہیں۔ پندرہ سو لاکھ روپیہ نیچے سے جمع کیا جاتا ہے اور اپنا اپنا حق رکھ کر اوپر پہنچا دیا جاتا ہے۔ پانچ لاکھ روپیہ کٹوتیوں میں غائب ہو جاتا ہے۔ باقی دس لاکھ اعلیٰ حضرت کی بحیثیت چڑ جاتا۔ رعایا کھٹکھٹوتی چلی جا رہی ہے اور اعلیٰ حضرت کے خزانے اُٹتے چلے جاتے ہیں۔ ایک خزانہ بھر جاتا ہے تو اُس کے منہ پر نیزہ کر دیا جاتا ہے اور خزانے میں بجلی کی زد چھوڑ دی جاتی ہے۔ جن لوگوں نے ان خزانوں کو چشمِ خود دیکھا ہے اُن کا بیان ہے کہ جن گاڑیوں میں پٹے اور مشینوں کے ٹوٹے لاد کر لائے جاتے اُن پر سے انہیں اتارنے کی زحمت بھی نہیں

کی جاتی۔ گاڑیاں یوں کی یوںی مکروں میں کھڑی کر دی جاتیں۔ انہی دیکھنے والوں کا کہنا ہے کہ بوجھ سے گاڑیوں کے پہنے زمین میں دھنس گئے تھے۔ اعلیٰ حضرت کی یہ زراں دوزی دیوانگی کی حد کو پہنچ گئی تھی۔ اس میں انہیں بڑے بھلے کی تمیز نہیں رہی تھی۔ انہیں روپیہ ملنا چاہئے تھا۔ کسی طرح بھی ہو۔ رئیسوں اور امراء کی شادی شدہ میں اس وقت شریک ہوتے جب پہلے نذر کھول لیتے کہ کتنا روپیہ ملے گا۔ بیٹے والے سے الگ لیتے اور بیٹی والے سے الگ لیتے۔ اس طرح دونوں گھروں کو شاد و آباد کرتے۔ اس جنون کی آخر یہ کیفیت ہو گئی تھی کہ اگر کوئی غریب کوئی تحفہ یا نادر چیز اس امید پر بارگاہ خسروی میں پیش کرتا کہ اسے مالی منفعت ہو تو اسے اٹھ لے لینے کے دینے پڑ جاتے۔ اسی زمانے کا ذکر ہے کہ ایک شخص اپنے باغ سے پانسو عمدہ آم اپنے بادشاہ کے لئے لایا۔ بادشاہ انہیں دیکھ کر باغ باغ ہو گیا۔ آسموں کی بہت تعریف کی۔ پوچھا کہا کہ اسے لائے کس باغ سے لائے۔ ان کی قیمت گنتی لانے والے نے کہا خداوند ان کی قیمت کیا؟ نذر قبول ہو جائے بس۔ ارشاد ہوا انہیں نہیں پھر بھی کتنے کے ہوں گے یہ آم؟ غریب نے سوچا کہ قسمت نے یادری کی، نصیب کھلنے کا وقت آپہنچا۔ بولا سرکار بے کوئی پانچ پانچ روپے کا ایک فرمایا۔ ہاں ہاں کیوں نہیں بہت عمدہ آم ہے۔ ضرور ہوگا پانچ پانچ روپے کا۔ مگر میں کہاں کھا سکتا ہوں اتنے آم! لے جاؤ ہی انہیں۔ مجھے تو ان کا روپیہ بھی بے بس۔ تو صاحب حکم حاکم مرگ مناجات۔ پر ان ڈھیلے ہو گئے۔ ڈھائی ہزار روپیہ شاہی خزانے میں قرص دام کر کے بھرا اور اپنے نصیبوں کو کوستا، روتا، پیٹتا، گھرا پس آیا۔

بازاروں میں سودا بیچنے والوں نے بیٹھنا چھوڑ دیا تھا کہ اعلیٰ حضرت من مالی قیمت پر ضرورت کی چیزیں خرید لیتے تھے جس دکان یا بزاز خانے میں گھستے جہلک پر جاتا ہزار روپے کی چیز کس روپے میں لے جاتے اور ان کس روپوں کو بھی دکان دار جھینکتا پھرتا۔ نیلام میں سب سے پہلے بولی سرکار خود لگا دیتے۔ کس کی مال نے دھونسا کھایا ہے کہ بڑھ کر بولی

لگائے؟ زن کچھ نہ کہو بلو دیا جاتا۔ غرض جہاں جلتے اڑا پڑ جاتا۔

اعلیٰ حضرت نے اس زمانے میں تحفگی بھی کر رکھی تھی کہ جس کسی کے ہاں سے کوئی تحفہ آتا اس کو کوئی حصوں میں بانٹ کر عہدہ داروں کو بھیج دیتے اور عہدہ داروں کا فرض ہو جانا کہ اگلے دن ذیل صبی مبارک پر حاضر ہوں اور باریاب ہو کر سرفرازی کی نذر گزاریں۔ تجھے تحفے حضور کے پاس آتے سب کا یہی حشر ہوتا۔ کسی جنگ دولہ نے اپنے باغ کے آم سرکار کو بھیج دیئے تھے۔ اور سرکار نے پانچ پانچ دانوں کا تورہ بنا کر امرا اور عہدہ داروں میں تقسیم کر دیا تھا۔ دلا نا کی بے حسنی کی وجہ یہ معلوم ہوئی کہ عمر میں پہلی مرتبہ انہیں یہ سعادت آج صبح نصیب ہوئی تھی کہ چار شاہی خاصہ دار اور ایک عصابہ دار کسی میں تورہ عثمانی لے کر نازل ہوئے۔ مولانا سیدھے سادے آدمی تھے۔ ان کی آمد کی اطلاع سے گھبرا گئے۔ انہیں فدا اندر بلوایا۔ تعظیم و تکریم سے پانچ پانچ روپے ہر ایک کی خدمت میں پیش کئے۔ کپکپاتے ہاتھوں سے پانچ ٹرہبشت عطیہ عثمانی کے لئے ٹیکسی کا کرایہ دے کر خانہ داران عثمانی کو رخصت کیا۔ صبح یہ حادثہ پیش آچکا تھا۔ اور مولانا سوچ سوچ کر پریشان ہوئے تھے کہ دیکھنے کل کیا گزرتی ہے۔ فرلنے لگے کہ میں اعلیٰ حضرت کی پیشی میں پہلے کبھی نہیں گیا۔ سنا ہے کہ وہاں بڑی بے عزتی ہوتی ہے۔ بارگاہ میں داخل ہونے سے پہلے تین جنگ رک رک کر سات سات فرشتی سلام کرنے پڑتے ہیں۔ نظر اُدکی کرنا یا اعلیٰ حضرت کو دیکھنا سو ادب ہے۔ اندھے بھینے کی طرح آگے بڑھ کر ایک اشرفی اور پانچ روپے درویشی دوا مال پر رکھ کر نذر گزار دینی جاتی ہے۔ کئے کا کام نہیں بات کا نام نہیں، ذرا ٹھنکے کہ چوہدار وہ گردنی دیتا ہے کہ نذر گزار بارگاہ کے باہر اپنے آپ کو پاتا ہے۔ ہم نے مولانا کو دلاسا دیا اور محبوبان یقین دلایا کہ آپ کے ساتھ ایسا غیر انسانی سلوک نہیں کیا جائیگا۔ مگر مولانا بے چین اور پریشان ہی رہے۔

مولانا کے بارے میں مجھے معلوم ہوا تھا کہ انہوں نے ساری عمر شادی نہیں کی۔ اُن کی

زندگی پرانے فلسفیوں کی سی زندگی تھی۔ اُن کا سارا وقت پڑھنے لکھنے ہی میں گزرتا تھا۔ لیکن جس کوٹھی میں میں گیا تھا اُس میں غلامیں بھی تھیں اور دو تین نوجوان بھی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ مولانا کے بیک دست تھے جو چھوٹے چھوٹے بچے چھوڑ کر جوانی ہی میں انتقال کر گئے۔ مولانا اُن کی بیوہ اور بچوں کی کفالت کرتے رہے۔ رفتہ رفتہ وہ خاتون مع بچوں کے مولانا کے گھر ہی میں آکر رہنے لگیں اور پھر گھر کا سارا انتظام بھی انہوں نے اپنے ذمہ لے لیا۔ اس سلسلے میں طرح طرح کی روایات مولانا سے وابستہ ہو گئی تھیں۔ لیکن میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ مولانا گنہگار تو کیسے تصور دار بھی نہیں تھے۔ میں نے اُن خاتون کو مولانا کے آخری وقت تک اُن کے گھر میں دیکھا۔ مولانا اُن سے بالکل بے نیاز رہتے تھے مگر خلق و مروت سے اتنے مجبور تھے کہ ساری عمر انہیں اپنے گھر میں رہنے دیا اور اُن کا پورا خرچ اٹھایا۔ یکجائی کے باوجود علیحدہ ہی رہے۔

حیدر آباد کی اس مقامات کے کچھ عرصے بعد معلوم ہوا کہ مولانا ناظم دارالترجمہ کے عہدے سے مستعفی ہو کر چلے آئے ہیں۔ میں اُن سے ملنے اُن کے آبائی گھر گیا۔ یہ گھر کوچہ چیلان میں اب بھی ہے۔ مولانا ایک بڑے کمرے میں بیٹھے کتاب پڑھ رہے تھے اُن سے بہت باتیں ہوئیں معلوم ہوا کہ ریاستی سازشوں کی وجہ سے انہوں نے ملازمت سے علیحدگی اختیار کر لی۔ کئی ہزار روپیہ وہاں سے یکیشٹ ملنے والا تھا۔ اس کے ملنے کا بھی انتظار نہیں کیا۔ سخت دل برداشتہ اور مستنفر ہو کر وہاں سے آئے تھے۔ گھر کا سارا سامان نیلام گھر میں ڈلوادیا تھا۔

میں نے پوچھا "آئندہ تو دہلی ہی میں رہنے کا ارادہ ہے نا؟" بولے "نہیں دہرہ دہلی میں۔ میاں رضا اللہ (چھوٹے بھائی) نے بھی وہاں ایک کوٹھی لے رکھی ہے۔ انہوں نے وہاں میرے لئے قریب ہی ایک اور کوٹھی خرید لی ہے۔ دہرہ دہلی کی آب و ہوا مجھے پسند ہے اور یوں بھی جتنے بڑے رشتہ دار ڈالٹ گزرتے ہیں دہرہ دہلی ہی جلتے ہیں۔"

مولانا کی اور باتوں سے معلوم ہوا کہ وہ دہلی سے ہینڈل میں اور ہینڈل میں نہیں مہمانی چاہتے تھا کیونکہ وہ بڑی بڑی کشادہ کوشیدیں میں رہنے کے عادی ہو چکے تھے۔ دہلی کی تنگ گلیاں اور گندے محلے اور اُن کا شور مولانا برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ اُن کا آبائی گھر بہت بڑا اور کھلتا تھا مگر اس میں وہ نہیں رہ سکے۔ اس کے بعد ایک بار پھر دہلی آئے تو قطب صاحب (مہرولی) میں ڈپٹی قضا اللہ صاحب کی کوٹھی میں ٹھہرے۔

دہرہ دہلی میں انہیں کام کرنے کی بہت فرصت ملی۔ DANTE کی "ظربہ خداوندی" میں نے مولانا کو بھیجی۔ مولانا نے اُس کے ایک حصے INFERNO کا ترجمہ "دلے کا جہنم" کے نام سے کیا۔ یہ پورا ترجمہ ساقی کے ایک خاص نمبر کی صورت میں چھپا۔ یہ ترجمہ بہت دیر سوزی چاہتا تھا اور مولانا اپنے کچھ اور ترجمے بھی مکمل کرنا چاہتے تھے، اس لئے "اعراف" اور "حجۃ" کے ترجمے کرنے کی مہلت نہیں ملی۔ میں مولانا سے ملنے کی "فردوسِ گمشدہ" کا ترجمہ بھی کرنا چاہتا تھا اور وہ اس کے لئے آمادہ بھی ہو گئے تھے لیکن اُن کی ضعیفی اور بیماری مانع ہوئی۔ فلاہیر کے ایک طویل افسانے "ہرودیا س" کا ترجمہ ساقی کے ایک خاص نمبر کے لئے کیا۔ اسی زمانے میں ڈوڈی کی تاریخ کا ترجمہ دو ضخیم جلدوں میں انہوں نے کیا تھا۔ اسے اُن کے ایک پرانے دوست مولوی محمد اسماعیل پانی پتی نے مولانا ہی کی ہاگت سے شائع کیا۔ آخر دم تک اُن کے ہاتھ سے قلم نہیں چھوڑا۔ گھنٹوں بیٹھے ترجمہ کرتے رہتے تھے۔

مولانا مجھ پر بزرگوار شفقت فرماتے تھے۔ انہیں غالب زندگی میں بڑی یاہوسیاں ہوئی تھیں اس لئے آدم ہیزا سے ہو گئے تھے۔ وہ بے لوث ملتے تھے اور چاہتے تھے کہ لوگ بھی اُن سے بے غرض ملیں لیکن کیے ضرورت پڑی ہے کہ بے مطلب دوسروں سے ملتا چھوڑے۔ میرا بھی اُن سے ملنا خود غرضی ہی پر مبنی تھا کہ میں اُن سے ساقی کے لئے مضامین لکھواتا اور اُن سے کتابوں کے تراجم کرتا۔ لیکن مولانا اس قدر خلوص سے ملتے کہ کیا کوئی اپنا بھی ملے گا۔ بعد میں حسن اتفاق سے وہ کچھ مہینے بھی ہو گئے تھے۔ اُن کے سب سے

چھوٹے بھائی فرحت اللہ کی صاحب زادی سے میرے بھائی کی شادی ہوئی۔ مولانا اس شادی میں شریک ہونے دہرہ دون سے آئے تھے۔ نکاح ڈپٹی نذیر اللہ صاحب کی حویلی میں پڑھایا گیا۔ مولانا بات میں ملے تو بہت خوش تھے کہ یہ رشتہ ہو گیا کرتے تھے کہ اس سے دوسرا علماؤں کے خاندان مل گئے۔ ڈپٹی نذیر احمد اور مٹھی ذکار اللہ میں بڑی دوستی تھی۔ دونوں نے ایک ساتھ دلی کالج میں پڑھا تھا۔ دونوں ہم عمر تھے اور دونوں کی وفات میں بھی کچھ زیادہ وقفہ نہ رہا۔

سلسلہ کے بعد مجھے اکثر گرمیاں دہرہ دون اور مسوری گزرنے کا موقع ملا۔ ڈالین والا میں مولانا کی کوکھی ٹیسے مکان کے قریب ہی تھی۔ اس نے ان سے روزانہ گفتگوں ملاقات رہتی۔ وہ صبح بہت سیر سے اٹھ جاتے اور کام کرنے بیٹھ جاتے۔ انہیں ترجمہ کرنے کی عادت ہو گئی تھی۔ بلکہ ترجمہ کرنے سے محبت ہو گئی تھی۔ نام یاد نہیں آ رہا کسی فرنگی نے مسلوں کی تاریخ چار ضخیم جلدوں میں لکھی تھی۔ انگریزی میں بھی اس کتاب کا محدود ادیشن شائع ہوا تھا اور دوبارہ اس کے چھپنے کی ذمت نہ آئی۔ مولانا ساہبا سال سے اس کا ترجمہ کر رہے تھے۔ ہزار ہزار صفحے کی تین کاپیوں میں ترجمہ کر کے مولانا نے مسودے کی جلد بندی کرادی تھی۔ چوتھی جلد کا ترجمہ جب بھی وقت ملتا، کرتے رہتے تھے۔ مولانا کی بڑی آرزو تھی کہ اس کا ترجمہ مکمل ہو جائے۔ فرماتے تھے کہ دیکھئے ترجمہ پہلے ختم ہوتا ہے یا زندگی؟ مولانا اس وقت سنتر سے اُدھر ہو چکے تھے اور ان کے قوا خلع منحل ہو گئے تھے میں نے ان سے کہا: مولانا اسے کون چھاپے گا؟ آپ کی یہ محنت تو بیکار ہی جاتی دکھائی دیتی ہے۔ مولانا نے فرمایا: اس کے چھپنے کی ذمت تو کبھی نہیں آئے گی لیکن اگر مکمل ہو جائے تو مسودے کی جلد بند ہوا کر علی گڑھ یونیورسٹی کو دے دوں گا کہ اپنی لائبریری میں رکھ لے۔ وہ ترجمہ جلدی ختم ہو جاتا لیکن مولانا اس کے ساتھ ساتھ دوسری کتابوں کے تراجم بھی کرتے رہے۔ میری

فرمائش پر انہوں نے نذیر کے تاریخی ناول "سلا میو" کا ترجمہ دو جلدوں میں کیا۔ ڈاکٹر طحان کی رسید اس کا ترجمہ کیا اور پھر اپنے ہی ذوق سے خشکی پیر کے ڈراموں کے ترجمے کرنے لگے۔ بارہ چودہ مشہور ڈراموں کا انہوں نے ترجمہ کر دیا۔ جو ساقی کے خاص خبروں میں ایک ایک کر کے چھپتے رہے۔ مشکل سے مشکل کتاب کا ترجمہ کرنے کی صلاحیت میں نے مولانا کے علاوہ اور کسی میں نہیں دیکھی۔

دہرہ دون میں میں نے مولانا کو کبھی بیکار بیٹھ نہیں دیکھا۔ وہ یا تو لکھتے رہتے تھے یا کوئی کتاب پڑھتے رہتے۔ شام کو کبھی کبھی تھوڑی دور کا چپکرا اپنی کار میں لگاتے۔ ان کے زیادہ دوست بھی نہیں تھے۔ ان کے پاس ٹیپو کا کوئی سامان بھی نہیں تھا کہ لوگ ان کے پاس آتے۔ بات بھی وہ کم ہی کرتے تھے اس لئے ڈالین والا کے پڑوسی تک ان کے ہاں نہیں آتے تھے۔ بڑی سی ڈھنڈار کوکھی تھی جس میں مولانا اکیلے رہتے تھے۔ اکثر وہ خاتون بھی آکر دتی تھیں جو دوست کی بیوہ تھیں۔ ایک برآمدے میں بڑا سا پنجبرہ تھا جس میں رنگ برنگ چھوٹے چھوٹے طوطے تھے۔ کوکھی کے سامنے پائیں باغ تھا جسے مالی مہاتا سنوارتا رہتا تھا۔ مولانا کرسیاں بچھا کر اس میں بھی بیٹھتے تھے۔ پُرانی پُرانی باتیں سناتے رہتے۔ میں نے ان سے بارہا کہا کہ آپ جو باتیں سناتے ہیں انہیں لکھ دیجئے۔ انہوں نے لکھنے کی کوشش بھی کی مگر ان کا جی نہیں لگا، اور وہ نہیں لکھ سکے۔ یہ ایک بہت بڑا خزیہ تھا جو ان کے سینے کا دفینہ بن گیا۔

آخری بار جب ان سے دہرہ دون میں ملاقات ہوئی تو وہ بہت بیمار تھے۔ کھانسی اور سانس کی تکلیف بڑھ گئی تھی۔ اس کے علاوہ مثلنے کے غمزدگی تکلیف بڑھ رہی تھی۔ اکثر لیٹے رہتے تھے۔ میں ملنے گیا تو اطلاع پاتے ہی باہر آ گئے اور ناقابلِ برداشت تکلیف کے باوجود دیر تک بیٹھے ہاتھیں کرتے رہے۔ پھر ان سے بیٹھا نہیں گیا اور بڑے

دل شکستہ ہو کر رخصت ہوئے۔ یہ اُن سے میری آخری ملاقات تھی۔

دہرہ دون کے اگلے پچیسے میں معلوم ہوا کہ مولانا دلی گئے ہوئے ہیں۔ آپریشن کرنے کی ضرورت تھی مگر اُن میں اس کا دم نہ تھا۔ دہرہ دون واپس آ کر موت کا انتظار کرنے لگے۔

ایک دن پائیں باغ میں آرام گزی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ کھانسی ابھی اور طائر روح قفسِ عنبری سے پرواز کر گیا کسی کو خبر ہی نہیں ہوئی۔ بہت دیر بعد بڑھامالی ادھر آیا تو مولانا کے دھسکے ہوئے سر کو دیکھ کر ٹھٹھا۔ قریب جا کر دیکھا تو مولانا ابدی نیند سو رہے تھے۔

مرزا عظیم بیگ چغتائی

اللہ بخشے مرزا عظیم بیگ چغتائی بھی عجب خوبیوں کے آدمی تھے۔ سدا کے مزید پیدا ہوئے تو اتنے نحیف و کمزور کہ روٹی کے پہلوں پر رکھے گئے۔ بڑے ہوئے تو روگی مرعین۔ اللہ کا دیا گھر میں سب کچھ موجود تھا۔ دو حیاں بھی جانداری اور خیا بھی سادنی۔ ان کے والد قسم بیگ چغتائی یو۔ پی میں ڈپٹی کلکٹر تھے۔ آبائی وطن اگر وہ تھا۔ یہیں ان کی جدی جانداری تھی۔ مرزا عظیم بیگ چغتائی کے نانا منشی امراؤ علی تھے۔ جواب سے نصف صدی پہلے کے مشہور ناول نگار تھے۔ ان کی تصانیف ”رزم بزم“ اور ”البرٹ مل“ ایک زمانے میں بہت مقبول تھیں۔ مرزا صاحب کے والد بڑے ٹھٹھا کے آدمی تھے۔ سرسید کی آنکھیں دیکھے ہوئے علی گڑھ کے ابتدائی گریجویٹس میں سے تھے۔ اپنے زمانے کے اچھے کلامیوں میں شمار ہوتے تھے۔ دوزخ کا بھی شوق تھا۔ سواری کے لئے منہ زور سے منہ زور گھوڑے تلاش کر کے رکھتے تھے۔ بڑے طاقتور آدمی تھے۔ ایک بلی نے گھر والوں کو بہت عاجز کر رکھا تھا۔ ایک دن وہ ان کے ہاتھ آگئی۔ ہاتھ اس کی کمر پر پڑا۔ چاہتے تھے کہ اسے گھر سے باہر اچھال دیں مگر وہ کم بخت کلائی میں لپٹ گئی۔ انہیں بھی تاؤ آگیا۔ اسنے اپنے بچوں اور وائٹوں سے اُن کی کلائی ادھیڑ دی مگر انہوں نے بھی اپنے بچے کی گردن اتنی سخت کی کہ اس کی ہڈی پلک ہو گئی اور اسے اُس وقت تک نہیں چھوڑا جب تک اُس کا دم نہ نکل گیا۔ ویسے وہ بڑے

خوش مزاج آدمی تھے اور چھوٹے بڑے سب سے بھی طرح پیش آتے تھے۔

چٹائی صاحب چونکہ پیدائشی کمزور ہوئے تھے اس لئے اور بچوں کے مقابلے میں ان کی طرف والدین کی توجہ زیادہ رہتی تھی۔ لاڈ پیار میں پلے۔ کچھ گھر پر پڑھا، کچھ اٹا دہ کے اسکول میں۔ اس کے بعد علی گڑھ سے بی۔ اے اور ایل۔ ایل۔ بی کے امتحانات پاس کئے۔ کالج ہی کے زمانے میں نواب منزل اللہ خاں کے ہاں ملازمت بھی کر لی تھی۔ کیونکہ شادی ہو گئی تھی اور اخراجات پورے نہ ہوتے تھے۔ اسی زمانے میں مضمون نگاری بھی شروع کر دی تھی۔ بلکہ بچوں کی کہانی "قصیر صحرا" کا پہلا حصہ میٹرک پاس کرنے سے پہلے ہی لکھ چکے تھے۔ اس کے باقی دو حصے بعد میں لکھے۔ محنتی اور ذہین بہت تھے۔

جسٹائی کمزوری کی تلافی دماغی قوت سے ہو گئی تھی۔ کالج کے زمانے میں اسلامی تاریخ کے سلسلے میں مذہب کا بھی مطالعہ کر ڈالا۔ اور حدیث و فقہ سب چاٹ گئے۔ علی گڑھ والوں کی طرح یہ بھی آزاد خیالی اور غربیت کے دلدادہ تھے۔ قدمت پسندوں اور مذہبی خیال والوں سے ان کے مباحثے رہنے لگے۔ انہیں اس میں بھی مزہ آتا تھا کہ دوسروں کو چھڑیں، ستائیں، جلائیں۔ حدیثیں اور تفسیریں مستند کتابوں کے حوالے یاد تھے۔

بڑے دھڑلے سے قائل کر دیتے تھے۔ اس کے بعد یہ نوبت آگئی کہ شرط لگا کر بحث کرتے تھے۔ مثلاً کسی مولانا منجم کے آدمی سے ڈاڑھی رکھنے نہ رکھنے پر بحث بھنٹی تو شرط لگانے کہ "اگر تم جہیت گئے تو ہم ڈاڑھی رکھ لیں گے اور اگر تم جہیت گئے تو ہتھاری ڈاڑھی مونڈ لیں گے۔" بہت سے تو شرط کی نوعیت ہی سے گھبرا کر بھاگ جاتے اور اگر کوئی بہت کر کے جسم گیا تو سمجھو کہ اس کی شامت آگئی۔ سب لڑکوں کو نیوٹا سے دیا جاتا۔ شام کو ایک جم غفیر کی موجودگی میں بحث شروع ہوتی۔ کتابیں کھولی جاتیں، دلیل کی تصدیق یا تردید کی جاتی۔ آخر میں نہ جانے کیا ہوتا کہ چٹائی ہی ہمیشہ جہیت جاتے۔ پھر کسی منچلے کے ہاں سے شیرو کا سامان منگایا جاتا اور نہایت احتیاط

ڈاڑھی مونڈ کر محفوظ کر لی جاتی۔ اس طرح انہوں نے کئی ڈاڑھیاں جہیتی تھیں۔ ایسا بھی ہوتا تھا کہ جہیتی ہوئی ڈاڑھی بیچ دی جاتی تھی۔ وہ اس طرح کہ ہائے ہوئے مولانا سے اس کی مناسب قیمت لے لی جاتی اور ان کی ڈاڑھی بخش دی جاتی۔ اس "قصاص" سے یار لوگ مٹھائی رنگتے اور سب کو شہرینہ تقسیم کی جاتی۔ ایسے ہی ایک مٹھائے میں چٹائی صاحب ایک دفعہ بار گئے۔ انہیں ڈاڑھی رکھنی پڑی۔ اس وقت کی ایک تصویر بھی تھی جسے میں نے "کامران" کے سرورق پر چھاپا تھا۔ خدا جانے پھر کیا کفارہ ادا کر کے اس سے نجات پائی۔

چٹائی صاحب کی شادی رام پور کے ایک پٹھان گھرانے میں ہوئی تھی جو مذہب کا بڑی سختی سے پابند تھا۔ چٹائی صاحب نے شادی کے بعد پہلا کام یہ کیا کہ بیوی کا برقعہ اتروا دیا اور انہیں اپنے ساتھ کھلے بندوں لانا لے جانا شروع کر دیا۔ اسی وضع سے انہیں اپنی سسرال رام پور بھی لے کر پہنچے تو وہ لوگ بہت بگڑے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ ان کی اہل سسرال والوں کی تناسلی ہو گئی۔ مصیبت بے چاری بیگم چٹائی کی! باپ بھائیوں کو یہ زعم کہ ہماری لڑکی بھلا ہائے کہنے سے باہر کیسے ہو سکتی ہے۔ اور ہر بگڑے دل مرزا کہ چلبے جان چلی جائے آن نہ جانے پائے۔ آڑ گئے کہ صاحب دبی ہو گا جو ہم کہتے ہیں۔ سر پھسکر پٹھانوں نے کہا۔ ایسا ہرگز ہو ہی نہیں سکتا۔ کنبے برادری کے سب بڑے بوڑھے جمع ہوئے۔ صلاح ہوئی کہ لڑکی کو گھر بٹھالیا جائے اور داماد صاحب کو بیک بینی و دو گوش رواد کر دیا جائے۔ چنانچہ مرزا صاحب سے کہہ دیا گیا کہ ٹھنڈے ٹھنڈے چلتے پھرتے نظر آئے۔ مرزا کھول گئے مگر کیا کرتے، بوئے میری بیوی سے اور پوچھ لیجئے۔ اگر وہ بھی یہاں رہنا چاہتی ہیں تو خوشی سے رہیں میں چلا جاؤں گا اور اگر وہ میرے ساتھ چلنا چاہتی ہیں تو آپ دُنیا کی کوئی طاقت انہیں نہیں روک سکتی۔ بات منقول تھی۔ سمجھ میں آگئی۔ لڑکی سے پوچھا

تو وہ نیک بخت چادر اورٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس عزیز کو تو مرزا بھرتا تھا۔ ماں باپ کے کھوے سے لگی کب تک بیٹھی رہتی؟ گھر والوں نے کہا: بی بی! ہماری بات نہ کی کر کے جاری ہو تو پھر کبھی اس دلیہ پر نہ آنا۔ آج سے تم ہمارے لئے اودھم مہتابے لئے مرنے لگی۔ وہ بچاری دھاروں روتی میاں کے ساتھ بولی اور مدتوں میسے نہ گئی۔

علیہ السلام سے فارغ ہونے کے بعد چغتائی صاحب نے کتاب "قرآن اور پردہ" لکھی پھر چند سال بعد حدیث اور پردہ" اور اسکے کچھ عرصہ بعد رقص و سرود" اسی عرصے میں کچھ لوگوں کے کھانے اور کچھ اپنے تلخ تجربات کی وجہ سے انہوں نے مذہب کی طرف اپنی توجہ ہٹا کر ادب کی طرف کر لی اور ۱۹۲۹ء سے ان کے ادبی مضامین اور افسانے شائع ہونے لگے۔

جزوی سلسلہ میں ان کا افسانہ انگوٹھی کی مصیبت" یرنگ خیال کے سالنامہ میں شائع ہوا۔ اس افسانے کے چھپتے ہی ہمارے ادبی حلقوں میں ایک بھونچال سا اگیا۔ جس کو دیکھو اس کی زبان پر ای کا ذکر۔ بعد میں چغتائی صاحب نے وہ بے شمار خطوط مجھے دکھائے جو اس افسانے کے بارے میں ان کے پاس آئے تھے۔ مزید خطوط تو صافی تھے لیکن بعض خطوط میں نفسیاتی کیفیات کی روشنی میں افسانے کے بعض مقامات کی توضیح چاہی تھی۔ بعض میں شعور اور لاشعور کی بحث کی گئی تھی۔ ایک خاتون نے پوچھا کہ ہر وجہ ہر دین سے پوچھتا ہے "بھولوگی تو نہیں..... بھولوگی تو نہیں..... بھولوگی تو نہیں.....؟" تو اس میں جو وقفے ہیں کیا آپ بتائیں گے کہ یہ لذتِ التھام سے منظور ہونے کے ہیں؟ چغتائی صاحب بولے: ہیں سچ تک یہی معلوم نہیں کہ لذتِ التھام کیا ہوتی ہے۔ چنانچہ ہم دونوں نے لغت میں اس کے معنی دیکھے اور چغتائی صاحب نے کہ میرے توہم میں بھی یہ بات نہ آئی تھی۔ لوگ بھی کیسی کیسی تو میسے کر لیتے ہیں۔

اس افسانے کے بعد چغتائی صاحب کے چند اور افسانے دوسرے رسالوں میں چھپے مگر وہ اس طرح کے نہیں تھے۔ اس سال اس سے بہتر اور کوئی افسانہ چھپا ہی نہیں حالانکہ اس زمانے میں بڑے بڑے افسانہ نگار تقریباً سبھی زندہ تھے اور کھڑے تھے اس کے کوئی ایک سال بعد میرے پاس ایک خط علی گڑھ سے آیا۔ اس میں چغتائی صاحب کا خط اور دو افسانے تھے خط میں بڑا خلوص تھا اور کسر نفسی بھی۔ ساقی دیکھنے کی خواہش بھی ظاہر کی تھی۔ ان کا خط پا کر بے حد خوش ہوئی اور اسی دن سے ان سے ملنے کو جی چاہنے لگا۔ یہ افسانے تھے "مکھٹ چکی" اور "کولتار" دوسرا افسانہ بہت مشہور ہوا اور جب ان سے پہلی ملاقات ہوئی تو ہم نے منصوبہ بنایا کہ "کولتار" کا پورا ناول کیسے مرتب کیا جائے۔

مرزا صاحب کا پہلا خط ملنے کے بعد ان سے دس سال تک خط و کتابت کا ایسا سلسلہ شروع ہوا کہ شاید ہی کوئی سبقت نافع ہوتا ہو۔ ان خطوں میں دنیا زمانے کی باتیں ہوتی تھیں۔ اور جب خطوں سے جی نہ بھرتا تو وہ دلی چلے آتے یا مجھے لکے پاس جانا پڑتا۔

پہلا خط کھینچنے کے دو تین مہینے بعد ان کا خط آیا کہ میں دلی آ رہا ہوں اور رات کی فلاں گاڑی سے، بیوی بھی ساتھ ہوگی۔ مرزا صاحب کی تصویر ہم سب دیکھ چکے تھے۔ رات کو میں انصار انصاری اور فضل حق قریشی انہیں لینے اسٹیشن پہنچے۔ ریل آئی، ایک ایک ڈبہ چھان مارا۔ چغتائی صاحب کا کہیں پتہ نہ چلا جب گاڑی بالکل خالی ہو گئی تو ہم اسٹیشن سے باہر نکل آئے۔ سامنے سڑک پر سے ایک تانگہ گزرا۔ اس میں ایک خاتون اور ایک صاحب دکھائی دیئے۔ فضل حق نے کہا: وہ جا رہے ہیں چغتائی صاحب! میں نے اور انصار نے چونک کر انہیں دیکھا۔ کوئی بڑھا چڑھا مریا سا آدمی تھا۔ موٹی سی عینک لگا، پھر ہم سب ایک دوسرے کو دیکھ کر سنس پڑے۔ اگلے دن صبح میں گھر

ہی میں تھا کہ اطلاع پہنچی۔ چغتائی صاحب مردانے میں آئے بیٹھے میں۔ میں پک کر پہنچا تو دیکھا کہ میٹک میں وہی تلگے والا بڈھا بیٹھلے۔ غور سے دیکھا تو اسے تصویر سے کچھ مشابہ پایا۔ اس نے کہا: آپ ہیں شاہد صاحب؟ میں نے کہا: جی ہاں۔ اور وہ مجھ سے چٹ گئے۔ بولے اماں میں تو سمجھا تھا کوئی خوفناک شکل کا مولوی ہوگا۔ مولوی شاہد احمد، تم تو اچھے خالص آدمی ہو۔ پھر خوب منے تو میں نے دیکھا کہ نیچے کے چار دانت غائب۔ زرد چہرہ، آنکھوں کے کونوں پر بے شمار جھریاں، کٹے چکے ہوئے۔ بونٹوں کے دونوں طرف تو سیس۔ لبوں پر لاکھا سا جھاڑا۔ چھوٹی چھوٹی کتری ہوئی مونچھیں، ڈاڑھی صاف، دُبلّا پتلا سا شخص عینک کے موٹے موٹے شیشوں میں سے مجھے جھانک رہا ہے۔ میں نے کہا: مرزا صاحب! آپ اپنی تصویر سے بالکل نہیں ملتے۔ کل رات کو آپ کو تا نگے میں جاتے دیکھا مگر مہنے آپ کو نہ پہچانا۔ کہاں بٹھہرے؟ بھائی کہاں ہیں؟ میرے گھر کا پتہ تو آپ کو معلوم ہی تھا۔ یہاں سیدھے کیوں نہ چلے آئے؟ بولے۔ میں نے بھی بہتیں اسٹیشن پر دیکھا تھا مگر نہیں جانتا تھا۔ طیبہ کالج میں میری ایک بہن ہیں، ان کے ہاں چلا گیا۔ اب تہلا لاکھر دیکھ لیا، شام کو آجاؤں گا بیوی کو لے کر۔ اسکے بعد ان سے رسالوں اور مضمون نگاروں اور مضمونوں کی باتیں ہوتی رہیں۔ اندازہ ہوا کہ مرزا صاحب کی قوت گویائی بھی بہت بڑھی ہوئی ہے۔ دوسرے کو ہاں ہوں سے آگے بڑھنے کی زحمت نہیں دیتے۔ مگر باتیں اتنی دلچسپ کہ گھنٹوں سنا اور جی نہ بھرے۔

شام کو مرزا صاحب حسب وعدہ مع بیگم کے آگئے۔ رات کو سب احباب جمع ہوئے اور خوب تہمتے پیچھے رہے۔ رات گئے احباب نے نصت ہوئے تو ہم سونے کے لئے لیٹے، مرزا صاحب میں اور میرے بھیلے بھائی۔ مرزا صاحب بولتے رہے۔ میں سنا رہا۔ وہ بولتے رہے، میں سو گیا۔ صبح اذانوں کے وقت انہوں نے آپ ہی آپ پھر بولنا شروع کر دیا۔ دیکھا کہ بول ہاں بھی غائب ہے تو میرا شانہ ہلکا کر رہا ہے۔ اسے بھی تو بہت انصوح کا پوتا آخر

کب تک خواب دیکھتا رہے گا؟ ناچار جاگ کر ان کی باتیں سننے لگا۔ بولے: سنستے ہو؟ میں ابھی بیت الخلا گیا تو ایک افسانے کا پلاٹ سمجھ میں آ گیا۔ آج جانے سے پہلے تمہیں ہم وہ افسانہ لکھ کر دے جائیں گے۔ بولیں اب اٹھ بیٹھو، رُخ ہاتھ دھو ڈالو۔

تتے میں کہ میں تیار ہوں اور ناشتہ آئے چغتائی صاحب نے آدھا افسانہ لکھ ڈالا۔ ناشتے کے بعد کوئی صاحب ان سے ملنے آگئے۔ میں نل گیا۔ کوئی گھنٹہ بھر کے بعد آیا تو ان کے پاس افسانہ مکمل تھا اور وہ میرے بھیلے بھائی سے بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ وہ پولیس کے آدمی ادب کے جھیلوں سے اللہ نے انہیں محفوظ رکھا تھا۔ بولے۔ "نومیاں سمجھاؤ انہیں۔ خوب آدمی ہیں مہتابے چغتائی صاحب بھی۔ میاں غضب خدا کا ساری رات باتیں کرتے رہے تم دونوں؟ وہ جب سوئے تھے تو ہم باتیں کر رہے تھے، جب جاگے تو ہم باتیں کر رہے تھے۔ سمجھ کر ہم ساری رات ہی باتیں کرتے رہے۔ مرزا صاحب اس لطیفے سے بہت محفوظ ہوئے۔

اس کے بعد انہوں نے اپنے افسانے کی خانہ نزول بتائی کہ کل جو تم نے مجھے اسٹیشن پر نہیں پہچانا تو خامی پریشانی ہوئی۔ مگر واقعی میری تصویر مجھے نہیں ملتی اور بھی وہ تصویر کس کام کی جو اصل سے مل جائے؟ یہ افسانہ اپنی تصویر پر لکھا ہے۔ اس کا عنوان ہے "یہ کس کی تصویر ہے؟" اسکے بعد انہوں نے افسانہ سنایا۔ حیرانی ہوئی کہ قلم برداشتہ ایسا شگفتہ افسانہ! اور اس کے بعد تو میں نے ان کی یہ کیفیت دیکھی کہ باتیں بھی کرتے جا رہے ہیں اور افسانہ بھی لکھ رہے ہیں۔ عدالت میں مقدمہ بھی پیش کر رہے ہیں اور افسانہ بھی لکھا جا رہا ہے اور بعد میں معلوم ہوا کہ اس افسانے کے کچھ درق تو گھر آگئے اور کچھ موزم کی مسل میں لگ کر عدالت کے قائل میں چلے گئے۔

ایک دفعہ اپنی وکالت کے زمانے میں مجھے جودھ پور بلایا۔ میں نے لکھا: اگلے ہفتے آؤں گا۔ کچھ دلی سے منگنا ہو تو لکھئے: خط آیا۔ اور کچھ لاؤ یا نہ لاؤ، پائے ضرور لانا۔

میں جو گئیں کھائے ہوئے۔ دلی سے جو دھپور کوئی جو بیس گھنٹے کا راستہ تھا۔ میں نے سوچا کہ پائے لے جاؤں گا، جاڑے کے دن میں، خراب نہیں ہوں گے۔ اتفاق سے ایک عرب نے جے پور کے آنے ہوئے تھے۔ انہوں نے کہا: اسٹیشن ہی پر دھرنے جاؤ گے۔ جے پور، جو دھپور کی ہندو ریاست میں گائے نہیں ہوتی۔ اور لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ اس لئے ارادہ ملتوی کر دیا۔ مگر جو دھپور پہنچے ہی مرزا صاحب نے پہلا سوال ہی کیا۔ "پائے لائے ہمارے لئے؟" میں نے نہ لانے کی وجہ بتائی تو بولے: "ارے بھئی ہم وکیل ہیں، اگر تم پکڑے جاتے تو ہم تمہیں جرمانہ دے کر چھڑا لیتے، ابھی ہمارے ایک منوکل کی کار کی بٹری ایک گھوٹا مال سے ہو گئی تھی۔ اُن محترمہ کی ٹانگ ٹوٹ گئی۔ عدالت نے ہار دینے پر جرمانہ کیا۔" میں نے کہا: "آپ کی وکالت یہاں کچھ چل ہی رہی ہے؟" کہنے لگے: "کیوں نہیں؟ ہمارا رجسٹر دیکھو۔" یہ کہہ کر اپنا رجسٹر نکال کر دکھانے لگے۔ کسی سے پیشگی پانچ، کسی سے دس وصول ہوئے تھے۔ پچاس پچاس ساٹھ ساٹھ باقی میں ڈال رکھے تھے۔ بہت چمک کر بولے: "پچھلے مہینے چالیس روپے کی آمدنی ہوئی، چھ سو بقایا میں ہیں۔" میں نے کہا: "ماشاء اللہ خوب چل رہا ہے۔" بولے: "مہاں تم یافتہ کو دیکھتے ہو، بقایا کو دیکھو۔ ہزاروں پر نوبت ہے، ہزاروں پر۔" کوئی منوکل آگیا تو جو دھپور کی فحشی کو بلا کر کہا: "اس سے کہہ دو کہ وکیل صاحب کے پاس کام بہت ہے۔ کل کچہری میں ملے۔ اسے تم دیکھتے نہیں ہمارے دوست دلی سے آئے ہوئے ہیں، منوکل تو اور بھی آجائے گا۔ یہ کب کب ہاتھ آتے ہیں۔" اور پھر مرزا صاحب کی دلچسپ باتیں شروع ہو جاتیں اور باتیں ختم ہونے نہ پاتیں کہ وہ اپنے کسی ناول کا مسودہ سناٹا شروع کرتے۔ اس زمانے میں انہوں نے اپنا ناول "ویمپائر" لکھا تھا۔ بولے: "میں پڑھتا ہوں، تم اس کی زبان ٹھیک کرتے جاؤ۔" میں نے کہا: "آپ کی زبان ایسی نہیں ہوتی کہ میں اسے ٹھیک کروں" کہنے لگے: "نہیں، مجھے اپنی کمزوری معلوم ہے۔ میں زبان کا بالکل خیال نہیں رکھتا، بس لکھے چلا جاتا ہوں۔" میں نے کہا: "تو آپ یہ مسودہ

مجھے دے دیجئے، میں اس کی نظر ثانی کروں گا۔ کہنے لگے: "اچھا سن تو رہا، ابھی مکمل کہاں ہوا ہے۔ پلاٹ اگر ایک جگہ آگیا ہے۔ آگے نہیں چلتا۔ پھر دو گھنٹے تک وہ مسئلے رہے اور مسودہ ختم ہو گیا۔ پوچھنے لگے: "بتاؤ اب اسے ختم کیسے کریں؟" میں نے کچھ بتایا، ان کی سمجھ میں آگیا، بہت خوش ہوئے۔ کہنے لگے: "بس بھئی کل کی روانگی ملتوی کرو تو ہم اپنا یہ ناول مکمل کر کے تمہیں دیدیں گے۔ اس قدر لجاجت سے روکتے تھے کہ مجھے شرمندگی ہونے لگی تھی۔ انہیں نیند بہت کم آتی تھی، رات کو بارہ ایک بجے تک جگاتے تھے۔ اس لئے صبح سات آٹھ بجے تک اُٹھتا تھا۔ پھر دوپہر کو مزد سوتا تھا۔ غرض میں تو سوتا ہی رہا اور انہوں نے "ویمپائر" مکمل کر دیا اور ایک دو افسانے بھی لکھ کر تھما دیئے۔

چغتائی صاحب کے اور سب عزیزوں کو دیکھ کر کہنا پڑا کہ "ایں خاندانم آفتاب است۔" بڑے بھائی ملے، خوب تندرست و توانا، معلوم ہوا کہ آپ بھی تھوڑا کلاس وکیل میں۔ نیچے کے چار دانت غائب۔ مرزا صاحب کے چھوٹے بھائی ملے۔ قوی الحظ، مزاجاً صوفی۔ نیچے کے چار دانت غائب۔ ان سے چھوٹے بھائی بالکل چغتائی صاحب کی شکل کے مگر اچھی صحت، آپ کیا کرتے ہیں؟ فرمایا: "رہتا ہوں، نیچے کے چار دانت غائب۔ سب سے چھوٹے بھائی قد میں سب سے بڑے، ماشاء اللہ دیو زاد، یہ لمبا تر لگا جوان۔ معلوم ہوا کہ آپ کو دق ہے۔ نیچے کے چار دانت غائب، مجھ سے بڑا لگایا میں نے مرزا صاحب سے پوچھا: "یہ کیا مصیبت ہے کہ سب کے چار چار دانت غائب؟" کہنے لگے: "ایک دانتوں کے ڈاکٹر نے بتایا تھا کہ اپنی چار دانتوں سے پائیدار رہتا ہے، بس سب نے اکھڑا ڈالے۔" جب عصمت چغتائی ملیں تو سب سے پہلے میں نے یہی دیکھا کہ کہیں ان کے بھی چار دانت تو غائب نہیں؟ بحمد اللہ ان کے سوائے دانت برقرار تھے۔

ایک دفعہ پھر خط لکھا کہ ملنے کو بہت جی چاہتا ہے۔ آجاؤ۔ کسی کے ذکر تھوڑی ہو۔ تم آؤ گے تو تم سے دس کس کر کے کئی افسانے لکھیں گے۔ میں بیچنا، صحت پہلے سے بدتر

موتی۔ کھانسی زیادہ تھی۔ میں نے کہا آپ اپنی صحت کی طرف سے غفلت کر رہے ہیں کہنے لگے: ڈاکٹر کہتے ہیں تمہیں دق ہے۔ میں کہتا ہوں مجھے دق نہیں، دسبے۔ ان کی مندی طبیعت نے ڈاکٹروں کی رائے ماننے سے بھی انکار کر دیا تھا۔ من مانی دو اینٹیں کھاتے رہتے تھے۔ گھر والوں میں سے بھی کسی کی نہ سنتے تھے بلکہ جو کچھ کوئی کہتا تو ابدان کر اسکے خلاف کرتے اور تکلیف اٹھاتے۔ بھائی بھی ان کی مندر سے پریشان ہوتی تھیں مگر ان کی ایک بھی پیش نہ جاتی تھی۔ بچاری خاموشی سے سارے گھر کا کام بھی کرتیں، بچوں کی نگرانی اور پردیش بھی اور شوہر کی خدمت بھی۔ اور کیا خیال جو کبھی پیشانی پر شکن تک آئے۔ دو تین انسانے تو چٹائی صاحب نے میرے لئے پہلے ہی سے لکھ رکھے تھے۔

کئی انسانوں کے انہوں نے پلاٹ سنائے۔ سب اچھے، ایک سے ایک عمدہ۔ ایک مادر وار کا دواں سنایا۔ سوانہ کی روحیں۔ یہ سب زیادہ مجھے پسند آیا۔ کہنے لگے: تولاؤ پہلے اسی کو لکھ ڈالیں، اور کاغذ قلم لے کر لکھنا شروع کر دیا۔ میں بیٹھا دانی کھیاں مارتا رہا کیونکہ اس سال وہاں ساری دنیا کی کھیاں آگئی تھیں۔ ایک گھنٹہ میں انہوں نے کئی صفحے لکھ ڈالے پھر بولے: میاں پڑھ لیں چکے۔ لوزرا اب تم قلم لو۔ میرا ہاتھ تھک گیا۔ میں نے قلم سنبھالا۔ وہ بے تکلف بولنے لگے۔ میں لکھتا رہا۔ دو تین صفحے لکھ کر میں نے کہا: بس جی میں تو لکھ چکا مجھے تو نیند آرہی ہے۔ مرغی کھانے کھلاتے ہو تو سونے بھی دور کہنے لگے: اچھا تو چھروانی لگا کر سو رہے ہو عصر کے وقت انہوں نے جگایا۔ کیا آج جائے نہیں پیر گے؟ اٹھنا پڑا، بولے: امنا ختم ہو رہا ہے۔ رات تک ختم ہو جائیگا۔ میں تو چارپائی کرکسی کے ساتھ مل گیا۔ مرزا صاحب بیٹھے کھتے رہے۔ چراغ جلے گھر میں بیچیا توڑے خوش خوش بیٹھے ہوئے تھے۔ کہنے لگے: تو بھی یہ افسادہ اور کوئی چالیس فل ایکپ کا پلندہ میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے کہا: شائبہ ہے مرزا صاحب آپ کی موت کو۔ بس کل صبح کی گاڑی سے میں چلا جاؤں گا۔ جانے کے نام سے ان کا منہ

اُتر گیا۔ کہنے لگے: نہ جانے کیا بات ہے تم آجاتے ہو تو مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں بیمار نہیں ہوں۔ کل نہ جاؤ، ہم تمہیں دوا ملنے اور کھ دینگے۔ انہوں نے یہ بات کچھ ایسے اندازہ ناک لہجے میں کہی کہ میرا دل بھر آیا۔ میں نے کہا اچھا پرسوں چلا جاؤں گا۔ بچوں کی طرح خوش ہونے لگے۔ مجھے محو طی دیر بعد خیال آیا کہ میرے پاس چٹائی صاحب کے تقریباً سو صفحے کے مضامین تو بڑی جائیں گے، اگر سو صفحے کے اندر ہو جائیں تو چٹائی نمبر ہی کیوں نہ چھاپ دیا جائے۔ اتنے بڑے مضمون نگار اور ایسے پیارے دوست کی ایک اچھی یاد گاری قائم ہو جائے گی۔ میں نے ان سے کہا کہ مرزا صاحب! تو پھر آپ یوں کیجئے کہ کل تو آپ مجھے جو کچھ لکھ کر دے سکیں دے دیں، اس کے بعد پندرہ میں دن میں مجھے چند مضامین اور لکھ دیجئے میں چٹائی نمبر چھاپے دیتا ہوں۔ یہ تجویز انہیں پسند آگئی۔ پوچھا: یک بھی جانے گا؟ میں نے کہا: نہ کہنے کی کوئی وجہ نہیں کہنے لگے: ایک ہفتے میں تمہیں سب مضامین پہنچ جائیں گے۔ میں نے چند تجویزیں انہیں بتائیں کہ اس طرح کے مضامین ضرور لکھنے خلاف ایک ادھ غناک افسادہ، دو ایک مگالے یا ڈرامے اور ایک مضمون ہے کہ میں مضمون کیسے لکھتا ہوں: کہا: یہ سب ہو جائے گا۔

اگلے دن دو مضمون تو انہوں نے لکھ کر دے دیے اور بیسیوں پلاٹ سنائے۔ پھر کہنے لگے: کھتے کھتے میرا ہاتھ تھک جاتا ہے۔ اگر کوئی شارٹ ہینڈ میں کھنے والا مل جائے تو میں کئی بول بول دوں:

اگلے دن صبح سویرے میں اٹھ بیٹھا۔ بستر لپٹنے کا ارادہ کر رہا تھا کہ مرزا صاحب آگئے۔ افسردگی جبرے سے ظاہر تھی۔ کہنے لگے: اسے بھی سنتے ہو آج اور نہ ٹھہراؤ۔ سارے مضامین ساتھ ہی دیتے جاؤ؟ دل کٹ گیا ان کے اس غلوں کو دیکھ کر۔ میں نے کہا: اگر آپ کو میرے ٹھہر جانے سے خوشی ہوگی تو میں مزہ ٹھہر جاؤں گا، مگر مجھے یہ گوارا نہیں کہ آپ میرے لئے مرتے رہیں۔ پندرہ دن میں تو یہ مضامین کھے جائیں گے جو میرے پاس میں۔ باقی آپ

پھر بھیجے رہے گا۔ بولے۔ ارے بھئی تم نہیں جانتے کہ ہوتا ہے یہاں ہونے سے میری کیا کیفیت ہے۔ سچ کہتا ہوں میں بالکل تندرست ہو گیا ہوں۔ بھوک لگنے لگی، غوراک دگنی ہو گئی۔ جی چاہتا ہے کہ لکھنوں اور لکھنوی رجوں میں اس وقت سے ڈر رہا ہوں کہ تم چلے جاؤ گے تو مجھ سے ایک لفظ بھی نہیں لکھا جائے گا اور پھر بیماری مجھے دبوچ لے گی۔ میں نے ان کو بہلانے کے لئے کہا۔ اب تو آپ پہلے سے بہت اچھے ہیں۔ میں دلی جا کر چند یونانی مرکبات آپ کو بھجوں گا، ان سے وہی سہی کمزوری بھی جلدی رہے گی۔ مگر وہ بھیک سی منی ہنس کر رو گئے اور بولے۔ بس تو آج تم نہیں جا رہے؟ میں نے کہا۔ نہیں؟ جلدی جلدی بھائی سے جا کر کہا۔ شاہ صاحب آج نہیں جا رہے۔ آج انہیں جو دھ پور کی سیر کرائی جائے گی۔ ذرا ٹکڑا ناشتہ کر دو آج۔ ناشتے کے بعد کسی دوست کی کار منگوائی۔ شہر کا ایک چکر اس میں لگایا پھر ایک پرانا قلعہ دکھایا۔ ایک نیا محل تیار ہو رہا تھا، وہ دکھایا۔ ایک عرصے تھے ان سے ملوایا۔ دوپہر کو گھر آئے کھانا کھلایا۔ باتیں کرتے کرتے میں تو سو گیا اور انہوں نے اتنی دیر میں دو چھوٹے چھوٹے مضمون لکھ لئے۔ کہنے لگے۔ آج رات کو تمہیں گانا بھی سونایا جائے گا۔ میں نے کہا۔ آپ کو تو اس سے نفرت ہے۔ بولے۔ تمہیں تو نہیں ہے۔ ایک ہندو پکا گانا گاتا ہے۔ اسے بلوایا ہے۔ وقت اچھا لگتا۔ صبح ناشتہ پر پھر کچھ روکنے کی تہدید اٹھائی جی کہ بھائی نے کہا۔ کیوں آپ انہیں پریشان کرتے ہیں۔ گھر والے پریشان ہوں گے کہ تین دن کو کہہ کر گئے تھے، آج چھ دن ہو گئے۔ کہنے لگے۔ ارے صاحب یہ کسی کے ذکر تو میں نہیں کر ان کی حاضری ہو۔ ہم یہاں سے ان کے گھر تار دیئے دیتے ہیں۔ انہیں آخر کس بات کا فکر ہے؟ بھائی شاید کچھ اور کہیں مگر بیچ میں مرزا صاحب کا چھ سال کا بچہ تھوڑا بڑا۔ اتل یہ دلی میں کیا کرتے ہیں؟ بھائی نے کہا۔ کچھ بھی نہیں۔ بچے نے کہا۔ تو پھر کھاتے کہاں سے ہیں؟ ہم سب منہ پڑے اور وہ بات بھی اڑ گئی۔ چلتے وقت مرزا صاحب نے کہا۔ وعدہ کر دو کہ پھر جلدی آؤ گے۔ میں نے کہا۔ جب آپ یاد فرمائیں گے حاضر ہو جاؤں گا۔

نواب صاحب جادوہ خیر نہیں کب سے چٹائی صاحب کی قدر دانی پر مائل تھے۔ کچھ عرصہ بعد سنا کہ نواب صاحب نے انہیں جادوہ بلا کر چیت جج بنا دیا۔ مرزا صاحب نے جادوہ بلوایا۔ میں وہاں بھی گیا۔ بنایت عالی شان کو مٹی انہیں ملی ہوئی تھی۔ چٹائی صاحب بہت بڑے عہدہ دار تھے اور نواب صاحب کے مزاج پر بھی چڑھے ہوئے تھے۔ مجھے کہا کہ نواب صاحب کب لو گے؟ میں نے کہا۔ میں اتنے بڑے آدمیوں سے نہیں ملتا جن سے مل کر مجھے ذلت محسوس ہو۔ مرزا صاحب نے کہا۔ ارے بھئی تمہارے دادا کے تو بڑے قدر دان ہیں یہ نواب۔ میں نے یہاں لوگوں سے سنا ہے کہ نواب صاحب ایک دفعہ ایسے بیمار پڑے کہ ان کے جینے کی آس نہ رہی۔ انہوں نے خواب میں دیکھا کہ کوئی بزرگ کہہ رہے ہیں۔ مولوی نذیر احمد کا ترجمہ قرآن شائع کرو، تم اچھے ہو جاؤ گے۔ انہوں نے تمہارے والد سے اجازت منگوائی اور دو جلدوں میں صرف ترجمہ اپنے چھاپہ خانہ سے شائع کیا اور واقعی اچھے ہو گئے۔ تو وہ تم سے مل کر بہت خوش ہوں گے۔ میں نے کہا۔ اور کچھ خیرات بھی مجھے دیں گے۔ مرزا صاحب نے کہا۔ تو پھر کیا ہوا؟ میں نے کہا۔ مجھے معاف فرمائیے، میں تو صرف آپ سے ملنے آیا ہوں۔ میکے تو نواب یا بادشاہ جو کچھ میں آپ میں۔ مگر مرزا صاحب نے میری اس بات کو کچھ پسند نہیں کیا اور دل میں شاید کچھ ناراض بھی ہوئے۔

جادوہ میں مرزا صاحب کی صحت اور بھی زیادہ خراب رہنے لگی۔ وہاں کی مطلوب آب و ہوا سے ان کی سانس کی شکایت اور بڑھ گئی اور صحت گرتی ہی چلی گئی۔ شاید مشکل سے دو سال جاوہیں رہے ہوں گے، ڈاکٹروں نے مشورہ دیا کہ آپ جو دھ پور واپس چلے جائیں ورنہ آپ یہاں ہیبت جلد مر جائیں گے۔ مرزا صاحب بیماری کا عذر کر کے جو دھ پور چلے آئے اور یہاں سے استعفیٰ بھیج دیا۔ وکالت کا کام پھر شروع کیا مگر بدن میں جان نہ ہونے کی وجہ سے وکالت محض ہی رہی۔ اس لئے اپنی کتابیں چھاپنے کا کام خود شروع کر دیا تھا۔

اب سے کوئی پچاس سال پہلے مولوی نذیر احمد صاحب نے ایک کتاب اُپہات لکھی تھی۔ یہ کتاب ایک دریدہ ذہن پادری کی کتاب کے جواب میں لکھی گئی تھی۔ اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر بعض بڑے بیہودہ اعتراضات کئے تھے جن میں خاص طور پر اذواج مطہرات کے سلسلے میں ناگفتہ بہ باتیں کہی گئیں۔ اس کتاب کا ایک جواب سرسید احمد خاں نے لکھا تھا اور ایک مولوی نذیر احمد نے۔ یوں تو یہ کتاب شروع سے آخر تک ایک علی اور تاریکی کا کتاب ہے اور اپنے مواد کے لحاظ سے نہایت قابلِ قدر بھی۔ لیکن مولوی صاحب نے احترام کے الفاظ کسی نام کے ساتھ اس میں نہیں لگائے ہیں اور بعض جگہ فقرے بھی ایسے لکھ گئے ہیں جو زبان کے اعتبار سے چاہے کتنے ہی نکالی کیوں نہ ہوں، رسولِ مقبولؐ اہل بیت کے ادب و احترام کے لحاظ سے قابلِ اعتراض سمجھے گئے۔ مولوی صاحب میں پیرایہ بیان کا جواز یوں پیش کرتے تھے کہ چونکہ ایک عیسائی پادری اس کتاب کا مخاطب ہے، اس لئے ان کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ یہ توضیح صحیح ہو یا غلط یہاں اس سے بحث نہیں۔ ہوا یہ کہ ہمارے علماء نے اس کتاب کو سوختی اور مولوی صاحب کو کافر قرار دیا۔ مسلمانوں کے ایک بڑے ذمہ دار لیڈر نے رفیعِ مشرق کے لئے اس کتاب کے سارے نسخے مولوی صاحب سے اپنی تحویل میں لے لئے۔ اور مولوی صاحب کی بغیر اجازت انہیں علماء کے جلسے میں لے جا کر جلوہ دیا۔ قصہ مختصر اس ناگوار واقعہ کے بعد مولوی صاحب تین چار سال زندہ رہے مگر انہوں نے ایک لفظ بھی نہیں لکھا۔ شامت اعمال اس کتاب کا نسخہ کہیں سے میرے ہاتھ لگ گیا اور میں نے یہ سوچ کر کہ ایک اچھی کتاب سے مسلمان کیوں محروم رہیں، اسے جوں کا توں چھاپ دیا۔ اس کا چھپنا تھا کہ پھر ہمارے علماء نے اسے خلافتِ تحریک شروع کر دی۔ حکومت پر زور ڈالا کہ کتاب ضبط کر لی جائے۔ حکومت کو بھلا کیا غرض پڑی تھی کہ خواہ مخواہ اس جھگڑے میں پڑے؟ جب ادھر سے کامیابی نہ ہوئی تو مجھ پر بزرگوں سے دباؤ ڈالایا گیا۔ یہ بھی ناکام رہا تو قتل کی دھمکیاں دی گئیں۔

اور ہر شہر میں اور دلی میں اس کے خلافت جلسے ہونے لگے۔ چٹائی صاحب نے مجھے جودھ پور سے لکھا کہ ساری کتاب مجھے بھیج دو اور اعلان کر دو کہ کتاب میرے پاس ہے جس میں جہت ہو مجھ کے لئے۔ میں نے انہیں دوسو جلدیں بھیج دیں کہ محفوظ ہو جائیں اور کتاب کی اشاعت روک دینے کا اعلان کر دیا۔ مسلمانوں نے مجھے نہ صرف معاف کر دیا بلکہ خوش بھی ہوئے کہ جلد غلطی انسان ہی سے ہوتی ہے۔ یہ کیا کہے کہ کتاب کی اشاعت بند کر کے اسنے اپنا مالی نقصان کر لیا۔ ادھر مرزا صاحب کی مندی طبیعت نے زور مارا اور انہوں نے ایک مرسلہ "الغلب" لاہور میں چھپوا دیا کہ "اُپہات الافر شاذلہ" کے پاس اب نہیں ہے، میرے پاس ہے جس میں جہت ہو مجھ کے لئے، بلکہ مسلمانوں کو چاہئے کہ مجھے کاٹ کر میرا پلاؤ پکائیں اور ٹٹاؤں کو کھلا دیں۔ اس کے چھپتے ہی میں آگ ہی تو لگ گئی۔ پندرہ دن بعد مرزا صاحب کے خط سے معلوم ہوا کہ جودھ پور کے مسلمانوں نے ان کے گھر کو گھیر لیا اور زبردستی ان سے ساری کتابیں لے گئے۔ اس کے بعد ایک دن بکھری جارہے تھے تو دو چار بد معاشوں نے ان پر لٹھیوں سے حملہ کیا اور ان کے ایک ہاتھ میں سخت ضرب آئی۔ مرزا صاحب نے لکھا: "بھائی بڑی رسوائی ہوئی۔ فوجت یہاں تک پہنچی کہ کیا تو مسلمانوں کے جلسے عام میں توبہ کرو اور اقرارِ اسلام کرو ورنہ تم کا فر ہو اور قتل کر دیئے جاؤ گے۔ سارے شہر میں آگ بھیلی ہوئی تھی۔ لاکھوں میں سے کہتا ہوں کہ کتاب میں نے نہیں لکھی، دلی والے نذیر احمد نے لکھی تھی مگر سب یہی کہتے کہ نہیں تم نے لکھی ہے اور اس میں تم نے سب کو گالیاں دی ہیں۔ چنانچہ مصلحت اسی میں سمجھی کہ اپنے آپ کو یہاں کے علماء کے حوالے کر دوں۔ علماء مجھے ایک بڑے جلسے میں لے گئے۔ مجھ سے سب کے سامنے توبہ کرائی۔ مجھے کلمہ پڑھوایا اور دوبارہ مجھے شرفِ اسلام کیا۔ تب کہیں جان بچی۔ خیر مجھے اس تکلیف اور رسوائی کا بھی اتنا افسوس نہیں، مگر بے حارِ جع ہوا اور شرم آئی یہ دیکھ کر کہ وہ دوسو جلدیں جو تم نے مجھے بھیجیں تھیں وہ مجھ سے مولوی زبردستی چھین لائے تھے، اس جلسے میں جلد ہی

گئیں۔ انہوں نے کہیں میں سال میں مسلمانوں نے کوئی ذہنی ترقی نہیں کی۔

ایک دفعہ مرزا صاحب کا سخت اصرار ہوا کہ خود بھی آؤ اور بھالی کو بھی لے آؤ۔ تعمیل ارشاد کی گئی۔ اب کے جو انہیں دکھانا بڑا دکھ ہوا۔ ان کے پاؤں رہ گئے تھے اور چلنے پھرنے سے مسدود ہو گئے تھے۔ بخار ہر وقت رہتا تھا۔ کھانسی بہت بڑھی ہوئی تھی۔ سونکھ کر تاق ہو گئے تھے۔ مگر دماغ اسی طرح روشن اور مزاج اسی طرح بشارت تھا۔ خوش تو ہمیشہ ہی ہوتے تھے۔ اب کے بہت خوش ہوئے۔ بولے: ”دیکھو! ابھی تم آئے ہو اور ابھی بیماری بیماری جانی تھی۔ مزے مزے کی باتیں کہتے رہے۔ منہ نہ بے مہناتے رہے۔ ایک ناول ”شرب“ لکھنا شروع کیا تھا مگر چند باب ہی لکھ سکے تھے۔ اس کے کچھ حصے سنائے اور چھاپنے کے لئے مجھے دیئے۔ رات کو جب دسترخوان بچھا تو کھسک کر ساتھ بیٹھ گئے۔ بھالی و میں سے خفیں کر آپ کچھ نہ کھا لیجے گا۔ کہنے لگے: ”کھاؤں گے ہم ضرور۔ اب ہم بالکل چھپے ہوئے ہیں۔ ہمیں بخار تھوڑی سی۔ مہربانی کہتے جاتے تھے۔ ارے بھئی یہ بھی دو۔“ بھالی بھائی تھیں مگر وہ اپنا کام کئے جاتے تھے۔ کھانا تو خیر ان سے کیا جاتا۔ بخار تھوڑا سا سب کچھ لیا۔ بارہ ایک بجے تک باتیں کرتے رہے۔ صبح جب مرزا صاحب کو دکھا تو ان کی حالت خیر تھی۔ معلوم ہوا کہ سخت بد بھنی ہوئی۔ رات بھر اکتے اٹھ ڈالتے رہے۔ پلٹتے نکل گیا۔ اتنے کمزور ہو گئے تھے کہ آواز بھی نہ نکلتی تھی۔ دو دن میں طبیعت کچھ سنبھل گئی تھی۔ ہم باز اسے گھوم پھر کر آئے تو کتنے کے سہارے پلنگ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ بولے: ”لوے انسانہ تمہارے لئے لکھا ہے۔“ پڑھ کر سنا یا۔ عنوان تھا: ”برخیز کر دل میں منہ رہا“ مرزا صاحب بھی سنتے جاتے تھے۔ نیچے کیا خبری کرے ان کا آخری انسانہ ہے، اور میرے لئے ان کی یہ منی بھی آخری! اگلے دن میں دلی واپس جانا تھا۔ ملاط کو باتیں کرتے کرتے میری بیوی سے بولے: ”آپ کا آنا ایسے وقت میں ہوا کہ میرے پاس کچھ نہیں ہے۔“ پھر ایک اپنا چھپا ہوا لیٹر نام لکھا اور اس پر کچھ لکھ کر انہیں دیا کہ اسے قبول کر لیجئے۔ انہوں نے پڑھ کر میری طرف

برطانیہ مرزا صاحب نے کتاب ”کوتارہ“ کا حق تصنیف ان کے نام منتقل کر دیا تھا۔ میں نے کہا: ”یہ نہیں ہو سکتا۔ یہ آپ کے بچوں کی حق تلفی ہے۔“ کہنے لگے: ”تم خاموش رہو جی۔ تمہیں تھوڑی دیر رہے ہیں۔“ انہیں مانے اور زبردستی وہ کاغذ میری بیوی کے ہاتھ میں رکھ دیا۔

مرزا صاحب کی صحت گرتی ہی چلی گئی۔ ان کے خطوں سے ان کا حال معلوم ہوتا رہتا تھا۔ اس کے بعد ایسے خط آئے شروع ہوئے جو ان کے اپنے ہاتھ کے لکھے ہوئے نہیں ہوتے تھے۔ پھر ایک دن ان کا خط ملا کہ آخری بار آکر مل جاؤ۔ کچھ روپے لئے آنا۔ میں نے روانگی کا تار دیا اور رات ہی کی گاڑی سے چل پڑا۔ اسٹیشن پر ان کے چھوٹے بھائی آئے تھے۔ میں نے پوچھا: ”چنتائی صاحب کا کیا حال ہے؟“ بولے: ”وہ ہے؟“ کچھ میں نہ آیا کہ وہی ہے کا کیا مطلب ہے۔ گھر پہنچے تو دیکھا کہ ان کے حصے کے کمرے میں سناٹا! نہ بھالی نہ بچے۔ ایک کمرے میں پلنگ پر لٹا اور حصے چنتائی صاحب پر تھے۔ پاس کوئی نہ تھا۔ میں نے آواز دی اور سلام کیا تو منہ پر سے لحاف ہٹایا۔ مجھ پر کبلی گر پڑی۔ مرزا صاحب کے بدلے ایک کچھ دکھائی دیا۔ کمر بڑی ڈارمی مونچھیں اور بڑھے ہوئے سر کے بالوں پر ایک رومال بندھا ہوا۔ پیلا چہرہ، ابھی بھی آنکھیں۔ لٹات ہا تو اس میں سے بدبو کا ایک بھبکا آیا۔ پایوں کے نیچے پانی کے پیالے رکھے ہوئے تھے مگر پلنگ پر ٹانگے کے چپوٹے پھر رہے تھے۔ میں رونے لگا۔ وہ بھی آب دیدہ ہو گئے۔ میں نے کہا: ”میرے کیا حالت ہو گئی؟“ بولے: ”بس خستہ کجھو۔“ پھر ایک دم سے سکڑے اور گراہتے ہوئے بولے: ”ارے ارے آپ کو دیکھئے۔“ اور لٹان میں سے ایک چپوٹا چٹکی میں پکڑ کر مجھے بھینکا۔ ”مرنے سے پہلے یہ اپنا حصہ لینے چلے آئے؟“ اتنے میں اندر کے رخ کا ایک دروازہ کھلا اور ان کی والدہ اندر آئیں۔ بولیں: ”نئے کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے؟“ مرزا صاحب نے کہا: ”یہ پٹا بد صاحب آئے ہیں، انہیں پہلے چائے پلندے۔“ امان چلی گئیں تو ان کی

باتوں سے معلوم ہوا کہ اب صرف اماں ہی ان کا خیال رکھتی ہیں۔ ماسٹ، اللہ بھراؤ گھر
تھا مگر کوئی ان کے پاس نہ آتا تھا۔ میں نے کہا: بھائی اور بچے کہاں ہیں؟ بولے: دام پورہ
میں نے کہا: وہ کیوں؟ کہنے لگے: بیوی کو میری خدمت کرتے کرتے خود دق ہو گئی۔ میں
نے ان سے بار بار کہا کہ تم یہاں سے چلی جاؤ ورنہ تم بھی مر جاؤ گی۔ مگر وہ نہ مانیں۔ جب میں
نے دیکھا کہ میں تو مر رہا ہوں اور اگر یہ نہ چلی گئیں تو یہ بھی مر جائیں گی، تو میں نے ان سے
کہا: اگر تم یوں نہیں جاؤ گی تو ہم تیس طلاقیں دے دیں گے۔ وہ پھر بھی نہ گئیں۔ میں نے ان
سے کہہ دیا کہ آپ کو ہم نے طلاق دے دی، آپ یہاں سے تشریف لے جائیے تو انہوں نے
کہا آپ کے طلاق دینے سے کیا ہوتا ہے۔ ہم نے تو طلاق نہیں لی۔ ہم یہاں سے نہیں
جائیں گے۔ آخر میں نے تنگ آکر ان کے میکے والوں کو خط لکھا کہ اپنی لڑکی کو آکر لے جاؤ
میں نے اسے طلاق دے دی ہے۔ خط کے پہنچنے ہی ان کا بھائی آدھکا اور زبردستی اپنی
بہن کو یہاں سے لے گیا۔ میں نے کہا: یہ آپ نے اچھا نہ کیا۔ ساری عمر کی خدمت کا آپ
نے یہ صلہ دیا انہیں؟ کہنے لگے: بھائی اگر وہ یہاں رہتیں تو واقعی مرحا میں۔ ان کے بچانے
کی اور کوئی صورت ہی نہیں تھی، اور ہاں سنو، اصل میں طلاق ہوئی نہیں ہے مگر ان کے گھر
والوں کو میں جانتا تھا کہ ایک خط میں ہی آکر لے جائیں گے۔ بیوی نے بہت کہا بھی یہ طلاق
نہیں ہے مگر ان کے بھائی نے کہا: جب انہوں نے میں لکھ کر یہ بھیج دیا تو اگر نہیں ہوئی
تب بھی ہو گئی۔

اس کے بعد ان کی اماں اور بھائیوں اور عصمت چٹائی سے باتیں کرنے پر معلوم ہوا کہ
بیاری نے مرزا صاحب کے دماغ پر عجب طرح کا اثر ڈالا ہے کہ انہیں دوسروں کو تکلیف
پہنچا کر رنٹھاتا ہے۔ مثلاً بھائیوں بھائیوں کو لڑوا دیں گے۔ کسی پر چڑی کا الزام لگا دیں
گے۔ طبیعت سے گھر کر کوئی ایسی بات کرینگے کہ دو آدمی اٹھ جائیں۔ ہم سب نے تنگ
آکر ان کی طرف جانا ہی چھوڑ دیا۔ بس ماں کی ہی مانتا ہے جو برداشت کر رہی ہے۔ میں

نے کہا: مگر اب تو ان کا آخری وقت ہے۔ کتنے دن جینیں گے بھارے۔ مگر سارے
بھائی بہن یہی کہتے تھے کہ یہ نہیں مرے گی۔ کتنی ہی دفعہ ہر چکا ہے کہ مٹے بھائی مرے
ہیں، مٹے بھائی مر رہے ہیں۔ سب بھاگے بھاگے گئے۔ اور وہ نہ مرے نہ دوسے پھر
اچھے خالص ہو گئے۔ اس گھر میں تین دن رہنا مجھے اجیرن ہو گیا عجیب بے کسی کی زندگی
تھی۔ گرم گرم بخار چڑھتے، پٹٹا جھلستا رہتا۔ ہڈیاں تک سوکھ گئی تھیں۔ کھانسی کے ماتے
سیٹے میں سانس نہ سہاتا تھا۔ پاؤں بالکل بے کار ہو چکے تھے۔ مگر دماغ روشن تھا۔
کوئی تیماردار نہیں۔ پیسہ کوڑی پاس نہیں۔ نہ جانے کس وقت دم نکل جائے۔ گھر لے
تو مطمئن ہیں کہ یہ مرنے کی نہیں! میں نے جی میں کہا: اللہ تیری شان ہے۔ یہ وہ
شخص ہے جس نے دنیا کو ہنسایا اور مرنے کے بعد بھی ہنسنا رہے گا۔ اور اس مذاپ
میں مبتلا! تو ہی اپنی مصیحتوں کو خوب جانتا ہے: جب میں ان سے رخصت ہونے لگا تو ہاتھ
بڑھایا اور میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ میں رو رہا تھا۔ وہ بھی رو رہے تھے۔ میں نے کہا
"یہ روپے رکھ لیجئے۔ پوچھنے لگے: کہتے ہیں؟ میں نے کہا: دو سو میں۔ اگر زیادہ کی ضرورت
ہو تو میں دلی پہنچ کر اور بھیج دوں گا۔ بولے: بہت ہیں۔ بچکے کے نیچے رکھ دو۔ خدا حافظ کہہ
کر میں آنسو پونچھتا باہر نکل آیا۔ پھر ان کی صورت دیکھنی نصیب نہیں ہوئی۔ شاید دو ہفتے
گزرے ہوں گے کہ ان کے انتقال کی خبر ملی۔ میں نے کہا: تو بھی وہ مر گیا جو مرتا نہ تھا۔

إِنَّا لِلّٰہِ وَإِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُونَ؟

میراجی

دلی اور لاہور ہمارے لئے گھر انگن تھا۔ جب جی چاہا منہ اٹھایا اور چل پڑے۔ کھانے دانے سے فارغ ہو رات کو فریئر میل میں سوار ہوئے اور سو گئے۔ آنکھ کھلی تو معلوم ہوا کہ کچھ دیر لاہور پر کھڑی ہے۔ سال میں کئی کئی پھیکر لاہور کے ہو جاتے تھے۔ لاہور ادیبوں کی منڈی تھا۔ سرسید نے انہیں زندہ دلاں پنجاب کہا اور واقعی یہ معلوم ہوتا تھا کہ اس خطے میں زندگی اُلتی ہے اور گنگنائی گاتی پھرتی ہے۔ کتنا خلوص تھا یہاں کے لوگوں میں۔ اور کتنی محبت! ٹوٹ کر ملتے، ہاتھوں ہاتھ لیتے اور سر آنکھوں پر بٹھاتے۔ ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بنے تھے۔ ان میں تیر میر نہیں آئی تھی۔ ادیب اور شاعر نے ادیب و شاعر ہی تھے۔ وہ جو کسی نے کہلے کر آرٹسٹ کا کوئی مذہب نہیں ہوتا، اس کی تصدیق لاہور ہی میں ہوتی تھی۔ اور سچ بھی ہے، آرٹسٹ کا مذہب تو آرٹ ہی ہوتا ہے۔ اب کی مجھے خبر نہیں، یہ کوئی سترہ اٹھارہ سال ادھر کی باتیں ہیں۔ اب تو زمین آسمان ہی بدل گئے تو بھلا ادب و شعر کی قدر کیوں نہ بدلی ہوں گی؟ خیر کچھ ہو گا۔ یہ وقت اس کجٹ میں پڑنے کا نہیں۔

ہاں تو چھ وقت تھے، اچھے لوگ تھے۔ اُن سے مل کر جی خوش ہوتا تھا، ایک بار ملے دوبارہ ملنے کی ہوس! اور سچ تو یہ ہے کہ ان میں سے بعض کے ساتھ برسوں کی بھائی رہی اور جی نہیں بھرا۔ بلکہ ان سے بے طے چین نہیں پڑتا تھا۔ بے غرض ملتے، جی کھول کر ملتے، جی

طبیعتیں تھیں۔ بعض دفعہ بڑی ناگوار باتیں بھی ہو جاتیں مگر کیا مجال جو آنکھ پر ذرا بھی میل آجائے۔ تم نے ہمیں کہہ لیا ہم نے تمہیں کہہ لیا۔ ایلو دل صاف ہو گئے۔ اچھے لوگوں میں یہی ہوتا ہے۔ زمانہ سدا ایک سا نہیں رہتا۔ جب تک بندھن بندھا ہوا ہے بندھا ہوا ہے۔ جب ٹوٹا ساری تیلیاں بکھر گئیں۔ جو دم گذر جائے غنیمت ہے۔ اب وہ دن جب بھی یاد آتے ہیں تو دل پر سانپ ساوٹ جاتا ہے یہی کیا کم عذاب تھا کہ ایک دوسرے سے بچھڑ گئے۔ اب ان کی سناوٹی سننے کو کہاں سے پتھر کا دل لاؤں۔ بٹھے مرے، انہیں تو مرنا ہی تھا۔ میرنا صر علی مرے، ناصر نذیر فراق مرے۔ میرا تر علی داستان گو مرے، طاہرہ شاد قادی مرے، مولانا عنایت اللہ مرے، کس کس کو گناؤں! ایک ہو تو بتاؤں۔ انہوں نے اچھی گزاری اور عمر طبعی کو پہنچ کر مرے۔ مگر جوانوں کا مرنا قیامت ہے۔

ابیلہ رفیع، ہنس مکھ چنمائی، عجبہ اسناد نگار رفیق حسین، اب آخر آخر میں روانی اختر اور اب پراسرار میراجی! ہائے کیسا کڑیل جوان تھا، یہ کیسے ٹوٹ گیا؟ ہونہ ہوا سے تو دلنے کی نذر کھا گئی۔

گر پیر نو سالہ میرد عجبے نیست!

این باہم سخت است کہ گویند جوان مُرد

مجھ سے خبر آئی ہے کہ میراجی کی ہسپتال میں مر گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ بے کسی کی موت! ماں، باپ، بھائی بہن، دوست احباب سب کے ہوتے ساتے پردیس میں بے کسی کی موت! ع

آسمانِ راحت بود گر خوں مبار دہر زمین

لیکن نہیں۔ میں تو جذبات کی رومی بہہ گیا۔ یہ تو ہوتا ہی تھا۔ اگر یہ نہ ہوتا تو تعجب ہوتا۔ جویوں نہ ہوتا تو میراجی کی عظمت میں فرق آجاتا۔ اس کی عظیم شخصیت کا ایسا ہی ہونا انجام ہونا چاہئے تھا۔ عبرتناک اُس کے لئے نہیں ہمارے لئے۔ زمانے کی یہی ریت ہے۔

رونا اس کا ہے کہ وہ عظیم شاعر، وہ عظیم نقار، وہ عظیم حسن کار اب ہم میں نہیں ہے۔ اب وہ وہاں ہے جہاں ہماری آرزوئیں رہتی ہیں۔

حق منفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

موت نے اُسے کس قدر پیارا بنا دیا ہے

پیدا کہاں میں ایسے پراگندہ طبع لوگ

افسوس تم کو تیرے صحبت نہیں رہی

سنن تو تنہیک یاد نہیں، ہاں پندرہ سولہ سال ادھر کی بات ہے میں حسب معمول لاہور گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ نیرنگ خیال، مگر رہا تھا اور ادبی دنیا ابھر رہا تھا۔ کرشن چندر، اور راجندر سنگھ بیدی خوب خوب کھ رہے تھے۔ صلاح الدین احمد اور میراجی کی ادوات میں "ادبی دنیا" اس نفاست سے نکل رہا تھا کہ دیکھنے دکھانے کی چیز ہوتا تھا۔ میراجی کی شاعری سے مجھے کچھ دلچسپی تو نہیں تھی مگر ایک عجوبہ چیز سمجھ کر میں اسے پڑھ ضرور لیتا تھا۔ اُسے سمجھنے کی اہلیت نہ تو اُس وقت تھی اور نہ اب ہے۔ اس کے مختصر سے مختصر اور طویل سے طویل مصرعے خواہ مخواہ جاذب نظر ہوتے تھے۔ چھوٹے سے چھوٹا مصرعہ ایک لفظ کا اور بڑے سے بڑا مصرعہ اتنا کہ ادبی دنیا کے جہازی ساز کی ایک پوری سطر سے نکل کر دوسری سطر کا بھی آدھا پونا حصہ دہا لیتا تھا۔ خیر تو مطلب و مطلب تو خاک کچھ میں آتا نہ تھا۔ البتہ میراجی کی نظم میں وہی کشش ہوتی تھی جو ایک متے میں ہوتی ہے مگر ان کی نثر میں بلا کی دل کشی ہوتی تھی، مشرق کے شاعروں اور مغرب کے شاعروں پر انہوں نے سلسلے دار کئی معنائیں لکھے تھے اور سب کے سب ایک سے ایک بڑھ چڑھ کر۔ اس کے علاوہ ادبی جائزے میں جس وقت نظر سے میراجی کا ملاحظہ بہت کم سخن فہم اس حد کو پہنچتے۔ ہاں تو میں لاہور گیا تو مال روڈ پر ادبی دنیا کے دفتر بھی گیا۔ مگر میں داخل ہوا تو صلاح الدین احمد نظر نہیں آئے۔ سامنے ایک عجیب وضع کا انسان بیٹھا تھا۔ زکین چھوٹی برہنہ کھلی

پیشانی، بڑی بڑی آنکھیں، سستوں ناک، موزوں دہانہ، کتر والی مونچھیں، منڈی ہوئی ڈاڑھی، تھوڑی سے عزم ٹپکتا تھا۔ نظریہ منشی شاعروں کی طرح آر پار بوجھنے والی۔ خاصی اچھی صورت شکل تھی مگر دہانے کی بات تھی کہ موانست کی بجائے رمیدگی کا احساس تھا۔ گرمیوں میں گرم کوٹ! خیال آیا کہ شاید گرم چائے کی طرح گرم کوٹ بھی گرمیوں میں ٹھنڈک پہنچاتا ہو گا دل نے کہا ہونہ ہو میراجی ہر۔ یہ تو اس شخص کی شاعری ہی سے ظاہر تھا کہ غیر معمولی انسان ہو گا۔ پوچھا "صلاح الدین احمد صاحب کہاں ہیں؟" بولے "کہیں گئے ہوئے ہیں۔ پوچھا "آپ میراجی ہیں؟" بولے "جی ہاں۔ میں نے اپنا نام بتایا۔ تپاک سے ملے۔ کچھ دیر اُن سے دیکھی باتیں ہوئیں۔ اُن کے بولنے کا انداز ایسا تھا جیسے خفا ہو رہے ہوں۔ بچے تھے فقرے ایک خاص لہجے میں بولتے اور چپکے ہو جاتے۔ زیادہ بات کرنے کے وہ قائل نہ تھے، اور نہ انہیں تکلف کی گفتگو تھی۔ پہلا اثر یہ ہوا کہ یہ شخص اکھل کھڑا ہے، داغ چوڑھا ہے۔ مختصر کی بات چیت کے بعد اجازت چاہی۔ باہر نکلے تو میسر سامتی نے کہا "اسے میاں یہ تو ڈاکو معلوم ہوتا ہے۔ اس نے ضرور کوئی خون کیلے، دیکھا نہیں تم نے؟" اسکی آنکھیں کیسی تھیں؟ میں نے کہا "یہ تو اللہ ہی کو معلوم ہے کہ وہ کیلے۔ مگر آدمی اپنی وضع کا ایک ہے۔"

تھوڑے ہی عرصہ بعد اُن سے دوبارہ ملاقات ہوئی۔ اب کے دلی میں۔ ریڈیو پر وہ تقریر کرنے آئے تھے مجھے ملنے میرے گھر آئے۔ جب گئے تو بہت کچھ پہلا اثر زائل کر گئے۔ آدمی تو برا نہیں ہے۔ داغ چوڑھا بھی نہیں ہے ورنہ ملنے کیوں آتا؟ پھر ایک دفعہ اُسے اور بولے کہ "ریڈیو میں ملازمت کے لئے نکلیا ہے۔" مجھے کچھ تعجب سا ہوا کہ یہ شخص ریڈیو میں کیا کرے گا؟ بہر حال معلوم ہوا کہ گیت لکھیں گے اور نثر کی چیزیں بھی۔ تنخواہ ڈیڑھ سو ملے گی۔ میں نے کہا "تنخواہ کم ہے۔ ادبی دنیا میں آپ کو کیا ملتا تھا؟" بولے "تینس روپے۔ میں نے میرے سے کہا بس؟ کہنے لگے "مولانا سے دوستانہ تعلقات تھے۔ میں نے کہا "تو تنہیک ہے۔"

حساب دوستاں در دل "معلوم ہوا کہ بیوی بچے تو ہیں نہیں کیونکہ شادی ہی نہیں کی۔ اپنے خرچے بھر کو ڈیڑھ سو روپے بہت تھے۔ چنانچہ میراجی ریڈیو میں ذکر ہو گئے اور ان سے اکثر ملاقات ہونے لگی اور ان کی نظمیں اور مضامین ساقی میں چھپنے لگے۔ ریڈیو میں اس وقت اچھے اچھے ادیب اور شاعر جمع ہو گئے تھے۔ ن۔ م۔ راشد۔ کرشن چندر، منٹو، چراغ حسن حسرت۔ اوپندر ناتھ اشک، انصار ناہری، میراجی۔ اختر الایمان وغیرہ سب خوب لکھ رہے تھے۔ اور دلی ریڈیو کا طوطی بول رہا تھا۔ راشد صاحب کے مشورے سے میراجی نے دو ایک سوٹ بھی سلوائے تھے مگر انہیں کپڑے پہننے کا کبھی سلیقہ نہ آیا۔ عجیب اولو اولو معلوم ہوتے تھے۔ مارے باندھے سے کہیں کپڑے پہنے جاتے ہیں؟ کچھ مدت بعد میراجی پھر اپنی پرانی دھج پر آ گئے۔ نہایت موٹے اور بھدے ٹیو کا چکن ٹماکوٹ اور اُنکی کا پتلون، جاڑا، گرمی، سب میں ہی گرم لباس چلتا تھا۔

ریڈیو کے مسودات لکھنے میں میراجی کو کافی مہارت ہو گئی تھی اور حسب ضرورت بے تکلف لکھ لیتے تھے۔ گیت ریڈیو میں آکر لکھے اور اتنے کہ ان کا مجموعہ گیت ہی گیت کے نام سے شائع ہوا۔ نشر میں بھی صاحب طرز تھے۔ انداز فکر فلسفیانہ اور طرز بیان انشا پرانہ تھا۔ نظمیں جب کہنے پر آتے تھے تو کئی کئی کہہ لیتے تھے۔ مگر خدا جانے کب کہتے تھے اور کس کیفیت میں کہتے تھے۔ چند نظمیں خود ان سے کھیں تو سمجھ میں آئیں اور بعض خود ان کی سمجھ میں بھی نہیں آئیں۔ غزلیں بھی کہی ہیں اور بہت سُستھری۔

فی البدیہہ بھی کہتے تھے۔ اشعار کے معاملے میں میراجی حافظ مکرور ہے صرف ایک مصرعہ اُن کا چپک کر رہ گیا، وہ بھی اپنے غجب کی وجہ سے۔ اور کچھ نہیں تو اس سے ان کی حاضر و غائے اور قادر الکلامی ضرور ظاہر ہوتی ہے۔ ہم چند دوست چائے پینے کسی ہوٹل میں داخل ہوئے۔ ایک صاحب نے چائے پینے سے انکار کر دیا یہ کہہ کر کہ اتنی تو گرمی پڑ رہی ہے۔ دوسرے صاحب بولے "گرمیوں میں گرم چائے ٹھنڈک پہنچاتی ہے۔ پھر چائے والوں کے مقولوں

پر بات چل نکلی۔ کسی نے کہا "اگر اشعار میں مقولے باندھے جائیں تو بہتر" دوسرے بولے اشعار میں بھی میں مثلاً۔

ایک پیسہ مال سے لو + اتنی چائے باپ کو دو
یاس + یہ شخص اندر اس کا بھائی + پیتے ہیں روزانہ چائے
بھائی کے قاتلنے چائے پر سب سر دھننے لگے۔ پھر کسی نے کہا "گرمیوں میں گرم چائے ٹھنڈک پہنچاتی ہے"۔ بھی دراصل چائے والوں کا مصرعہ ہی ہو گا۔ کسی نے کہا یہ تو مصرعہ کسی طرح بن ہی نہیں سکتا۔ میراجی اب تک چپکے بیٹھے تھے۔ بولے۔ مصرعہ تو بن سکتا ہے۔ ع۔

گرمیوں میں گرم چائے ٹھنڈک پہنچاتی ہے۔ ڈک
اس پر خوب تہقید پڑا۔ واقعی نہ تو کوئی لفظ بڑھا اور نہ گھٹا۔ ہلکی لگی نہ پھٹکری ننگ چوکھا آگیا۔

میراجی مشاعروں اور مجلسوں میں نہیں جاتے تھے۔ یوں بھی وہ بہت کم آمیز تھے اور بڑے آدمیوں سے ملنا تو غار کھتے تھے۔ بڑے آدمیوں کے بڑے پن کے وہ کبھی قائل نہیں ہوئے اور کسی سے معروب ہونا تو وہ جانتے ہی نہیں تھے۔ انسروں کے بلے میں وہ کہتے تھے کہ یہ دفتر میں تو انسر ہوتے ہی ہیں، دفتر کے باہر بھی انسر ہی بنے رہنا چاہیے ہیں۔ دفتر کے ہوٹل تک میں ان کی گرسیاں مخصوص ہیں۔ بخاری کی کرسی پر بیٹھنا سوا اب ہے۔ ادنیٰ مجلسوں میں صدر مقام ان کے لئے خالی رکھے جاتے ہیں۔ انسر جگہ انسر بنا رہتا ہے۔ آدمی کبھی نہیں بنتا۔

میراجی کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ سنا ہے کہ لاہور کی دیاں سنگھ لائبریری وہ چلا چکے تھے۔ دلی آکر ان کے مطالعہ کا شوق غرق نے ناب ہو گیا تھا۔ نشر کی کتابوں میں الف بیلہ کے عاشق تھے۔ اردو صحیح بولتے تھے اور صحیح لکھتے تھے۔ غلطی کی بچ کبھی نہ

کہتے تھے۔ عرومن سے خوب واقف تھے اور جملہ اصنافِ شعر پر حاوی۔ ایک دفعہ ایک اسٹیشن ڈائریکٹر نے ان کے کسی مصرعہ پر اعتراض کیا کہ ناموزوں ہے۔ اُسے تو تقطیع کر کے بتادیا کہ ناموزوں نہیں ہے، باہر نکل کر کئی دن تک اسے گالیاں دیتے رہے کہ اپنے آپ کو افسر تو سمجھتا ہی ہے شاعر بھی سمجھنے لگا۔ میراجی میں چالوسی کی عادت بالکل نہیں تھی۔ اور افسروں کا آگاتا گالینا بھی وہ سخت میوہ سمجھتے تھے۔ افسروں میں راستہ کے بہت گرویدہ اور مدارج تھے یا پھر محمود نظامی کے۔ راستہ نے میراجی کو بہت بچایا۔ اس وقت بھی جب کہ مجھ سمیت رہتے اُن کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔

شراب کی لت خدا جانے میراجی کو کہاں سے لگی! جب لاہور میں انہیں تین سو روپے ملتے تھے تب بھی وہ پیتے تھے۔ اور جب دہلی آئے اور پانچ گنی تنخواہ ملی تو اور زیادہ پینے لگے۔ پہلے رات کو پیتے تھے، پھر دن کو بھی پینے لگے، پھر ہر وقت پینے لگے۔ سوڈا یا پانی ملانے کی ضرورت بھی نہیں رہی تھی۔ یہی بوتل سے منہ لگا کر غاصت چڑھا جاتے تھے۔ جب ریڈیو اسٹیشن پر آتے تو ایک ہاتھ میں کاپیاں اور کتابیں ہوتیں اور دوسرے میں اٹاچی کیس۔ اس میں بوتل رکھی رہتی تھی۔ ذرا دیر ہوئی اور کہیں جا کر پی آئے۔ اس شراب نے میراجی کو تباہ کر دیا اور اُن میں وہ تمام خرابیاں آتی گئیں جو بالآخر انکی اخلاقی موت کا باعث بن گئیں۔ ادھر تنخواہ ملی اور ادھر قمر من خواہوں اور شراب میں ختم۔ پھر ایک ایک سے اُدھار مانگا جا رہا ہے۔ میراجی کے قدر دانوں نے انہیں سنبھالنے کی بہت کوشش کی مگر وہ نہیں مانے اور گرتے ہی چلے گئے۔ پھر یہ نوبت آئی کہ قمر من ملنا بند ہو گیا۔ انہوں نے اپنے مضامین اور نظموں کی کتابیں مرتب کر کے بھیجی شروع کیں۔ اس میں مجھ سے سابقہ پڑا۔ ایک کتاب لے لی، دو لے لیں، گھر پر ہر مہینے یا دوسرے مہینے ایک مجبورے کر پہنچ جاتے۔ میں انکار کرتا اور وہ اصرار میں انہیں سمجھاتا کہ میراجی میں آپ کی کتابیں نہیں چھاپ سکتا، میرے پاس بیسیوں مسودے خریدے ہوئے رکھے ہیں، اُن کے چھپنے

کی نوبت بھی نہیں آتی، کاغذ نایاب ہے۔ مگر وہ کچھ دیکھے بہانے تراشتے کہ مجھے مجبوراً اُن سے مسودہ خریدنا پڑتا۔ کبھی باپ کی بیماری کی خبر سناتے، کبھی بھائی کی تعلیم کی مجبوری بیان کرتے، کبھی کہتے والد کی آنکھیں جاتی رہیں، آپریشن ہو گا۔ میں انکار کرتا تو اتنے ہراساں ہوتے کہ اُن پر ترس آنے لگتا۔ کئی دفعہ انہیں یہ بھی سمجھایا کہ میراجی آپ اپنے مسودے مجھے سستے دے جاتے ہیں۔ آپ کسی اور کو دیجئے۔ تو روپے بھی زیادہ ملیں گے، مگر انہیں صندیتی کر بیس میں کسی اور کو اپنی کتاب نہیں دوں گا۔ میں نے اُن سے ایک ایک کر کے اٹھ مسودے لئے جن میں سے صرف تین شائع ہو سکے۔ باقی دہلی بردہ ہوئے آخری قسط جب انہوں نے روپوں کی مجھے مانگی تو میں نے پوچھا اب کون سا مسودہ باقی رہ گیا۔ کہنے لگے "باتیں" جوتانی میں لکھ رہا ہوں، یہ بھی کبھی ایک کتاب ہو جائے گی۔ بہت حیل و حجت کے بعد میں نے انہیں اس شرط پر روپے دینے کہ آئندہ وہ مجھے کبھی کچھ نہیں مانگیں گے۔ مگر اس کے بعد پھر انہیں روپے کی ضرورت ہوئی تو میں نے صاف انکار کر دیا اور انہیں کچھ سخت سست بھی کہا۔ بہت افسردہ اور نام نہون ہوئے۔ کہنے لگے "الف لیلہ" کا ایک نایاب نسخہ میں جلدوں میں بک رہا ہے۔ ایک ناقد رے کا داد امر گیلی ہے۔ کتب خانے کی کتابیں اونے پونے بیچ رہا ہے آپ ایسا کیجئے کہ وہ جلدیں اپنے پاس گرومی رکھ لیجئے اور ڈیڑھ سو روپے مجھے دے دیجئے۔ میں آپ کو روپے دے کر کتابیں آئندہ چھڑاؤں گا۔ میں نے کہا ایک ہفتہ دوشد۔ بھائی میں گرومی کا ٹٹھا نہیں کرتا مجھے تو تم معاف ہی کرو۔ کیوں رہی یہی دوستی پر پانی پھرتے ہو؟ میں ہتھاراکتنا بڑا قدر دان ہوں۔ اب مجھے اس پر تو مجبور نہ کرو کہ مجھے تم سے نفرت ہو جائے۔ یہ بات کچھ اُن کی سمجھ میں آگئی اور وہ خاموش چلے گئے۔ بس اس کے بعد میراجی نے مجھ سے کچھ نہیں مانگا اور نہ کوئی اور مسودہ لے کر میرے پاس آئے۔ دیکھے اُن سے جب تک وہ دہلی میں رہے برابر ملنا جلنا ہوتا رہا۔ اور اکثر گھر بھی آ جاتے تھے۔

کتابوں کی قیمت کے بارے میں اُن کی ایک خاص مت بھتی۔ مثلاً میں نے کہا یہ کتاب تو بہت چھوٹی ہے اس کے میں دوسو روپے سے زیادہ نہیں دوں گا تو وہ کہتے "دوسو بالکل ٹھیک رستم ہے۔ بائیس روپے دو آئے اور دو پائی اور پچھڑا کچے تاکہ رقم ہمارا ہو جائے۔ یعنی دوسو بائیس روپے دو آئے دو پائی اسی طرح اُن کی سب کتابوں کی قیمتیں بخیر کی گئی تھیں۔ 333/3/3 - 444/4/4 - 555/5/5 روپے اور اچھتے کے غار جو ان کی نظموں کا دوسرا مجموعہ تھا اس کی قیمت 666/6/6 روپے دی گئی تھی۔

میراجی بڑے گندے آدمی تھے۔ وہ اُن میں سے تھے جو کہتے ہیں کہ یا نبلائے دای یا نبلائی چار بجائی۔ انہیں کبھی کسی نے نہنا تے نہیں دیکھا، بلکہ منہ دھوتے بھی نہیں دیکھا۔ بال کٹوانے کے بڑے چور تھے۔ وحشیوں کی طرح ہمیشہ بڑھے رہتے۔ اور اُن میں کبھی تیل نہ ڈالتے اور نہ انہیں بناتے۔ جب دلی آئے تھے تو موکھیں بھی مونڈ ڈالی تھیں۔ ایک دفعہ جانے دل میں کیا سمائی کہ چار ابرو کا صفایا کر گئے میں سادھوؤں کی سی کنٹھی بھی ڈال لی تھی۔ ہمیشہ سنجیدہ صورت بنائے رہتے تھے، انہیں تہقیر مار کر مہنت میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ بائیں اکثر مہنت مہنت کی کرتے مگر خود کبھی نہ مہنت تھے۔ بہت خوش ہوئے تو خندہ دندان فرمایا۔ ان کے غلچہ پن سے بڑی گھن آتی تھی۔ مگر یہ اُن گھناؤنی چیزوں میں سے تھے جنہیں اپنے سے دور نہیں کیا جاسکتا۔ زندگی قلندرانہ اور حرکتیں مجذوبانہ دو چار آدمیوں نے ہی کر ایک کمرہ کہیں باڑے کی طرف لے رکھا تھا مگر رات کو اگر کہیں گھاس میں پڑے تو وہیں سو گئے اور اگر پٹری پر لیٹ گئے تو وہیں صبح ہو گئی۔ ایک دو دن انہیں برسوں کی حال رہا۔

شراب کے نشے میں میراجی کو روتنے کی دھن سوار ہو جاتی تھی اور وہ ایسے بے رحم ہو جاتے کہ تن بدن کا بھی ہوش نہ رہتا۔ ایک دن ہم موری دروازے کے پُل پر سے

آ رہے تھے۔ جب ہنس سادات خاں کے سینا کے آگے پہنچے تو دیکھا کہ ایک عجیب سڑک پر لگ رہا ہے معلوم ہوا کہ ایک آدمی ڈاڑھیں مار کر رو رہا ہے۔ اور دو ایک اسے سڑک پر سے اٹھا رہے ہیں۔ ہم نے سوچا کوئی حادثہ ہو گیا ہے۔ پچاس کے سخت چوٹ آئی ہے اسے دُعا ہسپتال بھیجا جائے۔ اتنے میں اخلاق نے گھبرا کر کہا "بھائی شاہد! یہ تو میرا جی ہے" اور میراجی سڑک پر پڑے رو رہے تھے اور بڑا بھی رہے تھے مگر زبان متابو میں نہیں بھی کہ بات سمجھ میں آئی۔ ایک صاحب جو انہیں اٹھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ بھی جاننے والے ہی تھے۔ ہمیں دیکھ کر اُن کی جان میں جان آئی۔ جھٹ ایک تانگہ منگا کر سب نے اٹھا کر میراجی کو تانگے میں ڈالا مگر وہ پھسل کر پھر نیچے آ رہے۔ دوبارہ انہیں آگے کی سیٹ پر ڈالا اور اخلاق کو ساتھ بھیجا کہ اُن کے گھر پہنچا کر آئے۔ اگلے دن اخلاق نے بتایا کہ میراجی اپنی اماں کے لئے رو رہے تھے۔

یہ اخلاق احمد ریڈیو اناؤنسر تھے اور میراجی کے بڑے مازج۔ میراجی نے اپنی ایک کتاب بھی ان کے نام مثنوی کی ہے۔ دونوں میں بہت اخلاص تھا۔

ایک دن اُن کے چند دوست انہیں گھر گھاڑ کر ایک ستلیق طوائف کے کمرے پر لے گئے۔ وہاں کچھ گانا سنا، کچھ شراب پی اور بیکنے لگے۔ زینے سے اتر کر سڑک پر آئے تو حالت اور بھی خراب ہو گئی۔ سڑک پر لوٹنا اور جینیں مار مار کر رونا شروع کر دیا۔ نظموں کا دوسرا ضخیم مجموعہ سودے کی شکل میں ان کے پاس تھا اُسے اس بُری طرح اچھا لاکر رات کے اندھیرے میں اس کا ایک ورق بھی کسی کے ہاتھ نہ آیا۔ دوستوں نے جو اُن کی حالت دیکھی تو گھبرا گئے۔ لاکھ انہیں چمکارا پچکارا مگر وہ اپنے اوساروں میں نہ آئے۔ اتنے ہی میں پچاس کے چند آدمی گشت کرتے آ گئے۔ دوست بچکے سبم بخود ہو گئے کہ اب آدھہ گردی میں سب کے سب بند ہوتے ہیں۔ بھلارات کے بادہ بچے اس بدنم بازار میں اور اس حالت میں دیکھ کر کون چھوڑے گا؟ مگر اخلاق احمد کے حواس قائم رہے۔ بہت مردانہ قوان کی بھی

جواب دے چکی تھی۔ مگر جب پولیس والوں نے ٹوکا تو اُس نے جراتِ رنداز سے کام لیکر کہا: "بچائے کی ماں مرگئی ہے۔" یہ کہہ کر میراجی کو سمجھانے لگا کہ "ماں باپ سداکسی کے جینے نہیں رہتے۔ صبر کرو صبر۔ چلو اٹھو۔ کوئی دیکھے گا تو کیلے گا۔ اسے بھی تم تو بڑے بڑے نکلے۔ بچوں کی طرح رو رہے ہو۔ دو چلو اٹھو۔ گھر چلو۔ اور ہاں سستری جی کوئی تانگہ ملے تو ادھر بھیج دینا۔" خدا خدا کر کے آئی بلاٹلی اور سب کی جان میں جان آئی۔ نظروں کے دوسرے ٹھوس کے ساتھ اُس مہینے کی تنخواہ کا بقایا بھی میراجی اُسی بازار میں اُچھال آئے۔ چلو۔

جان بچی لاکھوں پائے + خیر سے بدھو گھر کو آئے

صبح انہیں کچھ بھی یاد نہیں رہتا تھا کہ رات کو اپنی جان پر اور دوستوں پر کیا مصیبت توڑ چکے ہیں۔

ایک دن ریڈیو اسٹیشن پر میراجی کو دیکھا کہ جگہ جگہ سے اُن کا منہ سوجا ہوا ہے اور سارے جسم پر زخم ادا ہونے لگے ہوئے ہیں۔ میں نے گھبرا کر پوچھا: "میراجی کیا کہیں گر پڑے۔" بڑے "نہیں" مجھے مارا ہے۔ "آپ کو کہیں مارا؟ آپ تو لڑنا جانتے ہی نہیں۔ کہنے لگے "مجھے سوتے میں مارا ہے اُس نے۔" کس نے؟ "میرا شہبے ایک آدمی پر۔" اور آج تک معلوم نہ ہو سکا کہ اُس بیپوش آدمی کو کس ملعون نے مارا تھا! میراجی کو زیادہ جاننے والوں میں سے بعض یہ بھی کہتے تھے کہ اسے خود نشے میں اپنے آپ کو مارا ہے۔ واللہ عالم بالصواب!

میراجی پر اسراریت اور حیرت کے قائل تھے۔ اُن کی شخصیت بھی اُن کی شاعری کی طرح پُر اسرار تھی۔ دماغ قطع، لباس اور باتوں سے تو وہ پُر اسرار نظری آتے تھے وہ حرکتیں بھی کچھ ایسی کرتے تھے کہ لوگ انہیں حیرت سے دیکھیں۔ مثلاً ایک زمانے میں عربی کے اڈے کے برابر روپے کا گولا ہاتھ میں بردقت رکھتے تھے اور کوئی پوچھتا تھا کہ یہ کیا ہے تو کچھ نہ بتاتے تھے پھر ایک کے دو گولے ہو گئے تھے اور یہ خاصہ ڈیڑھ پاؤ کا بوجھ خواہ مخواہ اُٹھائے پھرتے تھے۔ اسکے بعد ان گولوں پر سگریٹ کی پی چڑھائی جاتی تھی۔ لکھنؤ میں جب میں

نے انہیں آخری بار راستہ صاحب کے ہاں دیکھا تو گولے اُن کے پاس نہیں تھے۔ کھانے میں میٹھا اور ٹنکین ملا کر کھاتے تھے اور دیکھنے والے پر میگوئیاں کرتے تھے۔ بعض جوانیں جانتے تھے انہیں باؤلا کہتے تھے۔ مگر انہیں فراد کھتا تھا۔

آواز بہت عمدہ اور بھاری پائی تھی۔ ریڈیو پر اکثر ڈراموں میں بولتے تھے۔ پنجاب کے رہنے والے تھے مگر اُن کی زبان یا ان کا لہجہ خنکی نہیں کھاتا تھا۔ انگریزی کی استعداد اعلیٰ درجے کی تھی مگر جہاں تک ممکن تھا بولنے سے گریز کرتے۔ بوسیتی سے بچتی تھی۔ لاگ جیسے دھبی سستے تو وجد طاری ہو جاتا اور سر پھوٹنے لگتے۔ سمجھتے خاک نہ تھے۔

مذہب سے میراجی کو کوئی واسطہ نہیں تھا۔ ہندو صنمیت سے انہیں شغف تھا۔ اسی کار چاچا تصور اُن کی شاعری میں بھی جھلکتا ہے۔ بس مسلمان اس لئے تھے کہ ایک مسلمان کے ہاں پیدا ہو گئے تھے۔ جو شخص اخلاقی مضابطوں کی پابندی کرنا بھی ضروری نہ سمجھتا ہو وہ بھلا مذہبی قید و بند کو کیسے گوارا کر لیتا؟ میراجی کے تو دل اور دماغ دونوں ہی کافر تھے۔ میراجی جنہی اعتبار سے ایک گنجلک تھے۔ ابتداً انہیں عورتوں سے رغبت تھی۔ اور یہ کوئی ہندو لڑکی "میرا" ہی تھی جس کی ناکام محبت میں اپنا نام انہوں نے "میراجی" رکھا تھا۔ درنہ اصلی نام تو اُن کا ثنا اللہ تھا۔ خدا جانے استنبا بالید کا انہیں چمکے کہانے لگا کر جیتی نہ چھوڑا اور انہیں کسی جوگ نہیں رکھا۔ وہ اسے فخریہ بیان کرتے تھے اور کہتے تھے کہ اس کی بدولت میری سب تمنائیں پوری ہو جاتی ہیں۔ آپ ایک ایک کام نہ سمجھتے ہیں اور دل میں حسرت لئے رہ جاتے ہیں۔ میں کسی کو دیکھتا ہوں تو اُس کا لطف بھی حاصل کر لیتا ہوں۔ ایک نے اپنے ایک ہم مذاق سے تعارف کرایا تو یہ کہہ کر کہ "یہ بھی دستکار ہیں۔ ان سے جب کہا گیا کہ یہ تو بڑی غلط چیز ہے تو جواب ملا کہ میں سائنٹفک طریقے کا دستکار ہوں۔ اس میں کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ اور دستکاری میں انہیں اتنا غلو تھا کہ قید مقام سے بھی گذر چکے تھے۔ اُن کے پتلون کی بائیں جیب تو بنی ہوئی تھی مگر جیب کا کپڑا غائب تھا۔

میراجی کی سیرت میں بیسیوں خرابیاں آگئی تھیں لیکن طبعا وہ ایک شریف انسان تھے۔ دوستوں کے لئے دانے، دانے، قدمے، ہر طرح خدمت کرنے کو تیار رہتے تھے۔ دانشوروں کے ایک خاص حلقے میں ایک صاحب نے ایک مضمون پڑھا جو پوری اردو شاعری پر حاوی تھا۔ اس مضمون کی بہت تعریف ہوئی۔ اچھے کی بات یہ تھی کہ صاحب مضمون یوں توڑ پھڑے لکھے تھے لیکن انہیں ادب و شعر کا کوئی خاص ذوق نہیں تھا۔ ہمارا ماننا تھا کہ یہ مضمون ان کا نہیں ہو سکتا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ مضمون میراجی کا لکھا ہوا تھا۔ شروع شروع میں جب ان کی شراب نہیں بڑھی تھی وہ روپے پیسے بھی بعض دوستوں کی مدد کرتے تھے۔ تنخواہ میں سے کچھ پس انداز کر کے اپنے والد اور چھوٹے بھائی کو بھی کچھ بھیجتے تھے، اور یہ چھوٹے بھائی وہی صاحب تھے جنہوں نے میراجی کی تمام نظلیں چند پیسوں میں بیچ ڈالی تھیں۔ ہمایہ کہ انہوں نے سارے گھر کی ردی کسی پھیری والے کے ہاتھ دو تین آنے سیر کے حساب سے بیچی اور اس میں میراجی کی وہ دو ضخیم کاپیاں بھی تول دیں جن میں ان کی نظلیں لکھی ہوئی تھیں۔ میراجی نے لاہور کے تمام ردی بیچنے والے چھان ڈالے مگر وہ مجموعے نہ ملنے لگے۔ اس کا انہیں بے حد رنج پہونچا، اتنا کہ انہوں نے اپنا گھر اور اپنے عزیز دل کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیا جس گھر میں ان کے مہر کی یہ توقیر ہو وہ وہاں کیسے رہ سکتے تھے اور جن کے ہاتھوں ان کے حاصل عمر کا یہ حشر ہو بھلا وہ ان سے ملنا کیسے گوارہ کر سکتے تھے؟ گھر تو گھر انہوں نے لاہور ایسا چھوڑا کہ پھر کسی ادھر کا رخ نہیں کیا۔ میراجی کو میں نے کبھی کسی سے باز بانی کرتے نہیں دیکھا۔ وہ تو کسی سے مذاق تک نہیں کرتے تھے۔ ان کا رکھ رکھاؤ ایسا تھا کہ کیا مجال جو کوئی ان سے ناشائستہ بات کرے۔ ادب و آداب ہمیشہ ملحوظ رکھتے۔ ان کی بھونڈی وضع قطع پر بے تکلف دوست چھبتیاں کئے مگر وہ صرف مسکرا کر رہ جاتے اور کبھی الٹ کر کوئی سخت جواب نہ دیتے۔ اس سے یہ ہوتا کہ معترضین خود شرمندہ ہو جاتا۔

عجیب بات میراجی میں یہ تھی کہ ان کی تجلّ خواہیوں کے باوجود سب ان کی عزت کرتے تھے۔ انہیں دیکھ کر اندر سے دل کھتا تھا کہ یہ ایک عظیم انسان ہے اور عزت و احترام کا مستحق۔ نہ جانے اس شخص میں کیا بات تھی کہ اتنی نفرت انگیز یوں کے باوجود دل اس کی طرف کھینچتا تھا۔ ایسا مقناطیسی شخصیت کا انسان میں نے کوئی اور نہیں دیکھا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ ان کا ظاہر و باطن ایک تھا۔ انہوں نے کبھی اپنے عیبوں کو نہیں چھپایا اور نہ کبھی اپنی خوبیوں کو سراہا۔ ریا کاری ان میں نام کو نہیں تھی۔ ان کے لئے خلوت اور جلوت دونوں ایک تھے۔ اخلاقی قدریں انسانی تو سہتی ہی ہیں، ان کے نزدیک مروجہ اخلاق کی کوئی حیثیت نہیں تھی بلکہ وہ انہیں برا سمجھتے تھے اور ان کی تحقیر کرتے تھے۔ یہاں شاید انہوں نے انتقاماً ظاہر کو جی دیا تھا اور ان کا باطن ہی ظاہر بن گیا تھا۔ اور شاید یہی ان کی عظیم شخصیت کا راز ہو!

منٹو

دہلا ڈیل، سوکھے سوکھے ہاتھ پاؤں، میانہ قد، چھپی رنگ، بے قرار آنکھوں پر سنہرے فریم کی عینک، کریم کلر کا سوٹ، سرخ چھپاتی ٹائی، ایک دھان پان سا نوجوان مجھ سے ملنے آیا۔ یہ کوئی چوبیس پچیس سال اُدھر کا ذکر ہے۔ بڑا بے تکلف، تیز طرار، چرب زبان، بولا۔
— میں منٹو ہوں، سعادت حسن۔ آپ نے ہمایوں کا روسی ادب نمبر دیکھا ہوگا۔ اب میں ساقی کا فرانسیسی ادب نمبر نکالنا چاہتا ہوں۔

پہلی ہی ملاقات میں اُس کی یہ ضرورت سے بڑھی بے تکلفی طبیعت کو کچھ ناگوار گزری۔ میں نے اُس کا پانی اُتارنے کے لئے پوچھا۔ آپ کو فرانسیسی آتی ہے؟
بولا: نہیں!

میں نے کہا: تو پھر آپ کیا کر سکیں گے؟
منٹو نے کہا: انگریزی سے ترجمہ کر کے میں آپ کا یہ خاص نمبر ایڈٹ کروں گا۔
میں نے کہا: اپنا پرچہ تو میں خود ہی ایڈٹ کرتا ہوں۔ پھر ساقی کے چار خاص نمبر مقرر ہیں۔ ان کے علاوہ اور کوئی نمبر فی الحال شائع نہیں ہو سکتا۔

منٹو نے دال گلختی نہ دیکھی تو فوراً اس موضوع ہی کو ٹال گیا۔ اور رخصت ہونے سے پہلے مجھے پروانچ کر لیا کہ اگر کسی مضمون کی ضرورت ہو تو معاذ مذہب بھیج کر اُس سے مزکا یا جاسکتا ہے۔

اس دہانے میں منٹو ترجمے ہی کیا کرتا تھا۔ اُس کی کتاب "سمرگوشت" اسیر چھپ کر آئی تھی۔ منٹو سے کبھی کبھی خط و کتابت ہوتی رہی۔ اور اُس کے چند مضمون ساقی میں چھپے بھی، مگر قلبی تعلقات اُس سے قائم نہ ہو سکے۔ مجھے یہی گمان رہا کہ یہ شخص بہت بہکا ہوا ہے، غنی خورا اور چھپورا سا آدمی ہے۔ اس میں "میں" سما گئی ہے۔ زمانے کی ٹھہری تلے آئے گا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔

معلوم ہوا کہ بڑا کٹر کمیونسٹ ہے اور سلم یونیورسٹی سے اسے یہ کہہ کر نکال دیا گیا ہے کہ تم کو دق ہے۔ نئی گڑھ سے نکالے جانے کے بعد وہ اپنے گھر امرت سرہلا گیا۔ گھر والے بھی اس کے باغیانہ خیالات سے بالال تھے، اس لئے اُن سے بھی بگاڑ ہو گیا تھا، امرت سر میں اپنے چند ہم خیال دوستوں کے ساتھ اس نے اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ ان کے لیڈر کمپنی کی حکومت "والے باری (ملیگ) تھے۔ مگر یہ سب لوگ تو کچھ دے دے سے رہے، اس لئے حکومت کی قید و بند سے بچے رہے۔ پھر باری رنگون چلے گئے، اور منٹو بچی جا کر اخبار "معصومہ" میں لکھنے لگا۔

کئی سال گزر گئے۔ منٹو سے ایک آدمی ملاقات اور ہوئی، مگر دل کی جواری اُن سے اب بھی نہ کھلی۔ جیسا اور بہت سے مضمون نگاروں سے تعلق تھا اُن سے بھی رہا۔ یہاں تک کہ کھپلی بڑی جنگ کے زمانے میں وہ دلی ریڈیو میں آگئے۔ اور اب جو اُن سے پہلی ملاقات ہوئی تو انہوں نے چھوٹے ہی کہا۔

"اب میں آپ سے معاوضہ نہیں لوں گا۔"

میں نے پوچھا: کیوں؟

ہوئے "معاوضہ" میں اس لئے لیتا تھا کہ مجھے پیسوں کی ضرورت رہتی تھی۔

دلی ریڈیو اسٹیشن پر جنگ کے زمانے میں ادیبوں اور شاعروں کا ہڑا اچھا جھگٹا ہو گیا تھا۔ احمد شاہ بخاری (پطرس) کنٹرول تھے، خبروں کے شعبے میں چراغ حسن حسرت اور ڈاکٹر اختر حسین

دلے بوری، پروگرام کے شعبے میں ان۔م۔رامشدر۔ انصار ناصری، محمود نظامی اور کرشن چندر۔ منڈی کے مسودہ نویس اوپندر ناتھ اشک اور اردو کے منٹو اور میراجی تھے۔ اس زمانے میں منٹو کو بہت قریب سے دیکھنے کا مجھے موقع ملا۔

منٹو نے کچھ روپے جمع کر کے دو ٹائپ رائٹر خرید لئے، ایک انگریزی کا اور ایک اردو کا۔ اردو کا ٹائپ رائٹر وہ اپنے ساتھ ریڈیو اسٹیشن روزانہ لاتے تھے۔ منٹو کے ذمے جتنا کام تھا اس سے وہ کہیں زیادہ کرنے کے خواہش مند رہتے تھے۔ روزانہ دو تین ڈرامے اور فیچر لکھ دیتے۔ لکھنا تو انہوں نے بالکل چھوڑ دیا تھا، کاغذ ٹائپ رائٹر پر چڑھایا۔ اور کھٹکٹ ٹائپ کرتے چلے جاتے۔ فیچر لکھنا اس زمانے میں بڑا کمال سمجھا جاتا تھا، مگر منٹو کے لئے یہ باتیں باتہ کا کھیل تھا۔ ذرا سی دیر میں فیچر ٹائپ کر کے بڑی حقارت سے پھینک دیا جاتا کہ —

”لو یہ رہا ہمارا فیچر“

منٹو کی اس تیز رفتاری پر سب حیران ہوتے تھے۔ چیز بھی ایسی چچی ٹکی ہوتی کہ کہیں انگلی دھرنے کی محسوس میں گھٹکٹ نہ ہوتی۔

دلی آنے کے بعد منٹو کی افسانہ نگاری کا دور جدید شروع ہوا۔ انہوں نے طبعزاد افسانے ایک اچھوتے انداز میں لکھنے شروع کئے۔ ساقی کے ہر مہینے ایک افسانہ بغیر مانگے مل جاتا۔ ”دجواں“ اسی ریلے میں لکھا گیا، اور اس کی اشاعت پر دلی کے پریس ایڈوائزر نے مجھے اپنے دفتر بلوایا۔ وہ پڑھا لکھا اور بھلا آدمی تھا۔ انگریزی ادبیات میں میراج جماعت بھی رہ چکا تھا۔ بولا ”بھائی، ذرا احتیاط رکھو۔ زمانہ بُرا ہے۔“ بات آئی گئی ہوئی۔ میں نے منٹو سے اس کا ذکر کیا۔ سب عادت بہت بگڑا اگر ساقی کے باب میں کچھ احتیاط رہتے لگا۔

لیکن یہ ناسور دلی میں بند ہوا تو لاہور میں پھوٹا اور ”بو“ پر حکومت پنجاب نے منٹو کو دھر لیا۔ صفائی کے گواہوں میں منٹو نے مجھے بھی دلی سے بلوایا تھا۔ عدالت ماتحت تو قاتل

نہ ہو سکی۔ لیکن اپیل میں غالب منٹو ہی ہو گئے تھے۔ اس کے بعد رہا سہا خوت بھی منٹو کے دل سے نکل گیا، اور انہوں نے دھڑلے سے فحش ”معنا میں“ لکھنے شروع کر دیئے۔ حکومت پنجاب کے پریس ایڈوائزر چودھری محمد حسین ایک عجیب و غریب بزرگ تھے۔ تھے تو عمارت اقبال کے حاشیہ نشینوں میں سے۔ مگر انہیں یہ زعم تھا کہ اقبال کو اقبال میں نے بنایا ہے۔ یہ صاحب ہاتھ دھو کر منٹو کے پیچھے پڑ گئے۔ اور یکے بعد دیگرے انہوں نے منٹو پر کئی مقدمات قائم کرادیئے۔ پھر ان کا نشانہ اقتدار اتنا بڑھ گیا کہ انہوں نے مضمون نگاروں کے ساتھ ناشرین اور کتب فروشوں کو بھی لپیٹنا شروع کر دیا۔ مقدمات کے سلسلے میں منٹو کو بمبئی سے لاہور آنا پڑتا تھا۔ ادھر جرم بھی دلی سے کلہوں کی برات لے کر پہنچتے تھے۔ چند روز لاہور کے ادبی حلقوں میں خاصی چل پھل رہتی۔ شاید ایک آدھ ہی افسانے میں جرماء قائم رہا۔ ورنہ اپیل میں سب بری ہوتے رہے اور چودھری صاحب کھستے رہے۔ منٹو نے اپنے مقدمات کی روداد کسی کتاب کے دیباچے میں لکھی ہے اور اس کتاب کو چودھری صاحب ہی کے نام سے معنون کیا ہے۔

منٹو کی باتیں بڑی دلچسپ ہوتی تھیں۔ انہیں ہمیشہ یہ احساس رہتا تھا کہ میں ہی سب سے اچھا لکھنے والا ہوں، اس لئے وہ اپنے آگے کسی کو گردانتے نہ تھے۔ ذرا کسی نے دُور کی لی اور منٹو نے اڑنکا لگا پڑا بی محنت کی وجہ سے منٹو کی طبیعت کچھ چڑچڑی ہو گئی تھی۔ مزاج میں سببا بالکل نہیں رہی تھی۔ بات بات پر اڑنے اور لٹنے لگتے تھے۔ جو لوگ اُن کے مزاج کو سمجھ گئے تھے وہ اُن سے بات کرنے میں احتیاط برتنا کرتے تھے۔ اُن کا مرن بقول اُن کے کسی ڈاکٹر سے تشخیص نہ ہو سکا۔ کوئی کہتا دق ہے۔ کوئی کہتا سندسے کی خرابی ہے کوئی کہتا عہد کا فعل کم ہو گیا ہے۔ اور ایک ستم ظریف نے کہا کہ تمہارا پیٹ چھوٹا ہے اور انٹریاں بڑی ہیں۔ مگر منٹو ان سب بیماریوں سے بے پروا ہو کر ساری جد پرہیزیاں کرتا رہا۔

منٹو کی زبان پر ”فراڈ“ کا لفظ بہت چڑھا ہوا تھا۔ میراجی کے ہاتھ میں دو لوہے کے

گوئے رہتے تھے۔ میں نے ان سے پوچھا، ان کا مصروف کیا ہے؟ منٹو نے کہا، فراڈ ہے۔ میرا پی نے سیویوں کے مزاح میں سالن ڈال کر کھانا شروع کر دیا۔ میں نے کہا، یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟ منٹو نے کہا، فراڈ۔ اوپر دیکھنا، اشک نے کوئی چیز لکھی، منٹو نے کہا فراڈ ہے۔ اُس نے کچھ چسپیں چسپیں کی تو کہا، تو خود ایک فراڈ ہے۔

یا دوش بخیر! ایک صاحب تھے دیوندر ستیا راجی۔ تھے کیا، اب بھی ہیں اور اردو اور ہندی کے بہت بڑے ادیب ہیں۔ نوک گیتوں پر انگریزی میں بھی ایک کتاب چھپوا چکے ہیں۔ اسی زمانے میں وہ دلی آئے تو انہیں بھی امتیاز نگاری کا شوق چڑھا۔ خاصے جہاں دیدہ آدمی تھے مگر ہاتھ بڑی بھولی بھولی کرتے تھے۔ بھاری بھر کم، قد آور آدمی، چہرے پر بہت زبردستی ڈاڑھی۔ دراصل انہوں نے اپنی ذہنی قطع ٹیگور سے ملنے کی کوشش کی تھی، ٹیگور کے ساتھ انہوں نے ایک تصویر بھی کھینچی تھی جس کے نیچے لکھا ہوا تھا، گرو اور جیلا۔ ایک طرف سفید لگا استاد اور دوسری طرف کالا بھنگ سٹاگر۔

ہاں تو ستیا راجی صاحب نے افسانے لکھنے اور سنسنی شروع کئے۔ ابتدا میں تو سب نے اسی فطرت میں چند افسانے کئے پھر کئی کاٹنے لگے، پھر انہیں دُور ہی سے دیکھ کر بھاگنے لگے۔ مگر منٹو بھاگنے والا آدمی نہیں تھا۔ منٹو نے ایک آدھ افسانہ تو سنا۔ اس کے بعد ستیا راجی صاحب کو گالیوں پر دھریا۔ منٹو نے ہر بلا کھانا شروع کر دیا، تو بہت بڑا فراڈ ہے۔ تیری ڈاڑھی ڈاڑھی نہیں ہے، پاپا گینڈا ہے۔ تو افسانے ہم سے ٹھیک کرنا ہے اور جا کر اپنے نام سے چھپوا لیتا ہے۔ اور اس کے بعد منتظرات سنا شروع کر دیں۔ مگر صاحب مجال ہے کہ ستیا راجی کی تیوری پر بل بھی آیا ہو! اُسی طرح مسکراتے اور بھولی بھالی باتیں کرتے رہے۔ میں کہتا تھا کہ اس شخص میں ولیوں کی سی صفات ہیں۔

منٹو کہتا تھا، یہ راسپیٹین ہے، ابلیس ہے!

دراصل منٹو کو بناوٹ سے چڑھتی۔ خود منٹو کا ظاہر و باطن ایک تھا، اس نے لگی لپٹی

نہ رکھتا تھا۔ جو کچھ کہنا ہوتا صاف کہہ دیتا، بلکہ منٹو بدتمیزی کی حد تک مڑ پھٹ تھا۔

ایک دفعہ احمد شاہ بخاری نے بڑے سر پرستار انداز میں کہا، دیکھو منٹو، میں تمہیں اپنے بیٹے کے برابر سمجھتا ہوں۔

منٹو نے جھٹکا کر کہا، مگر میں آپ کو اپنا باپ نہیں سمجھتا؟

مزہ تو اس وقت آیا جب چراغ حسن حسرت سے منٹو کی ٹکڑی ہوئی۔ واقعہ دلی ریڈیو کا ہے جہاں اتفاق سے سبھی موجود تھے اور چلے کا دور چل رہا تھا، حسرت اپنی علیت کا رعب سب پر گانتے تھے۔ ذکر تھا سومرٹ، ہم کا چمنٹو، محبوب امتیاز نگار تھا اور مولانا حبیب بات کاٹ کر اپنی عربی فارسی کو بیچ میس آئے اور لگے اپنے چڑاؤنے انداز میں کہنے، محاسن حریری میں لکھا۔ آپ نے تو کیا پڑھی ہو گی، عربی میں ہے یہ کتاب، دیوان حماسہ اگر آپ نے پڑھا ہوتا۔ مگر عربی آپ کو کہاں آتی ہے۔ اور حسرت نے تاہر توڑ گئی عربی فارسی کتابوں کے نام گنوا دیئے۔

منٹو خاموش بیٹھا بیچ دناں کھاتا رہا۔ بولا تو صرف اتنا بولا، مولانا ہم نے عربی فارسی اتنی نہیں پڑھی تو کیا ہے؟ ہم نے اہ بہت کچھ پڑھا ہے۔

بات شاید کچھ بڑھ جاتی مگر کرشن چندر وغیرہ نے بیچ میں پڑ کر ممنوع ہی بدل دیا۔ اگلے دن جب پھر سب جمع ہوئے تو حسرت کے آتے ہی بھوکا پال سا آگیا۔ منٹو کا جوانی حملہ شروع ہو گیا، کیوں مولانا، آپ نے فلاں کتاب پڑھی ہے؟ مگر آپ نے کیا پڑھی ہو گی، وہ تو انگریزی میں ہے۔ اور فلاں کتاب؟ شاید آپ نے اس جدید ترین مصنف کا نام بھی نہیں سنا ہو گا۔ اور منٹو نے جتنے نام کتابوں کے لئے اُن میں سے شاید ہی کوئی ایسی کتاب جس کا نام مشہور ہو، منٹو نے کوئی پچاس نام ایک ہی سانس میں گنوا دیئے اور مولانا سے کہلا لیا کہ ان میں سے ایک بھی کتاب نہیں پڑھی۔ ہم چشموں اور ہم نشینوں میں یوں سبکی ہوتے دیکھ کر مولانا کو پسینے آ گئے۔

منٹو نے کہا: مولانا اگر آپ نے عربی فارسی پڑھی ہے تو ہم نے انگریزی پڑھی ہے۔
آپ میں کوئی مگر غلاب کا پرنگا ہوا نہیں ہے۔ آئندہ ہم پر عرب جملے کی کوشش نہ کیجئے۔
مولانا کے جانے کے بعد کسی نے پوچھا: یار تو نے یہ اتنے سارے نام کہاں سے یاد
کرتے؟

منٹو نے مسکرا کر کہا: کل شام یہاں سے اٹھ کر سیدھا انگریزی کتب فروش جینا کے
ہاں گیا تھا۔ جدید ترین خطوط کی فہرست اُس سے لے کر میں نے رٹ ڈال دی۔
سنا کہ اس بجزگی کو یوں دُور کیا گیا کہ احباب نے رات کو ایک *COVERTAGE*
پارٹی پر پاکی، اور جب چند دُور ہو گئے تو منٹو اور حسرت کو گلے ملوا دیا۔

منٹو نے کہا: مولانا تم بھی فراڈ ہو اور میں بھی فراڈ ہوں۔

حسرت نے کہا: نہیں تم باجم ہو۔

منٹو نے کہا: تم ابن خلدون ہو۔

اور دونوں ایک دوسرے کے گلے لگ گئے۔

منٹو بڑا ذہین آدمی تھا۔ اگر ذرا کوئی اپنی حد سے بڑھتا تو وہ سمجھتا کہ یہ شخص میری تو بین
کر رہا ہے مجھے حق سمجھ رہا ہے۔ دل میں بات رکھنے کا وہ قابل نہیں تھا۔ اس کام کے لئے
اوپر ہند ناغہ اشتک بنا تھا۔ بڑی گھل طبیعت کا آدمی تھا۔ منٹو جینے میں تیس چالیس ڈرلے
اور پھر لکھ دیتا تھا، اور اشتک صرف دو ڈرلے لکھتا تھا، اور وہ بھی رو رو کر۔ پھر بڑی ڈھٹائی
سے کہتا پھرتا تھا کہ جتنی تنخواہ مجھے ملتی ہے اُس سے زیادہ کے یہ دو ڈرلے میں نے لکھے ہیں۔
منٹو اس کی بڑی دُرگت بناتا تھا۔ سب کے سامنے اسے فراڈ اور حرام زادہ تک کہہ دیتا تھا۔
اشتک اُس وقت تو روکھا ہو جاتا لیکن منٹو کی باتیں دل میں رکھتا گیا، اور بعد میں کبھی کی مسلم
اندیشی میں منٹو کی جڑ کاٹتا پھرا۔

شیخی کی باتیں منٹو کو سخت ناپسند تھیں۔ اندیشی کر کر کر کے میں اُسے رطقت آتا

آتا تھا۔ ن۔م۔راشد سے میں نے کہا: یہ آپ کی چھوٹی بڑی شاعری میں تو اچھی نہیں لگتی۔
آخر کس میں کیا بات ہے؟

راشد نے *RYTHM* اور *RYHME* پر ایک مختصر لکچر جھاڑنے کے بعد اپنی نظم "اے
مری ہم رقص مجھ کو ختم لے" مجھے سنائی شروع کی اور کہا: دیکھئے! میں نے اس نظم میں ڈانس کا
ردم رکھا ہے۔

میں بڑی سعادت مندی سے سناتا رہا مگر منٹو جھاک بھاک ہاں دے سکتے تھے۔ چیخ کر بولے: کونسا
ڈانس؟ دائرہ، دوبا، سبھا، کتھاکلی، کتھک، مینی پوری؟ — فراڈ کہیں کا۔
بچا سے راشد کھسیانی بنی نہیں کر رہ گئے۔

منٹو کے دماغ میں نئی سے نئی بات آتی تھی۔ ایسی اچھ کی اور میں دیکھی ہی نہیں۔ ایک
میں صاحب کی حسین ٹانگوں کو دیکھ کر کہنے لگے: اگر مجھے ایسی چار ٹانگیں مل جائیں تو انہیں کٹوا کر
اپنے پلنگ کے پائے بنالوں۔

ریڈیو اسٹیشن پر منٹو ایک دن بڑے بے زار بیٹھے تھے۔ میں نے کہا: خیریت تو ہے؟ تو
"سخت بدتمیز اور جاہل ہیں یہاں کے لوگ۔ ٹیلی فون *RECEIVE* کر کے کہتا ہوں "منٹو" تو ادھر
سے وہ حیران ہو کر پوچھتا ہے "ون ٹو؟" میں کہتا ہوں "ون ٹو نہیں" منٹو: "تو وہ کہتا ہے
"بھنٹو؟"

منٹو کو اپنی زبان دانائی پر بڑا ناز تھا، اور واقع میں منٹو بہت صحیح اور عمدہ زبان لکھتے تھے۔
انہوں نے اپنے کسی افسانے میں ایک عورت کا حلیہ لکھنے کے سلسلہ میں یہ بھی لکھا تھا کہ بچپن
مہنے کے بعد اُس کے پیٹ پر شکلیں پڑ گئی تھیں۔ میں نے شکلیں بدل کر چُرسیں کر دیا۔ جب
افسانہ سنا تو میں چھپ کر آیا تو منٹو اس لفظ پر اچھل پڑے۔ بولے: میں نے جس وقت شکلیں
لکھا تھا تو میں سوچ رہا تھا کہ یہ لفظ ٹھیک نہیں ہے۔ مگر میری سمجھ میں اور کوئی لفظ نہیں آیا۔
اصل لفظ یہی ہے جو میں لکھنا چاہتا تھا "اس کے بعد گھلے دل سے انہوں نے سب کے سامنے

کہا کہ میں صرف دو ایڈیٹروں کی اصلاح قبول کرتا ہوں ایک آپ اور دوسرے حامد علی خاں۔ آپ دونوں کے علاوہ کسی اور کو میرا ایک لفظ بھی بدلنے کی اجازت نہیں ہے۔

منٹو بظاہر بڑا اکھڑا اور بدتمیز آدمی نظر آتا تھا مگر دراصل اس کے سپلو میں ایک بڑا حساس دل تھا۔ دُنیل نے اسے بڑے دکھ پہنچائے تھے۔ امیر گھرنے کا لاڈ لایچہ تھا۔ بگڑ گیا اور خوب پیٹ بھر کے بگڑا۔ دوست احباب، کنبہ دار، رشتہ دار سب سے اسے تکلیفیں پہنچتی تھیں۔ اس لئے اُس میں نفرت کا جذبہ بہت بڑھ گیا تھا، مگر اُس کی انسانیت مرتے دم تک قائم رہی، منٹو کا گل گوشتنا سانچہ اچھا خاصا کھیلنا مالتا ذرا سی بیماری میں چٹ پٹ ہو گیا۔ مجھے معلوم ہوا تو میں بھی اس کے گھر پہنچا، احتیاطاً سو روپے ساٹھ لیتا گیا کہ شاید منٹو کو روپے کی ضرورت ہو۔ صفیہ کا روتے روتے بُرا حال ہو گیا تھا۔ عورتا کا گھر تھا، اس نے میری بیوی کھانا لے کر پہنچیں۔ انہوں نے صفیہ کو سنبھالا، منٹو کی آنکھوں میں پہلی اور آخری بار میں نے آنسو دیکھے۔ بچے دفن یا جا چکا تھا۔ میں نے منٹو کو رسی دلاسا دیا اور چپکے سے روپے اُن کی طرف بڑھا دیئے۔ منٹو نے روپے نہیں لئے، مگر تھوڑی دیر کے لئے وہ اپنا غم بھول گیا اور حیرت سے میرا منہ نکلتا رہا۔ بعد میں اس واقعہ کا تذکرہ اُس نے اکثر احباب سے کیا، اور متعجب ہوتا رہا کہ بے مانگے کوئی روپے کسی کو کیسے دے سکتا ہے۔

منٹو کو شراب پینے کی لت خدا جانے کب سے تھی۔ جب تک وہ دلی ہے اُن کی شراب بڑھنے نہیں پاتی تھی۔ بمبئی جانے کے بعد انہوں نے پیسے بھی خوب کمایا اور شراب بھی خوب پی۔ جب پاکستان بنا تو وہ لاہور آ گئے۔ یہاں قلوں کا کام نہیں تھا، اس لئے انہیں قلم کا سہارا لینا پڑا۔ ہمارے ادب حبیبی، بجز زمین سے روزی پیدا کرنا منگوبی کا کام تھا۔ صحت پہلے ہی کون سی اچھی تھی۔ وہی ہی شراب نے غارت کر دی۔ کئی دفعہ مرتے مرتے بچے۔ روٹی ملے یا نہ ملے۔ بیس روپے روز انہیں شراب کے لئے ملنے چاہئیں، اس کے لئے انہوں نے اچھا بڑا سب کچھ کھ ڈالا۔ روزانہ دو ایک انسان لکھنا ان کا معمول ہو گیا تھا۔ انہیں لے کر وہ کسی

ناشر کے پاس پہنچ جاتے۔ ناشروں نے پہلے ضرورت سے انہیں خرید دیا۔ پھر بے ضرورت۔ پھر اپنے اپنے اور منہ چھپانے لگے، دُور سے دیکھتے کہ منٹو آ رہا ہے تو دکان سے نکل جاتے۔ منٹو کی اب بالکل وہی حالت ہو گئی تھی جو آخر آخر میں اختر شیرانی، اور میراجی کی۔ بے تکلف لوگوں کی جیب میں ہاتھ ڈال دیتے اور جو کچھ جیب میں ہوتا نکال لیتے۔ اس میں سے گھر کچھ نہیں پہنچتا تھا۔ شراب سے بچنے کی بہت کوشش کی گئی، خود منٹو نے اس سے بچنے کے لئے اپنے آپ کو پاگل خانے میں داخل کرا لیا۔ منہ سے یہ کافرنگی چھوٹ بھی گئی تھی مگر اللہ بھلا کرے دوستوں کا ایک دن پھر ملائے۔ نتیجہ یہ کہ رات کو خون کتے ہوئی۔ ہسپتال پہنچایا گیا۔ مہینوں پڑے رہے اور جینے کا ایک موقع اور مل گیا۔

اگست ۱۹۵۲ء میں کئی سال بعد لاہور گیا تھا۔ لاہور کے ادیب، شاعر، اڈیٹر اور پبلشر ایک بڑی پارٹی میں جمع تھے کہ غیر متوقع طور پر منٹو بھی وہاں آ گئے۔ اور سیدھے میرے پاس چلے آئے۔ اُن کی حالت غیر تھی۔ میں نے کہا: آپ تو بہت بیمار ہیں، آپ کیوں آئے؟ میں یہاں سے اُٹھ کر خود آپ کے پاس آئے والا تھا۔

بڑے "ہاں" بیمار تو ہوں، مگر جب یہ سنا کہ آپ یہاں آ رہے ہیں تو جی نہ مانا۔ اتنے میں ایک شامت کا ماما پبلشر ادھر آ نکلا۔ منٹو نے آواز دی "اوسے ادھر آ" وہ رکتا جھکتا آ گیا۔ کیا ہے تیری جیب میں؟ نکال۔ اس نے جیب میں سے پانچ روپے نکال کر پیش کئے۔ مگر منٹو پانچ روپے کب قبول کرنے والے تھے؟ حرام زادے دس روپے تو دے؟ یہ کہہ کر اُس کی اندر کی جیب میں ہاتھ ڈال دیا۔ اور دس روپے کا نوٹ نکال کر مجھے بے باتیں کرنے لگے۔ گویا کچھ ہوا ہی نہیں۔ پبلشر نے بھی سوچا کہ چلو سستے چھوٹے، وہاں سے دفعہ چکر ہو گیا۔ منٹو پندرہ بیس منٹ تک بیٹھے۔ باتیں کرتے رہے۔ مگر اُن کی بے حسنی بڑھ گئی اور عذر کر کے رخصت ہو گئے۔ مجھے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئے۔

پانچ بیٹے بعد اخباروں سے معلوم ہوا کہ منٹو اس دُنیا سے رخصت ہو گئے۔ انہوں نے

پھر چپکے سے شراب پی لی تھی، خون ڈالتے ڈالتے مر گئے۔ میں تو منٹو کی عظمت کا اعتراف ہے ہی، خود منٹو کو کبھی اس کا احساس تھا، چنانچہ جو کتبہ انہوں نے اپنی لوحِ مزار کے لئے خود لکھا تھا اُس میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

”یہاں سعادت حسن منٹو دفن ہے۔ اُس کے سینے میں
فنِ انشاء نگاری کے سارے اسرار و رموز دفن ہیں۔ وہ
اب بھی منوں مٹی کے نیچے سوچ رہا ہے کہ وہ بڑا انشاء
نگار ہے یا خدا؟“

جگر مراد آبادی

بعض چہرے بڑے دھوکہ باز ہوتے ہیں۔

کالا گھٹا ہارنگ، اس میں سفید سفید کوڑیوں کی طرح چمکتی ہوئی آنکھیں، سر پر اُلجھے ہوئے پتے، گول چہرہ، چہرہ کے رقبے کے مقابلے میں ہاک کسی قدر چھوٹی اور مُنہ کسی قدر بڑا، کثرتِ پان خوری کے باعث مُنہ اگلا لداں، دانت شریطے کے بیچ اور لبِ کلمی کی دو پوشیاں، بھرہاں کالی ڈاڑھی، ایڈورڈ فیشن کی، سر پر ترکی ٹوپی، بریک اچکن، اڑا پاجامہ، نیم ساق تک چڑیاں پڑی ہوئیں، پاؤں میں پینٹ کی گرگابی، بائیں ہاتھ میں ایک میاں قدر و قامت کا اٹاچی کیس۔ کوئی تیس سال اُدھر کا ذکر ہے جھانسی میں ایک صاحب سر جھکائے قدم پرٹھائے اپنے دھن میں جھومتے چلے جا رہے تھے۔ میرے میزبان نے اشارے سے بتایا: ”یہ ہیں جگر صاحب۔“ میں نے سنی اُن سنی کر دی۔ ہوں گے کوئی، میں نے کبھی اُن کا نام بھی نہیں سنا تھا۔ میرے میزبان نے کہا: ”آج رات مشاعرہ ہے۔ آپ کوے چلیں گے۔“ میں نے کہا: ”کسی اور بُرے کام میں دقت کیوں؟“ منافع کیا جائے؟ کوئی گویا ہو تو اس کا گانا سُنا جائے۔ وکیل صاحب نے کہا: ”اُس کا بھی انتظام کیا ہے ہم نے، کل ہم آپ کو یہاں کے ایک استاد کا گانا سنو، میں گے۔ مگر آج آپ مشاعرے میں ضرور چلیں۔ جگر صاحب کا کلام آپ نے غالباً سنا نہیں ہے۔ سننے کے لائق ہے۔“ میں نے جی میں کہا: ”کوئی، آج کی رات تو

غارت ہوئی۔ قبر دویش بجان درویش و میرزان کی خواہش کا احترام بھی مزدوری تھا۔
طوغا و کربارات کو مشاعرے میں چلنے کی حامی بھر لی۔

پنڈال گٹا دہ بنایا گیا تھا اور روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔ اگلی صحنوں میں میں جگدی گئی۔ مشاعرہ شروع ہونے میں کچھ دیر تھی۔ وکیل صاحب سے باتوں باتوں میں معلوم ہوا کہ جھانسی میں آئے دن مشاعرے ہوتے رہتے ہیں اور ان مشاعروں کی جان جگر صاحب ہوتے ہیں۔ ہر پھر کے جگر صاحب ہی کی تعریف ہوئے جا رہی تھی۔ میں نے وکیل صاحب سے کہا: یہ تو بتائیے کہ جگر صاحب کون ہیں اور کیا میزبانوں نے مجھے ایسی استغابی نظروں سے دیکھا جیسے میں نے کوئی نہایت اہتمام بات کہہ دی ہو۔ بولے بہت اچھے شاعر ہیں، عینکوں کے بچہ بٹ ہیں۔ میں نے کہا: اوہو! عینکیں جیسے میں تو یقیناً بہت اچھے شاعر ہوں گے۔ وکیل صاحب کے چہرے پر خفت کے آثار نمودار ہوئے اور کسی قدر ناگواری کے بھی۔ میں نے اس نکتہ کو مٹانے کے لئے کہا: اندھوں کو آنکھیں دیتے ہیں اور کیا چاہئے؟ وکیل صاحب نے ہنس لگے۔

شعور کی آمد آمد ہوئی مشاعرے کے کارکنوں نے انہیں ہاتھ لیا اور ڈانس پر پہنچا دیا۔ بخود ہی دیر میں جناب صدر بھی تشریف لے آئے۔ ضلع کے حاکم تھے۔ ان کے مندر صدارت سمجھاتے ہی مشاعرہ شروع ہو گیا۔ پہلے چھوٹ بھٹیوں نے لبک لبک کر اپنا کلام سنایا۔ پھر سچ کی راس کے شاعروں نے ان کے بعد جناب درویش نے اتنے میں شور برپا ہوا۔ آگے جگر صاحب آگئے۔ انہیں ڈانس پر پہنچا دیا گیا اور وہ سلام کر کے جناب صدر کے پہلو میں جا بیٹھے۔ پڑھنے والوں کے چہرے اتر گئے۔ اب جو پڑھنے آتا، گھبرا دیا تو لایا آتا اور گھاس سی کاٹ کر چل دیتا۔ جب سب پڑھ چکے تو جناب صدر نے جگر صاحب کو درخواست کی اور سارا پنڈال تالیوں سے گونج گیا۔ جگر صاحب خندہ دندان ہٹا کر تے گے پڑھ آئے۔ وکیل صاحب نے دیر لب فرمایا: اب جگر صاحب کے میٹھو مری باری آئی۔ میں نے

پوچھا: یہ آپ مجھ سے فرما رہے ہیں یا جگر صاحب؟ وکیل صاحب کھپائی جی نہیں کر رہے گئے۔ جگر صاحب نے لنگن کر سرقاٹ کیا اور اپنے مخصوص ترنم میں غزل سنائی۔ شروع کی۔ مطلع سے مطلع تک غزل کا انداز ہی نیا تھا۔ اس پر خوش گلوئی! پنڈل اڑا کر رکھ دیا۔ کئی کئی دفعہ ایک ایک شعر کو پڑھوایا گیا۔ میں نے جگر سے پہلے اتنا سر بلاش اعراد کوئی نہیں سنایا۔ یا پھر گانے والے شاعر نے تھے جو باقاعدہ تان پٹے کرتے تھے، مثلاً حفیظ، ساغر دوش صدیقی وغیرہ۔ یہ بڑی عجیب بات تھی کہ جگر صاحب کا پڑھنا ترنم ہی رہتا تھا۔ گانا نہیں بناتا تھا۔ جگر صاحب کو اس مشاعرے میں سنکر میں بھی ان کے مداحوں میں شامل ہو گیا۔

خاکسارانِ جہاں را بہ حقارت منگر
تو چہ دانی کہ دریا گر دسوارے باشد

میں سائے یا سائے میں حیدر آباد گیا تھا۔ واپسی میں دو دن کے لئے سید ابو عمر جوم کے ہاں بھوپال میں ٹھہرا تھا۔ سید صاحب بڑی خوبیوں کے آدمی تھے۔ آپ انہیں یوں پہچانے کہ سید ابوالاعلیٰ مودودی کے بڑے بھائی تھے۔ جگر صاحب اس زمانے میں بھوپال ہی میں تھے۔ خبر نہیں کہاں سے انہیں معلوم ہوا۔ تیسرے پیر کو مجھ سے ملنے چلے آئے انے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ بڑے خلوص و محبت سے گلے ملے۔ میری شیریت پوچھی، ساقی کی کیفیت دریافت کی جو دی ساقی کے لئے اپنا کلام بھیجے کا وعدہ کیا۔ وہیں بیٹھے بیٹھے اپنی ایک غزل لکھ کر دی۔ بڑے خوش خط تھے جگر صاحب۔ جو انداز پرانے زمانے کی وصلیوں کا ہوتا ہے اسی انداز میں یہ غزل قلم برداشتہ لکھی تھی مگر موتی جڑ دیئے تھے اہتمام پر اپنے نام کا طعنا بنا دیا تھا۔ مزاج کی نفاست زبان قلم سے بھی ٹپکتی تھی۔ کتنی خوبصورتی چھٹی ہوئی تھی اس ظاہرہ بدشکل انسان کے اندر! میری لڑائش پر غزل پڑھ کر کئی سنائی۔ نور کا گلا پایا تھا۔ اندھیکے میں سے روشنی پھوٹ رہی تھی۔ کیا آبِ حیاں کی طرح دنیا کی تمام

مثلاً قیمت اور حسین چیزیں تاریکی ہی میں ہیں :

میرے ہاں دلی کے آخری نرٹ کا استاد اللہ دیئے خاں آیا کرتے تھے۔ عمر ستر سے اڑھائی تھی۔ سونکھ کر چرخ ہو گئے تھے، دانت ٹوٹے ہوئے، گال چپکے ہوئے۔ بڑی بڑی گھنی سفید نوکھیں، ڈارھی سنڈی ہوئی مگر قبول مرزا چیونٹیوں کے اندھے موجود رہتے۔ بصورت موجودہ کوئی استاد کو اپنے پاس بٹھانے تک کار و ادارہ ہوتا مگر جب وہ ٹھہری یا دادرے کا کوئی بول لگا کر بتا دیا شروع کرتے تو یہ معلوم ہوتا کہ اندھے کے اکھاڑے کی کوئی اپسرا اتر آئی ہے۔ اسی کریمہ نظر پڑھے استاد کو گئے لگا لینے کو جی چاہتے لگتا۔ شاید فنکار کا فن ہمیشہ جوان حسین رہتا ہے اور اس کی خوبصورت روح اسکے بد صورت جسم کی پردہ پوش ہو جاتی ہے۔ جگر صاحب بھی جب اپنا کلام سناتے تو حسین نظر آنے لگتے۔

بھوپال کی مختصر مکافات کے بعد جگر صاحب کے اکثر ملنا ہوتا رہا۔ ان مختصر مکافاتوں میں کبھی کبھی شروٹ اتری پہلی بات چل نکلتی تو جگر صاحب کینٹس اور شیلے تک کے نام لے جاتے۔ باتیں خاصی معقول کرتے تھے۔ اوجھے پن کی حرکتیں نہیں کرتے تھے اور ضرورت سے زیادہ بے تکلف ہوتے تھے۔ ان کے مزاج کی شائستگی ان کی غزل میں دھل گئی تھی۔ ان سے کبھی کسی کی بُرائی نہیں سنی اور نہ کبھی یہ سنا کہ کسی کو دھوکہ دیا، یا کوئی بیہودہ بات کی۔ وہ صحیح معنوں میں ایک شریف النفس انسان تھے۔ کارڈیل نیومن نے GENTLEMAN جنٹلمین کی تعریف یوں کی ہے کہ وہ کسی کو دکھ نہیں پہنچاتا۔ جگر صاحب ایک PERFECT GENTLEMAN تھے۔

نیاز فتح پوری STUNTS کے قائل ہیں۔ وہ ہمیشہ چڑکانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مثلاً آپ کہیں گے کہ جنت اور دوزخ ہے تو وہ کہیں گے نہیں ہے۔ آپ کہیں گے خلیہ تو وہ کہیں گے نہیں ہے، آپ کہیں گے قرآن شریف کلام اللہ ہے تو کہیں گے کلام بول

ہے۔ آپ کہیں گے یہ دن ہے تو وہ کہیں گے نہیں رات ہے۔ برنارڈ شاہ کے ایک کردار کی طرح اختانات مزدور کر سینگے۔ اُس نے کہا "بیٹھ جاؤ تو بولا" نہیں، میں کھڑا رہوں گا۔ کہا: "اچھا تو کھڑے رہو" نہیں، میں بیٹھوں گا۔ یہ کہہ کر بیٹھ گیا۔ تو اسی سے ملتی جلتی فطرت نیاز صاحب کی ہے۔ حال ہی میں انہوں نے "نگار" کا "جگر نمبر" شائع کیا ہے۔ جگر کے انتقال پر ہندوستان اور پاکستان میں بہت سوگ منایا گیا۔ اور کئی رسالوں نے جگر نمبر شائع کئے۔ نیاز صاحب بھلا ٹھنڈے میٹوں تعریف و توصیف کے اس پشٹاے کو کیسے گوارا کر لیتے؟ چنانچہ انہوں نے بھی ایک جگر نمبر شائع کر دیا۔ جس میں سوائے جگر کی بُرائی کے اور کچھ نہیں ہے۔ اس نمبر کا حشر تو دی ہو گا جو آسمان پر پختہ کئے گا۔ مجھے یہاں ایک واقعہ کی وضاحت کرنی ہے جو اس نمبر میں درج کیا گیا ہے۔ کچھ عرصہ ہوا کراچی میں ایک مشاعرہ ہوا تھا جس کی صدارت کے لئے جناب نیاز کو لکھنؤ سے بلوایا گیا تھا۔ کس نے بلایا تھا اور کیوں بلایا تھا؟ اس کو اس وقت چھوڑیے۔ نیاز صاحب نے لکھا ہے کہ انہیں کراچی پہنچ کر معلوم ہوا کہ جگر صاحب کراچی میں موجود ہیں مگر انہوں نے نیاز صاحب کی صدارت میں پڑھنے سے انکار کر دیا۔ نیاز صاحب نے جگر کے انکار کی وجہ ان تنقیدوں کو قرار دیا جو کبھی نگار میں انہوں نے کلام جگر پر لکھی تھیں۔ مگر ہوا یہ کہ جگر صاحب شاعرے میں گئے اور انہوں نے کلام بھی سنایا اس واقعہ کو لکھ کر نیاز صاحب نے بتایا ہے کہ جگر چونکہ پیسے کم پڑھتے تھے اس لئے وہ شاعرے میں شرکت پر مجبور تھے۔ پھر اس سے یہ نتیجہ نکالا کہ پیسے کم پڑھنے والے شاعر کا کلام پھسپھسا ہوتا ہے۔ اسی مفروضہ پر نیاز صاحب نے اپنی جانب میں اس خاص نمبر میں کلام جگر کے بچے اڈھیر دیئے ہیں۔ مگر جب آپ ان کے اعتراضات پڑھیں گے تو آپ کو اس بوڑھے علامہ کے بچکا ذرا اعتراضات پر ہنسی آنے لگے گی۔ خیر یہ ایک الگ لغویت ہے جس سے غلط فہمی کے لئے اگر آپ وقت نکال سکتے ہوں تو نکال

لیجے۔ سب تو صرف اس مشاعرے والے واقعہ سے سروکار ہے۔ جگر اتنے چھوٹے دل کے آدمی نہیں تھے کہ نیاز صاحب کی تنقید سے چراغ پا ہو جاتے اور سالہا سال تک اُن سے دل میں لبّیں رکھتے۔ جگر صاحب کا ساری عمر چل بکرا اپنے بدخواہوں کو صاف کر دیتے تھے۔ اُن کے نزدیک یہی سب سے بڑی سزا تھی۔ اس کے علاوہ اخلاقی اعتبار سے جگر صاحب اتنے گریے ہوئے بھی نہیں تھے کہ کراچی کا مشاعرہ نہ پڑھتے تو اُن کے ہاں فلتے پڑ جاتے۔ جگر صاحب کراچی آکر مہینوں رہتے تھے اور بغیر مشاعروں کے بھی ریسوں کی سی زندگی بسر کرتے تھے۔ میں نے انہیں مسیوں جگہ مفت پڑھتے سنا ہے۔ اس مشاعرے میں بھی پڑھنے وہ نیاز صاحب کی طرح پورا خرچے کر بندوستان سے کراچی نہیں آئے تھے بلکہ یہاں پہلے سے موجود تھے۔ اور اُن کا مشاعرے میں شریک ہو جانا ہی نیاز صاحب کے بیتان کی تردید کے لئے کافی ہے۔ جگر صاحب ایک مثربین النفس انسان تھے اور جہاں تک ممکن ہو تاں کسی کو دکھ نہیں پہنچاتے تھے۔ جگر صاحب ایک سیر چشم آدمی تھے۔ روپیہ پیسہ اُن کے لئے کوئی حیثیت نہیں رکھتا تھا۔ میں نے اُن کا وہ زمانہ دیکھا ہے جب وہ شراب کے نشے میں دھت رہا کرتے تھے اور کوڑی کوڑی کو محتاج۔ مگر میں نے آج تک کسی سے نہیں سنا کہ جگر نے کسی کے آگے ہاتھ پھیلا ہو۔ مدد بخشی میں بھی انہوں نے اپنی غیرت و خود داری کو ہاتھ سے نہیں دیا۔

نخشب جارجی نے جگر صاحب کا ایک واقعہ سنایا تھا کہ کسی فلم کے لئے جگر صاحب کی ایک منزل ریکارڈ کرنی تھی۔ جگر صاحب کو اس کا معاوضہ ٹھیک یاد نہیں رہا، پانچ ہزار یا آٹھ ہزار شنگی دے دیا گیا۔ جگر صاحب اس سے پہلے ریڈیو کے مختلف اسٹیشنوں سے اپنا کلام نشر بھی کر چکے تھے اور ریکارڈ بھی کر چکے تھے۔ لہذا نہایت اطمینان سے فلم کے لئے بھی اپنی ریکارڈنگ کرنے کے لئے بیٹھ گئے مگر جب اپنا ریکارڈ خود سنا تو سٹپ ہو گئے۔

اور اُسے ناپسند کر کے دوبارہ ریکارڈ کیا۔ مگر اس دفعہ بھی انہیں اپنا ریکارڈ نہایت بڑا معلوم ہوا۔ تیسری دفعہ اور چوتھی دفعہ بھی ناکام رہے۔ غرض چھ دفعہ بی جا پیش آیا۔ سخت بد دل ہوئے۔ کہنی داؤں نے کہا: گجراتی کی کوئی بات نہیں ہے۔ آپ اب کل پھر تشریف لائیے۔ گھر پہنچ کر تختہ سے بوسے۔ خدا جانے کیا بات ہے کہ ریکارڈ اچھا نہیں بن رہا تھا ایسا کر دیکھ یہ روپیہ واپس کر دو اور مجھے آج سوار کر دو۔ نخشب صاحب نے انہیں تلی دی اور ایک دن کے لئے اور انہیں روکنے میں کامیاب ہو گئے۔ اگلے دن بھی کئی ریکارڈ نے مگر سب ناقص رہے۔ جگر صاحب کی پریشانی اور شرمندگی بڑھتی جا رہی تھی۔ اور ریکارڈنگ بد سے بدتر ہوئی جا رہی تھی۔ نخشب صاحب کو ایک ترکیب سوجھی۔ نیکروفون اُن کے سامنے سے ہٹا دیا اور بولنے کچھ دیر توقف کیجئے، چائے دے دیجئے، پھر دیکھا جائے گا۔ جگر صاحب نے جھجکا کر کہا: میاں، تم ان کا روپیہ واپس کر دو اور مجھے گھر جانے دو، انہوں نے کہا: بہت اچھا۔ روپیہ واپس کر دیا جائے گا۔ مگر آپ اطمینان سے منیجر کو چائے قہوی لیجئے۔ جگر صاحب خوش ہو گئے، جیسے منوں بوجھ اُن کے سر سے اتر گیا ہو۔ اور اُدھر کی باتیں من من کر کرنے لگے۔ چائے پی چکے تو نخشب نے کہا: دراصل آپ کو نیکروفون کا احساس ہو جاتا ہے۔ اب اگر آپ پڑھیں گے تو بالکل ٹھیک پڑھیں گے۔ ذرا پڑھئے تو؟ جگر صاحب پڑھنے لگے۔ جب پڑھ چکے تو اسی کا ریکارڈ انہیں سنایا گیا۔ حیران ہو کر بولے: یہ کون ریکارڈ ہے؟ یہ تو ٹھیک ہے۔ نخشب نے بتایا کہ ابھی جو آپ پڑھ رہے تھے اس کا ریکارڈ ہے۔ مگر کب اور کیسے ریکارڈ کر لیا؟ سچی یہ ہمارے TRICKS OF THE TRADE ہیں۔ اب گھر چلئے۔ روپیہ واپس کرنے کی ضرورت نہیں رہی۔

جس شخص کا یہ کردار ہو وہ پیسے کا میت کیسے ہو سکتا ہے؟ جب وہ پانچ ہزار سے دست کش ہو سکتا ہے تو کیا پانچ سو کے مشاعرے کو نہیں چھوڑ سکتا؟ وہ مشاعرے میں روپے کے لئے نہیں بلکہ اس لئے شریک ہوئے کہ ان کی عدم شرکت سے مشاعرے

کے کارکنوں کے ساتھ سامعین کی بھی دل آزاری ہوتی اور خود جب نیاز کو خفت اٹھاتی پڑتی۔ جگر صاحب کو جو بے پناہ مقبولیت حاصل تھی وہ کسی نے ہاتھ اٹھا کر خیرات میں نہیں دی تھی۔ ادب دوستوں نے انہیں رسیں المتعزلیں قرار دیا تھا۔ اگر انہیں شہنشاہ تغزل کہا گیا (یہ نیاز صاحب ہی کا بیان ہے) تو شہنشاہیت کا تاج بھی خالص ادب ہی نے ان کے سر پر رکھا ہو گا۔ خدا کا شکر ہے کہ جگر صاحب محسود تھے، حاسد نہیں تھے۔ شریعت آدمی حاسد نہیں ہوتے۔

جگر صاحب شعلہ طور کی اشاعت سے پہلے بھی شاعر تھے۔ ادماں کا ایک مجموعہ کلام شائع ہو کر گناہ ہو چکا تھا۔ اس زمانے کے کلام میں بھی ایک ٹیکھا پن تھا۔ مگر سُننے کے کسی معرکہ عشق میں ناکام ہونے کے بعد ان کے ساتھ ان کے کلام کی بھی دنیا بدل گئی۔ جگر کی غزل میں جو نیا مزاج پایا جاتا ہے وہ اسی محرومی کا نتیجہ ہے عشق کی آگ بھڑک کر شعلہ طور بن گئی۔ شعلہ طور کا پہلا ایڈیشن چھپتے ہی ختم ہو گیا۔ سید سلیمان ندوی مرحوم نے شاعر اور کلام شاعر کا تعارف کرایا تھا۔ میسر پاس حبیب یہ نسخہ ریو کے لئے آیا تو میں نے اور انصار انصاری نے جگر کی دھنوں میں لبک لبک کر پوری ایک رات اسے ختم کرنے میں صرف کر دی تھی۔ اس ایڈیشن میں ادیا ما کا بنایا ہوا جگر کا ایک منسل بھی تھا جو اس قدر اعلیٰ درجہ کا تھا کہ ہم اسے کسی غیر ملکی آرٹسٹ کا کارنامہ سمجھتے رہے۔ بعد میں جامعہ ملیہ میں ادیا ما سے ملاقات ہوئی تو معلوم ہوا کہ مہارے ہی ملک کا ایک دھان پان سان فوجوان ہے جس کے دل میں آگ بھری ہوئی ہے، دو چار دفعہ کی ملاقات کے بعد جب اس سے پوچھا کہ یہ آپ نے اپنا نام کیا رکھ لیا ہے تو اس نے بتایا کہ ادیا ما جا پانی زبان میں جوا لکھی کو کہتے ہیں، پُر اسرار آدمی تھا۔ دلی سے غائب ہو گیا۔ پھر سُننا کہ مر گیا۔

جگر صاحب ایک زمانے میں پھل کی طرح شراب پیتے تھے۔ ان کے قصیدہ والوں نے یہ طریقہ اختیار کر لیا تھا کہ جب ان کا کلام سُننا ہوتا تو ان کے لئے ایک قہل منگا لیتے۔

سو کھے دھانوں میں پانی پڑ جاتا۔ گھنٹوں اپنا کلام سناتے رہتے۔ پھر لکچکا اتنا زیادہ ہو گیا کہ ہر وقت پینے لگے۔ جگر صاحب کی زندگی کا یہ دور ثقہ حضرات کے نزدیک خاصہ قابلِ اعتراض تھا۔ مگر مدہوشی کا یہی دور ان کی شاعری کے عروج کا دور تھا۔ ان کے تدر دان اور مشاعرے دلی جام نے کی مانند۔ انہیں ہاتھوں ہاتھ لیتے تھے۔ روپیہ ان پر پڑتا تھا۔ مگر وہ کل کے لئے آج شراب میں خیرت نہیں کرتے تھے۔ روپیہ ادھر کیا اور ادھر شراب بنکر اٹھا۔ خبر نہیں گھر کی زندگی اس شراب نوشی کی وجہ سے اجڑی یا گھر کی اجڑی ہوئی زندگی نے کثرت نے نوشی کے پُر لگائے دنوں مہینوں گھر کا رخ نہ کرتے۔ آج اس کے ہاں ٹھوسے میں کل اس کے ہاں۔ اصغر گوٹہ دی ان کے بڑے ہم دلت تھے۔ جب انہوں نے میاں بیوی میں نا اتفاقی کی یہ صورت دیکھی تو جگر سے کہا کہ اپنے ساتھ بیوی کی زندگی کیوں خراب کر رہے ہو؟ طلاق دے دو۔ اصغر کا جگر صاحب بہت ادب کرتے تھے۔ تعمیل ارشاد میں طلاق دے دی۔ شراب اور کبھی بڑھ گئی، اتنی کوشاںوں کے اسٹیج پر بھی بوتل اور گلاس ساتھ رہنے لگا۔ غزل پڑھتے پڑھتے بھول جاتے اور سامعین خاصے بے لطف ہوتے۔ مگر ان کے کلام اور ان کے کمال کی وجہ سے ان کی اس لغویت کو نظر انداز کر دیتے۔ کچھ رسم ایسی چٹکی تھی کہ بدیر جگر کے کوئی مشاعرہ کامیاب نہیں ہوتا تھا۔ میں نے بہت سے ذہین شاعروں کو شراب سے تباہ و برباد ہوتے دیکھا ہے۔ اختر شیرانی، میراجی اور مجاز کا تو آخر میں یہ حال ہو گیا تھا کہ اسٹیج پر نہ صرف تھے کہ دیتے تھے بلکہ پیشاب بھی کر دیتے تھے اور لوگ انہیں اٹھا کر ان کے ٹھکانوں پر پہنچایا کرتے تھے۔ جگر صاحب اتنے نہیں گرے تھے۔ انہیں پھر بھی ہوش رہتا تھا اور ان کی طرح اول قول کہنے نہیں گتے تھے۔ ان لوگوں میں اور بہت سی اخلاقی خرابیاں پیدا ہو گئی تھیں۔ جن کی وجہ سے لوگ ان سے بھاگنے لگے تھے۔ جگر صاحب کی کسی کی بیوی کو نہیں مارا کسی سے بھیک نہیں مانگی۔ تانگے والوں اور چکلے والوں سے انہیں لڑتے ہوئے نہیں دیکھا اور پتے جوئے

کبھی نہیں پائے گئے۔ اُن کی شراب خوری کے نقصانات اُن ہی کی ذات تک محدود تھے، دوسروں کو اُن کا خمیازہ بھگتنا نہیں پڑتا تھا۔ اُوروں کی شاعری دم توڑتی چلی گئی۔ جگر کی شاعری توانا سے توانا تر ہوئی چلی گئی۔ اپنے اپنے ظرف کی بات ہے۔ جگر کی شرافت نفس میں فرق نہیں آیا اور اسی وجہ سے اُن کی نفاست شاعری بھی قائم رہی۔

اصغر صاحب کی بیوی کا حب انتقال ہو گیا تو انہوں نے اپنی سالی یعنی جگر کی مطلق سے شادی کر لی۔ یوں دو اجڑے گھر بس گئے۔ جگر صاحب نے اس نئے رشتے پر بری کو مطلق اظہار نہیں کیا بلکہ اصغر صاحب سے اُن کی محبت اور عقیدت کچھ بڑھ ہی گئی۔ یار لوگوں نے اس واقعے افسانے تراش لئے مگر حقیقت یہ ہے کہ جگر صاحب نے اصغر صاحب کے ساتھ اُن کی بیوی کی عزت و تکریم بھی شروع کر دی، وہی ناپسندیدہ بیوی اب اُن کے لئے ایک لائق احترام خاتون بن گئی تھیں۔ اسی سے اندازہ لگا لیجئے کہ جگر صاحب حفظ مراتب کا کس قدر خیال رکھتے تھے

گر حفظ مراتب دکنی زندگی

کچھ عرصہ بعد اصغر گوٹروی کا انتقال ہو گیا۔ جگر صاحب کو بڑا رنج پہنچا۔ اُن کی زندگی میں یہ بیک زبردست انقلابی نقطہ تھا۔ سنا کہ جگر صاحب بہت بیمار میں اتنے کوششوں میں شرکت کرنے کے قابل نہیں ہیں۔ اُن کی بیماری تھی ترک شراب سنا تھا کہ یہ منہ لگ جائے تو پھر نہیں چھوٹی۔ مگر جگر نے ایک لحنت شراب چھوڑ دی۔ اُن کے دل کی حالت بگڑ گئی۔

طبیعوں نے بہت کہا کہ رفتہ رفتہ کم کر کے چھوڑ دو ورنہ مر جاؤ گے۔ مگر جگر صاحب بڑے مضبوط کردار کے آدمی تھے۔ انہوں نے کہا: جب چھوڑ دینی ہی چھری تو بس چھوڑ دی سب جان جائے یا رہے۔ اس کا رد عمل اتنا شدید ہوا کہ جان کے لالے پڑ گئے۔ جگر صاحب نے اپنے آپ کو اتنی سخت آزمائش میں آخر کیوں مبتلا کیا یہ معلوم ہوا کہ یہ بھی محبت کی کافرانی ہے۔ اصغر صاحب کے انتقال کے بعد جگر صاحب کو اُن کی بیوہ اور اپنی سالیقتہ بیوی سے

محبت ہو گئی۔ مدت پوری ہونے کے بعد حرفِ مطلب دبان پر لائے۔ انہوں نے فرمایا "شراب چھوڑ دو"۔ اس اللہ کے بندے نے شراب چھوڑ دی۔ بڑی بڑی حالتیں ہوئیں مگر نیت نیک تھی۔ ساحل مراد پر زندہ ہی پہنچ گئے۔ انہوں نے اپنا وعدہ پورا کیا۔ شادی کے بعد جگر صاحب نے ایک نئی زندگی کا آغاز کیا۔ رندی اور سستی رخصت ہو چکی تھی۔ اب وہ ایک نابینا بن گئے تھے۔ مگر اس زہد و اقلیت میں اُن کا دل زندہ مرنے نہیں پایا تھا۔ طبیعت کی مستقل خرابی کے باوجود وہ خوب بنتے بڑتے تھے۔ گھنٹوں برج کھینچ کر دیتے تھے۔ مثنیٰ عروض اور ادبی محفلوں اور دوستوں کے ہاں آیا جایا کرتے تھے۔ اخلاق اور بھی نکھر گیا تھا۔ کھانا دہ پہلے ہی کم کھاتے تھے، اب قلوں، اشوں پر آگیا تھا۔ ہندوستان اور پاکستان میں یکساں عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ بیوی سلیقہ مند خاتون تھیں۔ چند سال کے پھر میں ہی شاعروں کے بعد پے سے سنا ہے کہ انہوں نے جگر صاحب کو صاحبِ جاناؤ بنا دیا۔ قیام پاکستان کے بعد جگر صاحب نے یو۔ پی کے مسلمانوں کے لئے بہت مفید کام کئے۔ حکام اُن کی عزت کرتے تھے اداؤں کی بات نہیں مانتے تھے۔ پاکستان میں بھی اُن کا وقار قائم تھا۔ لوگ کہتے ہیں کہ اُن کی شاعری بھی بہتر ہو گئی تھی مگر اس میں جو ایک قسم کی بے ساختگی اور ایک طرح کی دالہ بزدلی تھی، ایک اچھوتا بانگین تھا وہ یقیناً نہیں رہا تھا۔ اس کے بے سنجیدگی اور روحانی بالیدگی دہائی تھی۔ پہلے دل سے شعر کہتے تھے۔ بدمعاش سے کہنے لگے تھے

بہیں کراست بہت خاؤ مرا سے شیخ

کہ چوں خراب شود حنا خدا گرد

دل کی بیماری نے ان کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ بہت بہتر جگر صاحب کی صحت جواب دیتی چلی گئی۔ دو سال ہوئے کراچی میں اُن سے ملاقات ہوئی تھی۔ ویسے ہی بشارت بشارت تھے۔ اسی طرح گرجوئی سے ملے تھے۔ اسی طرح پوری آواز سے اپنا کلام سنانے تھے۔

لوگ فرمائش کر کر کے اُن سے اُن کا پہلا کام سننے تھے۔ خوش ہو کر سناتے تھے۔ ایک مشاعرے میں دُور پیچھے سے آواز آئی "جگر صاحب! وہ سنائیے جس میں ہرن ٹیل رے میں۔ یعنی ٹیل رے میں جگر صاحب نے مسکرا کر اپنا مشہور نازکی کا سراپا سنا دیا جس میں "آہ خورائے آتما ہے۔ وطن والہیں پیچھے قودل کے شدید دُور سے پٹنے لگے۔ صاحبِ فراز ہنگامے میں بندوں زندگی اور موت میں ان پر چھینٹا چھپٹی ہوتی رہی۔ اسی بیماریِ دل نے آخر کام تمام کیا۔ عر

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را۔

حکیم کیفیتِ دہلوی

یادش بخیر حکیم ہاشم جان کیفیت کو میں نے پہلی دفعہ ۱۹۳۲ء میں ایک مشاعرہ میں دیکھا۔ کیفیت کی عمر اس وقت پندرہ سولہ سال کی تھی۔ عجب طرح دارِ نوجوان تھا چہتی رنگ۔ کٹاؤہ پیشانی۔ غلامی آنکھیں۔ ستواں ناک۔ ہونٹ گلاب کی پتیاں جن پر کثرتِ پانِ خودی کے باعث لاکھ کی ہلکی سی تحریر میں بھیگ رہی تھیں، بڑا ساق۔ سر پر ترکی ٹوپی۔ سیاہ فزاں کوٹ، چست پاجامہ، نصف ساق تک چوڑیاں پڑی ہوئیں۔ چال میں البیلا پن۔ باتوں میں لگاؤ۔ سب کی نظریں اسی طرح دارِ نوجوان پر پڑ رہی تھیں۔ میں نے بھی اسے دیکھا تو کسی سے پوچھا کہ یہ کون صاحبِ زادہ ہیں؟ بتایا گیا کہ مسیح الملک حکیم، محلِ خاں مرحوم کے ذمے ہیں، طبیعہ کا لُج میں پڑھتے ہیں۔ مشاعرہ ایک بہت بڑی گٹاؤہ حویلی میں تھا۔ چادر ٹی بازار سے جو رستہ چوڑی دالاں کو جاتا ہے اس میں کوئی سو قدم چلنے کے بعد دائیں ہاتھ کو اس حویلی کا پھاٹک ہے۔ مشاعرہ کا انتہام صحن میں کیا گیا تھا۔ اُعلیٰ اعلیٰ چاندیوں کا فرش۔ ان پر قالین اور گاؤں کیئے لگے ہوئے۔ بجلی کے قندروں سے حویلی پر ٹی جگہ گارہی تھی۔ یہ مشاعرہ دلی کے اسکولوں کے طالب علموں کا تھا۔ کوئی رات کے نو بجے مشاعرہ شروع ہوا۔ صدارت پنڈت امر ناتھ ماسٹر آنجنائی نے کی تھی۔ پنڈت جی اس زمانے میں دلی کے سب سے بزرگ شاعر تھے۔ مشاعرہ دلی کی صدارت کرنے کا انہیں خاص سلیقہ تھا۔ مشاعرہ کے جملہ آداب اور جملہ روایات کو قائم رکھتے تھے۔ گھنٹہ پون گھنٹہ بعد کیفیت کی باری آئی۔ مجھے ڈر یہ تھا کہ یہ

ریشمین سے صاحبزادہ پھنسی نکل جائیں گے اور ان کی بڑی بھڑکی بھڑکی ہوگی مگر جب کیفیت نے مطلع پڑھا تو مشاعرہ چمک اٹھا۔ دل کٹ ترنم۔ پاٹ دار آواز۔ موزوں زیر و بم۔ عمدہ شعر۔ وہ جم کر پڑھا کہ لطف آگیا۔ بار بار شعر مکرر پڑھنے کی فرمائش ہوتی تھی اور کیفیت کی آواز کی توانائی بڑھتی جاتی تھی۔ جب غزل ختم ہوگئی تو چاروں طرف سے ماشاء اللہ اور سبحان اللہ کی ہارس ہورہی تھی۔ کیفیت نے مشاعرہ کوٹ لیا۔ اس کے بند کی شاعروں نے پڑھا۔ مگر کسی کا رنگ نہ جم سکا۔ اور سب ٹھیکرے سے توڑ کر چلے گئے۔ کیفیت کو تو خیر مشاعرہ ختم ہونے پر داد مل رہی تھی۔ ان کے استاد حیدر دہلوی کو ان سے بھی زیادہ داد دی جا رہی تھی۔ اسیے بھی! یہ کیا معاملہ ہے؟ معلوم ہوا کہ یہ سب استاد ہی کا توفیق ہے جو میاں کیفیت ایسی ٹھکی ہوئی غزل پڑھ گئے۔ ورنہ سوائے ترنم کے اس میں کیفیت کا اور کچھ نہ تھا۔ مانتے کا ہاتھ پکڑا جاتا ہے۔ کہتے کی زبان نہیں پکڑی جاتی۔ جتنے مانتے اتنی باتیں۔ مگر اس وقت تو کیفیت ہی نے مشاعرہ کو پھوکا یا تھا۔ اس لئے سہرا بنی کے سر رہا۔

کیف کی شاعری کا سلسلہ دو چار سال چلا۔ اس کے بعد استاد سے کچھ بگڑ گئی اور کیفیت نے شاعری چھوڑ کر مطب کرنا شروع کر دیا۔ کیفیت بہت اچھے طبیب تھے اور اللہ نے ان کے ہاتھ میں شفا بھی دی تھی۔ مگر انہوں نے کبھی بھی سنجیدگی سے اپنے پیشہ کی طرف توجہ نہیں کی مگر ان میں لا ابالی پن تھا۔ جم کر مطب کرنا ان کے بس کا روگ نہیں تھا۔ گھر کے رئیس تھے اور دلی کے سائے ہی حکیم رئیس ہوتے تھے۔ اس لئے اور بھی بے پروا ہو گئے تھے۔ ویسے جب واقعی کسی کا علاج کرتے تو معجزے بھی کر دکھاتے۔ ورنہ یہ بھی دیکھ لے کر ٹلنے کے لئے تل میں سے بوتل میں پانی بھر کے مرعین کو پکڑا دیا اور اللہ کی شان! کہ اسی سے بیمار اچھا ہو گیا۔

کیف پر جوانی ٹوٹ کر آئی تھی۔ حسین آدمی۔ اس پر چرباک۔ ہوا خاں ہوں کی کمی نہ رہی۔ بالا خانوں پر رسانی اور پذیرائی ہونے لگی۔ وہ تو کہو والدین زندہ تھے اور جائداد

ان کے قبضہ میں نہیں آئی تھی۔ ورنہ دیکھتے ہی دیکھتے سب خالص لگ جاتی۔ مطب سے جو کچھ کماتے اور ہزاروں ہی کماتے۔ سب اسی عیاشی کی بھینٹ چڑھ جاتا۔ ان کی یہ سوئی آمدنی رئیسوں کے لئے نسخہ خاص تیار کرنے سے ہوتی تھی۔ معجونیں اور طے تیار ہوتے اور حکیم صاحب کو منہ مانگے دام مل جاتے۔ جوان کالے ناگ سانپ پکڑنے والوں سے منگوئے جاتے، ایسے کہ ہنڈیا پر سے پکڑا بیٹھے ہی فوں کر کے سیدھے دم کی نوک پر کھڑے ہو جاتے۔ ان کا دبر نکالا جاتا۔ طلائے مار سیاہ بنانے کے لئے میوے چپونے بوتلوں میں بھر کر لائے جاتے۔ طلائے مورچہ سرخ بنانے کے لئے چڑی مار پخروں میں چڑے بھر کر لائے۔ معجون مغز کنجشک تیار کرنے کے لئے بھنگ، چرس۔ افیون۔ گانجا سب مہیا کئے جاتے۔ فلک گیر اور جبوب امساک بنانے کے لئے۔ غرض حکیم کیفیت کا مطب کیا تھا عیاشوں کا اڈا تھا۔ خود حکیم صاحب دونوں ہاتھوں سے جوانی ٹٹلتے تھے۔ چادر ہی میں حکیم کیفیت کی دھوم مچی رہی تھی۔ فخر یہ فرماتے تھے کہ ملی قیس قیس پکارتی پھرتی تھی۔ طائفیں کیفیت کیفیت پکارتی پھرتی ہیں۔ چند بار انہیں کھایا بھی کہ میاں! اتنے بھاگ کر مت چلو کہ بھوکے تو پٹے کے پٹے رہ جاؤ۔ مگر جوانی دیوانی بھلا کب مانتی تھی۔ جب تک تن دوستی رہی یہی میل و بہار رہے۔

پھر وہ وقت آگیا جب ان دونوں سردوں سے جلتی ہوئی شمع کا رشتہ حیات منقطع ہونے لگا۔ امراض خبیثہ نے موقع پاتے ہی چھاپ مارا جسم تو کھوکھلا ہو گیا تھا۔ آسانی سے شکار ہو گیا۔ ۱۹۰۶ء میں مجھے کیفیت سے متعدد بار ملنے کا موقع ملا۔ وہ بہت بیمار تھے مگر ان کی طبیعت کی جولانی اور زبان کی روانی بدستور قائم تھی۔ اس مری ہوئی حالت میں بھی ایک طوائف جناب کی ملازم تھی۔ میں نے کہا: اب تو نائب ہو جاؤ تو انشاء اللہ اچھے ہو جاؤ گے۔ بولے: آکا! امرنا تو ایک نہ ایک دن ہے ہی۔ آخری وقت میں کیا خاک سہاں ہونگے؟ اس وقت تک کچھ پل پھر لیتے تھے۔ کچھ دنوں بعد پلنگ پر پڑ گئے۔ ان کے چھوٹے بھائی میاں حبیب اشعر نے بڑی سعادت مندی سے ان کی خدمت کی۔ بہترین یونانی اور ڈاکٹری

علاج کرنے۔ مگر کوئی افتادہ نہ ہوا۔ ایک دفعہ حالت بہت بگڑی تو انہیں میونسپل ہسپتال میں بھی داخل کیا مگر ہسپتال والوں نے جواب دیدیا۔ گھر واپس لا کر ایک تپ دق کے ماہر کا علاج شروع کیا۔ دراصل یہ ڈاکٹر بھی ناامید ہو چکا تھا مگر بڑی پابندی سے وقت پر آتا اور روزانہ انجکشن لگاتا۔ دو مہینے اور اسی امید دیم میں گزر گئے۔ حالتیں مہنتی اور بگڑتی رہیں اور کوئی اذیت ایسی نہیں تھی جو مریض کو نہ پہنچ رہی ہو۔ پھر چھڑے گل گئے تھے ہر رگ پھول گئی تھی۔ دل کی رفتار میں فرق آگیا تھا۔ حیرتوں خون تھوکتے تھے۔ آخر میں گلا بھی بند ہو گیا تھا۔ ناک میں سے رڑ کی ٹکلی مددہ میں ڈال دی گئی تھی جس سے دودھ یا عرق کے دو چاچے پھپکاری کے ذریعے داخل کئے جاتے۔ اوفہ! مرنا کس قدر مشکل ہے۔ موت نہ جانے کہاں تل گئی تھی۔ اکثر ایسا ہوتا کہ انکی نبضیں چھوٹ جاتیں۔ تنفس رک جاتا۔ آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جاتیں اور گھر میں ردنا پھینچا جاتا مگر وہ ایک دم سے چمک کر کہنے لگتا کیا بات ہے؟ یہ حالت ان کی دونوں جاری رہی۔ میسروں مرتبہ یہ کچھ کر کر رہے ہیں انہیں سہین شربت سٹائی گئی۔ مگر ان میں پھر جان پڑ پڑ گئی۔ آخر آخر میں تو یہ گمان ہو چلا تھا کہ ان میں کوئی سما گیا ہے۔

مرنے سے تین دن پہلے ان سے میری آخری ملاقات ہوئی۔ ناک میں رڑ کی ٹکلی پڑی ہوئی تھی غفلت طاری تھی۔ میاں حبیب نے کہا: شاید بھائی آئے ہیں! آنکھیں کھولیں۔ چہرے پر خفیف سارنگ آیا۔ نہ پھیر کر دیکھا اور بہت خفیف آواز میں بولے: آگاہا! آخری وقت آ پہنچا۔ میں نے دلاسا دیا: نہیں! تم اچھے ہو جاؤ گے! لبوں پر بڑی زہریلی مسکراہٹ نمودار ہو کر معدوم ہو گئی۔ پھر کچھ نہ بولے۔ تیسرے دن سنا کہ رات کو پھولی ہوئی شہ رگ پھٹ گئی اور منہ سے خون بہنے لگا۔ بڑھی ماں نے دوپٹے سے منہ صاف کیا۔ تکیہ پر گردن کا منہ ڈھکیا گیا اور طائر طرح تنفس عنصری سے پرواز کر گیا۔ ہنگاموں بھری زندگی کے بعد اب وہ آرام سے سو رہا تھا۔ میرا طر حصار نوجون۔ حکیم ہاشم جان کیت عمر بھر کی بے قدری کو قرار دے ہی گیا۔

پروفیسر مرزا محمد سعید

صبح اخباروں میں یہ خبر پڑھ کر دل دھک سے رہ گیا کہ پروفیسر مرزا محمد سعید کا آج سوئم ہے! خاموش زندگی! خاموش موت! مرزا صاحب کی علالت مزاج یا مرض الموت کی اطلاع اس سے پہلے کہیں سے نہیں ملی۔ حدیہ کہ پرسوں وہ رحلت فرما گئے اور ان کے سینکڑوں دوستوں اور قدر دانوں کو اس سانحہ ارتحال کی خبر تک نہ ہوئی! انہیں اتنا بڑا مصاحب کمال ہم میں سے اٹھ جائے اور اس کی سادہ فہم تک نہ پہنچے! کتنے بے خبر ہیں ہم لوگ! زندہ قوموں کا یہ شمار نہیں ہوتا کہ اپنے اہل کمال سے غافل ہو جائیں۔ ایسی غفلت مجرمانہ ہوتی ہے۔ شاید یہ ہماری غفلت ہی کی مرزا ہے کہ مرزا صاحب کو یوں ایک ایکی ہم سے چھین لیا گیا۔ عالم کی موت عالم کی موت ہوتی ہے۔ ابھی ہم کو اس کا اندازہ نہیں ہو سکتا کہ مرزا صاحب کے رخصت ہو جانے سے ہمارا کتنا بڑا نقصان ہو گیا ہے۔ اب ان کی عدم موجودگی رہ رہ کر ہمیں ان کی یاد دلائے گی اور وقت کے ساتھ ان کی جدائی کا گھاؤ بڑھتا چلا جائے گا۔ مرزا صاحب بہت ہی خاموش کام کرنے والوں میں سے تھے۔ یعنی اتنے خاموش کہ خود ان کے زمانے کے اکثر لوگ بھی ان کے علمی اور ادبی کارناموں سے واقف نہیں ہوتے۔ دراصل خود مرزا صاحب شہرت سے گھبراتے تھے اور پبلک پلیٹ فام پر آنا پسند نہیں کرتے تھے۔ کام کرتے تھے ستائش کی تمنا اور صلے کی پروا سے بے نیاز ہو کر۔ کام کرتے تھے

اپنی تکلیفیں کے لئے۔ کام کرتے تھے اس لئے کہ انہیں کام کرنا ہوتا تھا۔ فرمائش کام انہوں نے ساری عمر نہیں کئے۔ انہوں نے اب سے ۵۵ سال پہلے سر عبدالقادر کے رسالے "عُزْن" میں مضامین لکھے، مگر شیخ صاحب کی فرمائش پر نہیں، بلکہ جب خود ان کا جی لکھنے کو چاہا۔ مرزا صاحب کسی کو خوش کرنے کے لئے نہیں لکھتے تھے۔ مرزا صاحب پیسے کے لئے بھی نہیں لکھتے تھے۔ پیسے کی تو انہوں نے کبھی پروا ہی نہیں کی۔ بلکہ پیسے کے ذکر پر وہ چڑھ جاتے تھے اور انہیں سنانا مشکل ہو جاتا تھا۔ لاہور کے اکثر پبلشرزوں نے مرزا صاحب سے کتابیں لکھوانی چاہیں اور بڑی بڑی رقمیں پیش کیں مگر مرزا صاحب نے انہیں ایک لفظ بھی لکھ کر نہیں دیا۔ اور جب اپنا پہلا ناول "یاسمین" لکھا تو اپنے ایک شاگرد پبلشر کو بے مزد دے دیا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد دوسرا ناول "خواہشتی" لکھا۔ اسے بھی بغیر کچھ لئے دیئے چھپوا دیا۔ ایک پبلشر صاحب لاہور سے دلی غصے اس غرض سے آئے تھے کہ مرزا صاحب سے ناول لکھوائینگے۔ میں نے انہیں سمجھایا کہ مرزا صاحب نہیں لکھیں گے، مگر وہ بڑے بڑے معنفوں کو خرید چکے تھے، نہ مانے۔ بوائے ہم انہیں ایک ناول کا ایک ہزار روپیہ دینگے تو وہ کیوں نہیں لکھیں گے؟ یہ وہ زمانہ تھا کہ دو ڈھائی سو روپے میں اچھا خاصہ ناول پبلشر کو مل جاتا تھا۔ چنانچہ مجھے اپنے ساتھ لے کر مرزا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ میں نے تعارف کرایا۔ مرزا صاحب کا ہاتھ اٹھکا۔ پبلشر صاحب نے چھوٹے ہی ناول لکھنے کی فرمائش کی۔ مرزا صاحب بڑے ٹھنڈے مزاج کے آدمی تھے۔ بوائے "آپ میرے ناول کے پانچ ہزار دے دیں گے" دس ہزار دے دیں گے۔ مجھے یہ منظور نہیں ہے کہ جو کام کر رہا ہوں اسے چھوڑ کر آپ کے لئے ناول لکھوں۔ پانچ دس ہزار کی بات سنکر پبلشر صاحب کی سٹی گم ہو گئی اور دو چار منٹ پہلو بدل کر رخصت چاہی۔ مرزا صاحب اس ذلّت میں اپنی معرکتہ آلا را کتابت مذہب اور باطنیت لکھ رہے تھے۔ جسے مکمل ہونے کے بعد ان کے

دوست پروفیسر تاجور نجیب آبادی ان سے ملے گئے اور لاہور سے وہ کتاب مٹانے ہوئی۔ مرزا صاحب کا یہی صرت ایک علی کارنامہ ہے مگر ایسا کارنامہ کہ اردو کی اگر ستوا عہدہ کتابیں چھپانی جائیں تو ان میں مذہب اور باطنیت کو ضرور شریک کرنا پڑے گا۔ مرزا صاحب دلی کے شرفا کے ایک منتول خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ ترا با بیرم خاں سے آگے بڑھ کر ایک راستہ سید سے ہاتھ کوڑ جاتا ہے اسی کے نکتہ پر مرزا صاحب کا آبائی مکان تھا۔ اسی علاقے میں سر سید احمد خاں کا قدیم مکان بھی تھا۔ سر سید سے بھی مرزا صاحب کی عزیز داری تھی، اور مٹی ذکار اللہ سے بھی انکی قرابت تھی ہو گئی تھی۔ پچاس ساٹھ سال پہلے دلی کے مسلمان شرفا میں انگریزی تعلیم کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ مگر سر سید نے مسلمانوں کے اس غلط نظریے کی بہت کچھ اصلاح کر دی تھی۔ اسی زمانے میں دلی کے دو جوانوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے علمی حلقوں میں نمود حاصل کی۔ ایک پروفیسر مشتاق احمد زاهدی تھے اور دوسرے پروفیسر مرزا محمد سعید۔ مرزا صاحب نے اس صدی کے آغاز میں لاہور کے گورنمنٹ کالج میں تعلیم حاصل کی۔ ان کے استادوں میں علامہ اقبال بھی تھے جن سے ان کے مخلصانہ تعلقات آخر دم تک قائم رہے۔ انگریزی ادبیات میں ایم۔ اے کی سند لینے کے بعد مرزا صاحب نے ۱۹۰۶ء میں سال دو سال علی گڑھ میں پڑھایا اور اسکے بعد گورنمنٹ کالج لاہور ہی میں انگریزی کے پروفیسر ہو گئے۔ پنجاب کے بشیر اعلیٰ عہدہ دار مرزا صاحب کے شاگرد تھے۔ پطرس اور تاج نے بھی مرزا صاحب سے اکتسابِ علم کیا۔ بعد میں پطرس خود انگریزی کے پروفیسر ہو گئے تھے، مگر اپنی غیر معمولی قابلیت و ذہانت کے باوجود مرزا صاحب کی علمیت کے آگے اپنے آپ کو بیچ سکتے تھے۔ میں نے بارہا پطرس کو مرزا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتے دیکھا ہے۔ پطرس کو میں نے کسی اور کا اتنا ادب و احترام کرتے نہیں دیکھا، یہاں تک کہ دلیرانہ ہند کا بھی۔

پطرس کے سلسلے میں دو ایک دلچسپ واقعات یاد آگئے۔ پطرس آل انڈیا ریڈیو کے ڈائریکٹر جنرل ہو گئے تھے مگر پڑانے دوستوں سے رسم و رواج میں ذرا بھی فرق نہ آنے پایا تھا۔ مرزا صاحب کو انہوں نے کسی نہ کسی طرح آمادہ کر لیا تھا کہ ریڈیو سے کبھی کبھی تقریر نشر کیا کریں۔ دو ایک تقریریں ان کے بعد مرزا صاحب نے کانٹریکٹ واپس کرنے شروع کر دیئے۔ شدہ شدہ بات پطرس تک پہنچی۔ حاضر ہو کر وجہ دریافت کی۔ مرزا صاحب نے فرمایا: "تمہیں اصلاح دینے کے بعد مجھے یہ منظور نہیں کہ تمہارے شاگرد مجھے اصلاح دیں۔" پطرس نے بڑی محاورت کی مگر مرزا صاحب آمادہ نشر کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہوئے۔ اگلے دن دفتر میں قیامت آگئی۔ پورے اسٹاٹ کو جمع کر کے انہوں نے براڈ کاسٹنگ کے حسن اخلاق پر ایک طویل کچر دیا۔ بات تو کھل ہی گئی تھی، اسٹیشن ڈائریکٹر نے تقریریں ان کے انچارج کو بلا کر کہا کہ: "اگر اپنی خیر چاہتے ہو تو مرزا صاحب کو منکر لاؤ۔" اسکو معلوم نہیں تھا کہ مرزا صاحب پطرس کے استاد ہیں۔ حسب دستور اپنی کارروائی دکھانے کے لئے اُس نے ان کے مسودے میں سے دو ایک فقرے نکال دیئے تھے۔ ان فقروں کا کہنا اُس کا نوکری سے نکالے جانے کا ہمیش مجیم ہو گیا۔ بھانگا مرزا صاحب کی خدمت میں۔ معافی مانگی، ہاتھ جوڑے مرزا صاحب کو مانے۔ بولا: "تو حضرت میری نوکری گئی۔ بال بچے بھوکے مرینگے اور آپ کو دعائیں دیں گے۔" مرزا صاحب کے کان کھڑے ہوئے۔ بولے: "یہ تو میں نہیں چاہتا۔" اُس نے کہا: "اگر آپ یہ نہیں چاہتے تو اس کانٹریکٹ پر دستخط کیجئے۔" مرزا صاحب نے فوراً دستخط کر دیئے۔

جنگ کے زمانے میں حسن اتفاق سے دلی میں لاہور کے میجر ادیب اور شاعر ریڈیو میں یاد دہرے سرکاری محکموں میں جمع ہو گئے تھے۔ پطرس کی تحریک پر ایک محدود ادبی حلقہ قائم کیا گیا جس میں ڈاکٹر تاثیر، رفیع احمد رفیق، حامد علی خاں، حمید احمد خاں،

چراغ حسن حسرت، محمود نظامی، غلام عباس، انصار ہامری وغیرہ شریک کئے گئے تھے۔ ہر مہینے اس کا ایک جلسہ ہوتا تھا، کبھی پطرس کے گھر پر اور کبھی ڈاکٹر تاثیر کے گھر پر۔ اس میں ایک مقالہ کسی ادبی موضوع پر پڑھا جاتا اور اس پر گفتگو ہوتی۔ ایک جلسے میں محمود نظامی نے مقالہ پڑھا۔ اس میں مرزا صاحب بھی تشریف لائے تھے۔ ڈاکٹر تاثیر نے گفتگو کا آغاز کیا۔ پطرس خاموش رہے۔ مرزا صاحب کے درخواست کی گئی کہ کچھ فرمائیں۔ مرزا صاحب بحث مباحثے کو ناپسند کرتے تھے اس لئے بڑی محتاط رائے دیتے تھے۔ انداز کچھ ایسا ہوتا تھا: "نہیں یہ بات تو نہیں مگر خیر اب بھی ہوتا ہے۔" پطرس کو خوشی نہ تھی۔ فیض کو اشارہ کیا۔ وہ مرزا صاحب کے زیادہ واقف نہیں تھے، بات کاٹ کر فوراً شروع ہو گئے: "یہ تو آپ کو معلوم ہی ہو گا کہ رومی تہذیب یونانی تہذیب کے بعد ابھری۔ اتنا تو ان کا کہنا اور مرزا صاحب کا جلال میں آجانا: "جی ہاں، میں یہ جانتا ہوں اور یہ بھی جانتا ہوں کہ"۔ پڑائی تہذیبوں کی تاریخ کا ایک دریا تھا کہ اٹھا چلا آتا تھا۔ اس دن مجھے بھی اندازہ ہوا کہ مرزا صاحب کے سینے میں علم کی کتنی دولت بھری پڑی ہے۔ فیض پشیمانی سے بار بار مرزا صاحب کی طرف دیکھتے تھے۔ پطرس دل ہی دل میں ہنس رہے تھے کہ دیکھا اسے کہتے ہیں علم کا سمندر۔ ہم سب دم بخود ماکت بیٹھے مرزا صاحب کو آنکھیں پھاڑے دیکھ رہے تھے۔ پطرس نے مرزا صاحب کے جلال کو ختم کرنے کے لئے فوراً چائے کا سامان رکھوانا شروع کر دیا۔ اور خدا خدا کر کے مرزا صاحب کا جلال رفع ہوا۔

مرزا صاحب گھنٹوں مطالعہ کرتے تھے۔ ان کے کتب خانے میں ہر علم کی کتب موجود تھیں۔ ہر مہمت درس و تدریس کی تھی۔ اس لئے نئی سے نئی کتاب ہتھتے رہتے تھے۔ فرماتے تھے کہ: "اگر میں اتنا مطالعہ نہ کروں تو ان انگریز پروفیسروں کے آگے کیسے ٹھہر سکتا ہوں؟" پٹن لینے کے بعد بھی ان کا واحد مشغلہ مطالعہ کتب ہی رہا۔ ان کا یہ

شغل اب تک جاری تھا۔ نیشن کا بڑا حصہ کتابیں خریدنے میں صرف کر دیتے تھے۔
مرزا صاحب کی زندگی بڑی سیدھی سادی تھی۔ کروڑوں یا لاکھوں روپے سے بھی نہیں
رہے۔ گھر کی سواری ہم نے ان کے پاس کبھی نہیں دیکھی۔ معدے کے مریض تھے، پیدل
زیادہ چلتے تھے۔ صبح بٹنے ضرور جاتے تھے۔ رات کو جلدی سو جاتے تھے کھیل تماشے،
سینما، تھیٹر، کچھ نہیں دیکھتے تھے۔ خدا کے فضل سے گھر کا آرام انہیں میسر تھا۔ ان کی
بیگم بھی ادبی ذوق رکھتی تھیں۔ دو ایک ناول ان کے بھی مشائخ ہو چکے ہیں۔ اولاد
سعادت مند، بیوی سلیقہ شعار، نیشن انٹی کرپشن چلے گئے کسی کی محتاجی نہیں۔ کھانا سادہ
لباس سادہ، دین بہن سادہ۔ پھر احتیاج ہو تو کس بات کی؟ قلب مطمئن کی دولت سے
مال مال تھے۔

ریڈیو پاکستان کراچی سے ۱۲ سال پہلے ایک پروگرام دانشکدہ شروع کیا گیا
تھا جس میں چار دانشور بلائے جاتے تھے اور سننے والوں کے سوالوں کے جواب فی البدیہہ
دیا کرتے تھے۔ میں میرے سوالات کی خدمت انجام دیتا تھا۔ میں نے سوچا کہ مرزا صاحب اگر
اس پروگرام میں شرکت فرمنا منظور کر لیں تو اس پروگرام کو چار چاند لگ جائیں۔ چنانچہ
میں مرزا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ عرض کیا: "ماستیکر جیسٹم ہوئے۔ فرمایا: "آدمی شہرت
کے لئے کوئی کام کرتا ہے یا دولت کے لئے۔ مجھے نہ اس کی ضرورت ہے نہ اس کی۔"
میں نے قدری کر لی، مرزا صاحب اس سے مس نہ ہوئے۔ مرزا صاحب بہت قاعدے قرینے
کے آدمی تھے۔ جو کہہ دیتے اس سے نہ پھرتے۔

قیام پاکستان سے پہلے جب مسلم لیگ نے دور پکڑا تو مرزا صاحب نے سیاست میں بھی حصہ
لینا شروع کر دیا اور صوبائی مسلم لیگ کے صدر منتخب ہوئے اور مسلم لیگ کا ڈانس کے نمبر بھی بنے
گئے۔ کراچی یونیورسٹی قائم ہوئی تو اسکے مشیر مقرر ہوئے اور جب پاکستانی ادیبوں کا گلہ نشہ
میں بنایا گیا تو مرزا صاحب ہی نے اس کے پہلے اجلاس کی صدارت فرمائی۔

مرزا صاحب بظاہر علیل نہیں معلوم ہوتے تھے۔ اکبر اڈیل، مہبلہ رنگ، گشاہہ پشانی
گھنی بھوڑوں کے سلسلے میں بڑی بڑی روشن آنکھیں، خساروں کی ہڈیاں ابھری ہوئیں، کتڑا
موتھیں۔ سب سے تو سامنے کے دو چار دانت ٹوٹے ہوئے نظر آتے مگر بڑے نہ لگتے تھے۔ ڈارمی
منڈی ہوئی۔ دھان پان سے آدمی تھے۔ سلسلے میں جب وہ ۶۶ سال کے تھے تب ہی وہ دیے کے دیے
عمر ۶۶۔ ۶۷ سال کی بھی سلسلے میں جب وہ ۶۶ سال کے تھے تب ہی وہ دیے کے دیے
ہی تھے۔ انہیں زلے کا شکوہ یا صحت کی شکایت کرتے کبھی نہیں سنا۔ سب سے سبب کہ باتیں کرتے
رہتے تھے سبنا ہے کہ دئی کے جن دو چار نوجوانوں نے سب سے پہلے سوٹ پہننا شروع کیا ان میں
سب سے نفیس سوٹ مرزا صاحب ہی کا ہوتا تھا۔ مگر میں نے کچھ ۶۶ سال میں انہیں ہمیشہ
شیر دانی ہی پہنے دیکھا۔ انگریزی ان کا اور عینا بھونا تھا مگر جب گانٹھنے کے لئے کبھی انگریزی
میں بات نہیں کرتے تھے، بلکہ ان کی گفتگو میں انگریزی کے الفاظ بالکل نہیں آتے پاتے تھے۔
چالیس سال کی عمر کے بعد ہی ان کے دونوں ہاتھوں میں غشا آگیا تھا، اس لئے گلے میں
انہیں رحمت ہوتی تھی۔ خوش اخلاق اور خوش مزاج آدمی تھے مگر زیادہ دوست بنانے
کے قابل نہیں تھے۔ آپ بھلے اور اپنا گھر بھلا۔

موت برحق ہے۔ مرزا صاحب کو ہے مگر مرنے مرنے میں فرق ہوتا ہے۔ مرزا صاحب نے
خاصی بھی عمر پائی مگر ان کی وفات کا صدمہ اس لئے زیادہ ہے کہ ایسے قابل، ایسے شریف،
اور ایسے دھندلار لوگ زمانہ اب پیدا نہیں کرے گا۔ انوکس کر پروفیسر مرزا محمد سعید اب ہاں
میں جہاں ہماری نیک آرزوئیں رہتی ہیں۔ ایسی جامع العلوم ہستی سے محروم ہونے کا میں جتنا
بھی غم ہو کم ہے۔ ۶

اب کہاں لوگ اس طبیعت کے!

استاد بندو خاں

استاد بندو خاں اب سے کوئی شتر سال پہلے دلی کے موسیقاروں کے ایک نامور گھرانے میں پیدا ہوئے۔ یہ گھرانہ شاہی وقتوں میں متروک سمجھا جاتا تھا۔ اس کے اکثر افراد متوسلین شاہی میں شریک تھے۔ یوں تو اس گھرانے میں گایک بھی پیدا ہوئے، مگر ان کا حقیقی کلام سارنگی نوازی ہی تھا۔ استاد کے والد علی جان خاں بھی سارنگی بجاتے تھے اور دلی کے خاصے مشہور سارنگی نوازوں میں شمار ہوتے تھے، مگر ۱۸۵۷ء کے بعد جس استاد نے اس خاندان کا نام روشن کیا، وہ من خاں تھے۔ یہ اپنی بے مثل سارنگی نوازی اور علمی معلومات کی وجہ سے شمس موسیقی کہلائے۔ انہوں نے ایک بڑی سارنگی بھی اختراع کی تھی جس کا قد و قامت عام سارنگیوں سے ڈیڑھ اٹھا۔ اس میں کھرج کی دو سٹپلنگ زیادہ رکھی گئی تھیں۔ اور موٹے ردوے کے تار ان کے لئے چڑھائے تھے۔ یہ سٹپلنگ چیلو کی آواز دیتی تھیں اس کا نام انہوں نے "سرساگر" رکھا تھا۔ اس میں پانچ سٹپلوں کے علاوہ بائیں ہاتھ سے بھالا بجانے کے لئے بھی تار لگائے گئے تھے۔ سرساگر میں بھاری سے بھاری اور ہلکی سے ہلکی آواز نکل سکتی تھی۔ یہ ساز بہت مشکل ہونے کی وجہ سے محنت طلب زیادہ تھا۔ اس لئے استاد من خاں کے بعد روانی سے اسے کوئی نہ بجا سکا۔

من خاں بڑے نازی پر سیز گار آدمی تھے۔ ان کے گھر کا دستور شرفائے دہلی جیسا تھا۔ اس طبقے کا چھاپا پن ان کے ہاں بالکل نہیں تھا۔ من خاں کی جب شہرت ہوئی تو

بندوستان کی تمام ریاستوں سے ان کی مانگ ہونے لگی۔ چنانچہ ان کی سارنگی کشمیر سے میسور اور بڑودے سے نیپال تک گئی۔ خاں صاحب نے کچھ عرصے کے لئے میسور میں ملازمت بھی قبول کر لی تھی، مگر جلد ہی بند میں ان کا جی نہیں لگا اور دلی واپس آ گئے۔ آخر میں پیلا سے وابستہ ہو گئے تھے۔ جب صنعت بڑھ گیا تو دلی آ گئے اور یاد الہی اور موسیقی کا درس دینے میں مصروف رہتے تھے۔ بندوستان اور پاکستان میں ان کے سیکڑوں شاگرد ہیں، مگر انہوں نے اپنے علم و فن کی دو عظیم یادگاریں بھی چھوڑیں۔ ایک ان کے خلیف اکبر استاد چاند خاں اور دوسرے ان کے بھانجے اور خلیش استاد بندو خاں۔ چاند خاں نے گونے میں کمال حاصل کیا اور استاد بندو خاں نے سارنگی بجانے میں۔

علی جان خاں اپنے بیٹے بندو خاں کو خود زیادہ تعلیم دے سکے۔ انہوں نے بندو خاں کو متن خاں کا شگرد کرادیا۔ سو بہار بردا کے چکنے چکنے پات، بندو خاں شمس موسیقی کے فیض سے ذرے سے آفتاب بنے۔ استاد کا نام روشن کیا اور خود بھی اتنا نام کمایا کہ رہتی دنیا تک ان کا نام باقی رہے گا۔

استاد بندو خاں فراتے تھے کہ ہمارے ہاں تعلیم کا سلسلہ پیدا ہوتے ہی شروع ہو جاتا ہے، وجہ یہ ہے کہ گھر کے سارے مرد گاتے بجاتے ہیں۔ ایک اس کو نے میں گارہا ہے، ایک اس کو نے میں سارنگی نے بیٹھا ہے۔ نئی سے نئی تان بن کر آرہی ہے۔ کئی کئی گھنٹے روزانہ یہی ہنگامہ برپا رہتا ہے۔ یہ سب آوازیں بچے کے کان میں پڑتی رہتی ہیں۔ اور موسیقی کا شعور بڑھتا رہتا ہے۔ جو شمس بیٹھا ہے ہی باقاعدہ تعلیم شروع ہو جاتی ہے۔ پہلے گلے سے کہلویا جاتا ہے تاکہ سر پرچے ہو جائیں۔ اس عرصے میں جسم میں توانائی بھی آ جاتی ہے کہ سارنگی اور گز سنبھل سکے۔ پھر استاد کی ہدایت کے مطابق سارنگی پر مشق کی جاتی ہے۔

بندو خاں سات آٹھ سال کی عمر میں سارنگی پر ہاتھ دوڑانے لگے تھے۔ کئی کئی گھنٹے روزانہ محنت کرتے۔ چاند خاں صاحب نے بھی سارنگی شروع کی تھی، مگر ان کی طبیعت گانے

کی طرف زیادہ مائل تھی۔ اس لئے انہوں نے ممن خاں صاحب کے مشورے پر گانے کی تعلیم پائی۔ بند و خاں کے شوق اور صلاحیت کو دیکھ کر ممن خاں نے انہیں سارنگی کے سارے نشیب و فراز سکھادیئے۔ بند و خاں نے محنت کر کے اپنا ہاتھ رواں کر لیا۔ ذہن رسا پایا تھا۔ محنت سے دن دوئی رات چوگنی ترقی ہوئی۔ چلی گئی۔ ان کا کام بھی شہرت کے پر لگا کر اڑا۔ اور ان کی بھی جگہ جگہ سے ملاؤ ہونے لگی۔ موسیقی کے دلگوں اور کانفرنسوں میں شریک ہونے لگے، مگر جب کبھی ماموں کو اپنی دانست میں کوئی نادر بات سارنگی پر سناتے تو وہ ہوں ہوں کر کے ٹال دیتے یہ سمجھ جاتے کہ ابھی کسر باقی ہے، محنت اور بڑھادیتے۔ ان کے کنبہ داروں کا بیان ہے کہ رات کو سوتے بھی تو سارنگی ساتھ لے کر سوتے۔ اور یہ تو ہم نے بھی دیکھا ہے کہ استاد بازاریں سے جا رہے اور چادرے کے نیچے ان کی چھوٹی سارنگی کندھے میں پٹی ہے اور اسپر مائیں ہاتھ کی انگلیاں کھٹکھٹ چل رہی ہیں۔ استاد کے ہاتھ پاؤں پر ایک موٹا سا لٹا تھا۔ فرماتے تھے کہ یہ دیا من کرنے کے زلمے کی نشانی ہے۔ اٹھارہ گھنٹے روز بیس گھنٹے روز قفلت کئی کی بھیجک بیٹھتے تھے۔

استاد ممن خاں نے انہیں نصیحت کی تھی کہ علم جہاں بھی ملے بے ہجوبک لے لینا، اس میں عار و کرنا۔ چنانچہ بند و خاں نے بھائوں اور بھینٹی چماروں تک سے چیزیں سیکھیں۔ اس سے انہیں یہ فائدہ ہوا کہ ہر قسم کی موسیقی ان کے پاس آگئی۔ سچی لگن اور کوچ نے ان کے موسیقی کے سم سم کے دروازے کھول دیئے۔ دُھر پدے لے کر چ پانیوں اور دوہوں تک ان کے پاس ہر قسم کی چیزوں کے ڈھیسر لگ گئے تھے۔ اسی زلمے میں انہیں پتا چلا کہ دلی دروازے کے باہر کوئلہ فیروز شاہ کی ایک ٹوٹی ہوئی کوٹھری میں ایک درویش رہتے ہیں۔ ان کے پاس علم کی بہت دولت ہے۔ نام احمد شاہ ہے۔ اپنے استاد سے ان کے متعلق دیا منت کیا تو معلوم ہوا کہ کام کے کرنے والوں ہی میں سے ہیں۔ بڑے گنی گنی آدمی ہیں مگر قلب اکٹ گیلے، دنیا کو سچ دیا ہے اور ان پر جذب کی کیفیت طاری رہتی ہے۔ اگر ان

سے کچھ حاصل کر سکو تو ضرور کرو۔ خاں صاحب نے ان کے پاس آنا جانا شروع کر دیا۔ ہاتھ پاؤں سے خدمت بھی کی، کوئی توجہ نہ ہوئی، مگر یہ بھی دھن کے پتے تھے۔ برابر جاتے رہے۔ ان کی دلمیز کی مٹی لے ڈالی۔ جب بہت عرصہ ہو گیا تو پتھر میں جو تک لگی ہوئے۔ تو کیوں میرے پیچھے پڑا ہے؟ انہوں نے دل کی بات کہی۔ کہنے لگے۔ میں نے دنیا کو چھوڑ دیا ہے، مگر دنیا مجھے نہیں چھوڑی۔ اس سے مہارے کام میں فرق آتا ہے مگر تو مستحق معلوم ہوتا ہے، ہم تجھے کچھ دیں گے صبح چار بجے آجایا کر۔ اس زمانے میں دلی دروازہ رات کو بند ہو جایا کرتا تھا اور صبح چھ بجے سے پہلے نہ کھلتا تھا۔ خاں صاحب نے سوچا اگر اب چوکے تو پھر یہ موقع ہاتھ نہ آئے گا۔ سوچتے سوچتے ایک تدبیر سمجھ میں آئی۔ رات کے دو بجے کیلے جانے والے قصائیوں اور راسوں کے لئے دروازہ کھلتا تھا۔ انہوں نے قلعے کے میسج جی کو رضامند کر لیا کہ مجھے بھی قصائی بنا کر اپنے ساتھ لے جایا کرو۔ اب یہ رات کے دو بجے سے دیران سُنسان کوٹلے میں جا بیٹھتے۔ اور جب چار بجے تو شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہو جاتے۔ یہ سلسلہ سالہا سال جاری رہا۔ موسیقی کے امر اور موز حل ہوتے رہے۔ بند و خاں کا یہ زمانہ ایک طرح سے ان کے حُسن کا زمانہ تھا۔ نیند آنکھوں سے نہیں مقدر سے اُڑ گئی تھی۔ دن رات اسی کی چٹیک لگی رہتی۔ بس سارنگی ہے اور بند و خاں۔ اس غرور و غمن اور مشق و مزاوت سے سارنگی کے سارے امکانات پر اباندہ کر سامنے آ گئے۔ اس کے بعد خاں صاحب نے سوچا کہ سارنگی میں دوسرے سازوں کا باج کس طرح ڈھالا جاسکتا ہے؟ ایک ایک ساز کے باج پر غور کرتے اور اسے سارنگی میں اُتارنے کی کوشش کرتے۔ چوندہ یا بندہ۔ خاں صاحب نے مین، رباب، الغوزہ، دلربا، ستار، سب کا باج سارنگی میں منتقل کر لیا۔ یہ ان کا ایک ایسا زبردست کارنامہ تھا جس نے سارنگی کو سورنگی بنا دیا۔ صدیوں سے سارنگی صرف گھنے سے کچی چلی آرہی تھی۔ بند و خاں نے اس میں انگلیوں اور گز کی ضرب سے بجانے کے اصول داخل کئے۔ سارنگی بجانے والے ہاتھ کے ناخن

تار کے پہلو سے ملا کر کھکاتے ہیں اور اس سے سروں کا آثار چھٹاؤ پیدا ہوتا ہے۔ ہندو خاں نے اس پرانے اصول کی پابندی بھی کی اور ستار دلبا، بین اور رباب کی طرح تار پر انگلیاں چلانے کا نیا اصول بھی وضع کیا۔ انگلیوں کی ضرب (Tapping) جیسے ہارمونیم میں لگائی جاتی ہے۔ سارنگی میں بھی لگائی شروع کر دی۔ ان سب جدید اصولوں کو سارنگی میں کامیابی سے پیش کرنے میں انہیں ایک عمر صرف کرنی پڑی اور دنیا یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ ہندو خاں نے سارنگی کو واقعی "سورنگی" بنا دیا اور سارنگی کا بول بالا کر دیا۔

خاں صاحب کہتے تھے کہ میں کتنے ہی نکل بجا چکا تھا اور تقریباً سارے نامی گویوں کی سنگت بھی کر چکا تھا مگر جب ماموں کو سننے بیٹھتا تو وہ جی کھول کر اب بھی داد نہ دیتے۔ میں سمجھ جاتا کہ اب بھی کوئی کسر باقی ہے۔ علم بھی میرے پاس کافی جمع ہو گیا تھا اور میرے کس بل اور دم ختم بھی لچھے تھے۔ پھر کیا بات تھی کہ ماموں خوش نہ ہوتے تھے۔ سوچتے سوچتے دھیان آیا کہ سروں کے جو نازک مقام ہیں وہ ابھی تپنے میں نہیں آئے ہیں۔ چنانچہ سرتیوں اور مینڈسوت کی ٹوہ لینی شروع کی اپنے تمام علم کو پیچھے چھپانا۔ جتنا کر کرا تھا سب الگ کیا ماس بات پر غور کیا کہ بڑے گانے بجانے والے کس راگ کو کس طرح سے بتاتے تھے۔ مثلاً درہاری کی گندھار اور دھیوت اپنے مقررہ مقام سے ہٹ کر لگتی ہے تو وہ کس سُر کی مقام ہے؟ اسی طرح ہر راگ پر دوبارہ محنت کی اور اپنے سارے راگ صحیح کئے۔ جب اس کی محنت کرنی تو ماموں کو پھر ایک دن سننے بیٹھا۔ خوش ہو کر کھڑے ہو گئے اور گلے لگا کر بولے بیٹا اب تم ہمارا ہو گئے۔ تم نے اس علم کے بحید کو پالیا۔ گانے بجانے میں رس بڑی چیز ہوتی ہے۔ کھانا کتنا ہی عمدہ پکا ہوا کیوں نہ ہو، اگر اس کا آب و ملک ٹھیک نہ ہو تو وہ کس کام کا؟ سُر کا مقام اور سُر کی مقدار ہی تو اصل چیز ہوتی ہے۔ اپنے گانے بجانے والے اور اچھے سنکار اسی بات کو دیکھتے ہیں۔ چنانچہ گھلاؤ، مینڈسوت، گڈا دھاک، داب گانس کے بغیر سارنگی میں مزہ پیدا نہیں ہوتا۔ راگ اس طرح پسنا چاہئے جیسے کھل میں موٹی پستا

ہے۔ اب بہتارا کام کھرا ہو گیا۔ اللہ نے چاہا تو اب کہیں ہند نہ ہو گئے۔ چنانچہ ہندوستان کے تمام نامی استادوں کی صداقتاً صاحب کو بجانے کا موقع ملا اور ہمیشہ اپنی کا اُن پر کچھ رہ گیا۔ اُن کا این پر کچھ نہ رہا۔

جن بڑے استادوں کی سنگت انہوں نے کی، انہیں ملاؤ خاں (تان رس خاں کے بیٹے) اللہ بندے خاں، ذاکر الدین، آفتاب موسیقی فیاض خاں، عبدالکریم خاں، رجب علی خاں، عبدالوحید خاں، چاند خاں اور بڑے غلام علی خاں کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اللہ بندے خاں لاپتے اور دھڑپینے تھے۔ ایک دفعہ دستور قدیم کے مطابق گانے میں سرگم کہہ رہے تھے اور ہندو خاں ان کی سنگت کر رہے تھے۔ اللہ بندے خاں نے مینڈ کی سرگم خور سروں سے کی تو دھیوت سے گندھار تک کی مینڈ کو دھاگا کہہ کر اس طرح ادا کیا کہ دھا کا بول کھینچ کر گاہر آگیا۔ ہندو خاں نے پوچھا "خاں صاحب یہ دھیوت اتنی لمبی کیسے ہو گئی؟" انہوں نے پہلے کبھی اس مسئلے پر غور نہیں کیا تھا بولے "بزرگوں سے اسی طرح ہوتا چلا آرہا ہے ہم اس میں کیا کر سکتے ہیں؟" ہندو خاں نے کہا "بزرگ بھی تو آخر ان ہی تھے، اگر ان سے کوئی بات رہ گئی ہو تو اسے اب پورا کرنا چاہئے۔" خاں صاحب بولے تو بسم اللہ آپ ہی کچھ کر کے دکھائیے۔ ہندو خاں نے کہا "مینڈسوت کی سرگم کا انداز بدلئے۔ دھیوت سے گندھار تک کی مینڈ کہنی ہو تو اسے دھاگا کے بدلے دھگ کہئے۔ اسی طرح نکھاد سے دھیوت کی مینڈ کو ندھ اور دھیوت سے نکھاد کی مینڈ کو دھن کہئے۔ مدھم سے دھیوت کی مینڈ کو مدھ اور مدھم سے گندھار کو پگ کہئے۔ اسی طرح وہ دو دو سُر ملاتے چلے جائے جن کے درمیان مینڈ کہینی ہو۔" اس تجویز پر سب حیران رہ گئے اور یہ اتنی معقول تھی کہ سب نے اسے منظور کر لیا۔ استاد کا عمل بھی آخر تک مینڈسوت کی سرگم پر رہا۔

ہندو خاں بڑے سیدھے سارے آدمی تھے۔ لڑائی جھگڑے سے دور رہتے تھے۔ ان کا علم و فضل اتنا زیادہ تھا کہ سارے کام کرنے والے ان سے دبتے تھے۔ اور ان کی عزت

کرتے تھے۔ استاد نے اپنے بچانے کے لئے ایک چھوٹی سی سارنگی بانس کی بنائی تھی۔ باج کا تار دودے کے بدلے فولاد کا ڈالا تھا۔ اس سے اس کی آواز میں بڑی چپک آگئی تھی۔ سنگت بھی اسی سارنگی سے کرتے تھے۔ اب وہ بچانے والا تو ان کی سنگت میں دب کر رہ جاتا تھا۔ استاد فیاض خاں جیسا چوکھا گویا بھی آج تک دیکھنے میں نہیں آیا۔ فیاض خاں بندو خاں کی بہت محنت کرتے تھے اور کبھی کبھی چھپر چھپاڑ بھی کرتے تھے۔ فیاض خاں ایک کانفرنس میں گئے تھے۔ بندو خاں ان کی سنگت کر رہے تھے۔ جب بندو خاں کی سارنگی فیاض خاں کے گانے پر چڑھنے لگی تو فیاض خاں نے چپکے سے مزاح کہا: کیا بانس بچایا کرتے ہو؟ بندو خاں نے ہنسر کہا: یہ بانس کبر رہا ہے۔ ہندوستان میں کتنے کوڑھ ہیں۔

مہاراجہ اندور کے ہاں جہولی کے موقع پر گانے بچانے کا بڑا عظیم الشان جلسہ ہوتا تھا۔ سار بندوستان کے چہیدہ فنکار جمع ہوتے تھے۔ میں میں پچیس پچیس ہزار کے انعام استادوں کو ملتے تھے۔ سنگیت سمراٹ استاد جلی خاں اپنے وقت کا بڑا کڑوا گویا تھا۔ گھنٹوں دُست گاتا تھا۔ اور ایک سے ایک نئی لاتا تھا۔ ایک مہولی میں جب رجب علی خاں گانے بیٹھے تو ان کے ساتھ سارنگی بچانے کے لئے مہاراج نے بندو خاں کو بٹھا دیا۔ دونوں کی چڑھتی جوازی، ریاضا، نیچے ہوئے۔ گویے کو یہ دھم کہ گلے کا ساتھ بھلا ہاتھ کیا کرے گا۔ اور سارنگی نواز اس ترنگ میں کہ تہا اسارا علم میرے ناخنوں میں ہے۔ جو گانا بجانا شروع ہوا ہے تو وہ بٹھا ہے نہ یہ اور تانیں وہ بن کر آرہی ہیں کہ ساری محفل چرکی جا رہی ہے۔ ہاتھ گلے کا ساتھ شاید ہی کبھی ایسا ہوا ہو جیسا اس دن ہوا۔ دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ دونوں ایسے گئے ہوئے تھے جیسے بلبلوں کی پالی ہو رہی ہو۔ نو گھنٹے تک یہ کچر جاری رہی۔ کانٹے کی کشتی ہو رہی تھی مگر نہ آرہی تھی نہ پار۔ آخر مہاراج نے دونوں کو انعام دے کر برابر چھڑا دیا۔

بندو خاں نے سارنگی کی ساخت کے بھی تجربے کئے تھے انہوں نے مختلف قدر و قیمت کی سارنگیاں مختلف قسم کی لکڑیوں کی بنائیں اور انہیں بچایا کر دیکھتے رہے پھر انہیں خیال آیا

کہ بانس کے ریشے سیدھے اور لمبے ہوتے ہیں۔ ذرا موٹے بانس کی دو فٹ پور پر ایک سارنگی بنائی۔ اس پر دودے (تانت) کے تار چڑھائے، سارنگی نہیں ہوئی۔ فولاد کے تار چڑھائے۔ بنایت عمدہ آواز پیدا ہوئی۔ پھر مختلف قسم کے بانس منگوائے اور ان پر تجربے کرتے رہے۔ ایک بانس کی پور برہما سے بھی منگوائی تھی۔ اس کا قطر کوئی چھ سلت اپنچ ہو گا۔ یہ سارنگی بھی خاصی اچھی ہوئی مگر دہلی بانس کے مقابلے میں ٹھس رہی۔ آخر میں انہوں نے بانس کی دوسارنگیاں اپنے لئے مخصوص کر لی تھیں۔ اپنی کو بچایا کرتے تھے۔ اور اپنے استاد من خاں کی بڑی سارنگی دوسرے گھر بھی بچایا کرتے تھے۔ مگر ان کا اصل جوہر بانس کی چھوٹی سارنگی ہی پر کھلتا تھا اور ریڈیو پر تو ان کی سارنگی کچھ عجیب و غریب دلکش چیز بن جاتی تھی۔

بندو خاں کی قدر بھی ایسی ہوئی کہ آج تک کسی سازندے کی نہیں ہوئی ہزاروں پیسے لیاستوں اور رئیسوں سے انعام میں پایا۔ ۲۷ سال اندور میں ملازم رہے۔ مہاراج کے محبوب فنکار تھے۔ جب مہاراج گدھی سے علیحدہ ہو کر امریکہ چلے گئے تو بندو خاں بھی ملازمت ترک کر کے دلی چلے آئے۔ ان کی پیشین انہیں برابر ملتی رہی۔ پاکستان چلے آنے کے بعد بھی بلکہ مرتے دم تک مزاج درویشانہ پایا تھا۔ روپے پیسے کبھی محبت نہیں کی جو کچھ کیا، اماں کو دیا اور اماں کے مرنے کے بعد بیوی کو، عزیز گنبد داروں کی امداد کرتے رہتے تھے۔ کسی عیب میں نہیں تھے۔ چاند و پینے کی لت نہ جانے کہاں سے لگ گئی تھی۔ اس میں البتہ کچھ روپیہ ضائع ہوا اور صحت کو بھی نقصان پہنچا۔ بڑے مرتخاں مرچ آؤنی تھے اور باتیں بھولی بھالی کرتے تھے۔ منکر المزاج اتنے کہ کبھی آنکھ ملا کر بھی بات نہ کرتے تھے۔

کانفرنسوں میں ہزار روپیہ روزانہ پر جلتے تھے۔ ان کے قدر دان کبھی سے ہوائی جہاز چارٹر کر کے کلکتہ کانفرنس میں انہیں منسنے جاتے تھے۔ فواب رامپور اکثر بلایا کرتے اور پانسو روپے روزانہ دیتے۔ دلی کے ہندو دس ائے دن بلکرتے، دو دو سو چار سو روپے دیتے۔ سیٹھ برلا تو خوش ہو کر کہتے۔ بندو خاں اگر تم بندہ ہوتے تو اس وقت تمہیں سونے میں تول دیتا۔ سردار ٹیل کو جب

دل کا عارضہ ہوا تو نہ جانے کس طبیب کے مشقے پر انہوں نے بید و خاں کو اپنی کوٹھی پر بلا کر دروازہ سارنگی سنٹی شروع کی۔ خدا کی قدرت کہ انہیں اتفاق ہو گیا۔ ہندوستان میں جب ۱۹۴۷ء میں مسلمانوں کا قتل عام ہوا تو بید و خاں نے گجرات پاکستان آنے کا قصد کیا۔ بڑی مشیل کو اس کی کسی طرح اطلاع ہو گئی تو انہوں نے پینا بھیجا کہ تم بالکل نہ گھبراؤ۔ تمہارے گھر پر بلٹری کا پہرہ لگو دیا جائیگا۔ تمہیں بارہ سو روپے ہمارے ڈیگرم آل انڈیا ریڈیو سے دیئے جائینگے۔ جو جس قسم کی امداد چاہو گے وہ بھی ملے گی۔ مگر بید و خاں کا دل اچھاٹ ہو چکا تھا کہتے تھے کہ ہندوستان کی زندگی سے تو پاکستان کی موت اچھی ہے۔ ۱۹۴۷ء کے شروع میں چیکے سے بڈیو ہوائی جہاز پاکستان چلے آئے۔

لاہور میں سال بھر رہے یہیں سے ان کے مالی مصائب کا آغاز ہوا۔ تنگی ترشی سے گزارا ہونے لگا جس گھر میں رہتے تھے اس کی جڑ میں پانی مرنے لگا اور وہ بالکل کھل گیا۔ لاہور سے بیڑا ہو کر کراچی پہنچے۔ ریڈیو پاکستان نے انکی سرپرستی کی اور ان کی مالی حالت کچھ سدھر گئی۔ شہر کے ایک گنجان تجارتی علاقے میں دو کمروں کا خاصا پڑا فلیٹ بھی انہیں ایک قدر دان نے الاٹ کر دیا تھا۔ ایک سال یہاں رہے ہوں گے کہ ان کے پاس ایک دلال پہنچا کہ اٹھ ہزار اس کی پگڑی لے کر کہیں اور چلے جاؤ۔ معلوم ہوا کہ کوئی سیٹھ صاحب پوری بلڈنگ کے کرایہ داروں کو پگڑی دے کر بلڈنگ خالی کرانا چاہتے ہیں۔ بعض نے تو اس پیش کش کو قبول کر لیا اور بعض نے اسے نامنظور کر دیا۔ آخری بار بید و خاں کو دس ہزار روپے کی پیش کش کی گئی مگر وہ بھوکے آدمی تو بہ تو بہ کر کے وہیں بیٹھے رہے۔ کچھ دنوں کے بعد میڈنسل کارپوریشن کا نوٹس آیا کہ مکان خالی کر دیا جائے کیونکہ عمارت خطرے میں ہے اور اسے ڈھایا جائے گا۔ اور نوٹس کی ميعاد ختم ہونے ہی مزدوروں نے اسے ڈھانا شروع کر دیا۔ ناچار وہاں سے نکلے اور پرانی ٹائلس کی ایک ٹوٹی ہوئی دکان میں آ بیٹھے۔ یہاں بارش نے رہنے نہیں دیا۔ تو پیر کا لونی کے ایک کھنڈے میں پناہ لی۔ آخر کسی خدا ترس افسر نے لاو کھیت میں ان کو تھوڑی سی زمین الاٹ کر دی۔ اس پر قرص وام کے انہوں نے ایک کمرہ ڈالوایا۔ اور پندرہ افراد کا خاندان

اس ایک کمرے میں زندگی کے دن بسر کرنے لگا۔ پاکستان میں ریڈیو پاکستان ہی ان کا سب سے بڑا سرپرست تھا جب ان کے دونوں لڑکے بھی ریڈیو پاکستان میں ملازم ہو گئے تو انہوں نے سکھ کا سانس لیا مگر کئے دن؛ سفید کناسے آگیا تھا۔ سارنگی کا جادو گرنے کا جادو جگا کر اب خود سو جانا چاہتا تھا۔

استاد نے ایک دفعہ کہا تھا کہ جس دن ہماری انگلی بے سُر پڑنے لگے گی، سمجھ لینا کہ ہمارا وقت قریب آپہنچا۔ اور سچ پچ مرنے سے چند روز پہلے انہوں نے جو آخری پروگرام کیا تو میں نے بھی دیکھا اور ریڈیو کے دو ایک اور آدمیوں نے بھی کہ استاد کے ہاتھ میں کڑوی آگنی ہے۔ میرا تھا اسی دن ٹھنکا تھا۔ میں نے ان کے لڑکے امر او خاں سے پوچھا کہ استاد کی طبیعت کبھی ہے؟ انہوں نے بتایا کہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے ہمیشہ نے مکرور کر دیا ہے۔ میں نے سوچا تھا کہ شرم کوان کی مزاح پر سی کو جاؤں گا مگر دن کے کوئی ساٹھ بار بچے فلی ریکارڈ بجاتے جاتے ریڈیو نے یہ غناک خبر سنائی کہ استاد دم سے خفست ہوئے۔ یہ ۱۳ جنوری ۱۹۷۷ء کا ذکر ہے۔

لاو کھیت جاکر دیکھا کہ استاد کا بے روح جسم چار پائی پر پڑا ہے اور گھر میں گہم مچا ہوا ہے۔ میں نے پوچھا۔ یہ کیسے ہوا؟ مرنے کی تو حالت نہیں مٹی۔ لڑکے نے بتایا کہ اچھے خاصے تھے مجھے جلیا اور کہا۔ تو چیزے لے لے لے چیز یاد کرائی۔ پھر بولے آج طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ میں نے کہا۔ آبا میں ڈاکٹر کو لاتا ہوں۔ میں کپڑے پہنے لگا۔ اماں جو کی کام سے کمرے میں گئیں تو دیکھا کہ آبا بے سدھ پڑے ہیں۔ آواز دی نہیں بولے۔ ہلایا جلیا، دباں کیا رکھا تھا۔ ان کا طائر روح ستر سال کے بعد نفس عنقریب سے رہائی پا چکا تھا۔

بید و خاں کی سنانائی سالے شہر میں کبلی کی طرح پھیل گئی اور تیسرے پرتک دو تین سوانی انکے گھر پہنچ گئے۔ ایشیا کا سب سے بڑا فنکار اور دنیا کا سب سے بڑا سارنگی نواز شہر ہٹے آخری منزل پر پہنچا گیا اور جو وقت پڑوس کی مسجد کو مغرب کی آذان کی آواز آئی تو ہم اس عظیم انسان کی ٹھیری پر فاتحہ پڑھ رہے تھے۔

ایم اسلم

سرزمین پنجاب اپنی یو قلموں صفات کی بنا پر سدا سے ہندوستان کی ایک بیش قیمت دولت رہی ہے۔ اس کے شہروں کی زندگی گنگنائی رہتی ہے۔ اور اس کے دیہاتوں کی آبادی ہنستی مسکاتی رہتی ہے۔ شیشم کے سائے میں محبت کے پودے پھلتے ہیں اور رومانی جھیلوں میں حُسن و عشق کے کنول کھلتے ہیں۔ ہیرا پنجاہ، سوہنی ہینوال، سسی پنوں کے عشقیہ نالکے اسی سرزمین کے اشیج پر کھیلے گئے اور اس دل سوزی کے ساتھ کہ رہتی دنیا تک اُن کے نام زندہ رہیں گے یہ ہے عشق میں جان دیکر انسان زندہ جاوید ہو جاتا ہے۔

سر سید نے یہاں کے بسنے والوں کو زندہ دلان پنجاب کہا۔ اس خطے کا موسم اور ماحول ہی ایسا ہے کہ یہاں کے بسنے والوں میں جسم اور روح کی توانائی پیدا ہوتی ہے غنّت اور جفاکشی کو جی چاہتا ہے۔ دل میں اُمنگ اور روح میں ترنگ پیدا ہوتی ہے اور زندگی زندہ دلی کا مرقع بن جاتی ہے اور پھر پھوٹوے

زندگی زندہ دلی کا ہے نام

مردہ دل خاک جیا کرتے ہیں

بایں سمجھو کہ پنجاب کے لوگ جینے کا سلیقہ جانتے ہیں۔ زندگی کی مقدس امانت کو عیش و عشرت کے آستانے پر بھینٹ نہیں چڑھاتے۔ زندگی سے ہوا ہوا

مصرت لیتے اور اپنے فرض کی تکمیل کو مقصد حیات سمجھتے ہیں۔ زندگی کے اور حلقوں سے قطع نظر ایک ادب کے حلقے ہی کو لیجئے اور دیکھئے کہ اس بیسویں صدی میں کیسی کیسی جلیل القدر ہستیاں وجود میں آئیں۔ پنجاب کے لفظ کے ساتھ سب سے پہلا تقویر پیغمبر خودی علامہ اقبال مرحوم کا وابستہ ہے۔ جنگی شہرت کا ڈلکا ہار داغ عالم میں بچ چکا ہے۔ ان کے بعد سر عبد القادر ہیں جنہیں جدید ادبی رسائل کا باد آؤم کہنا چاہیے۔ اخبار نویسوں میں مولانا ظفر علی خاں اہم گرامی سرفہرست ہے۔ اور مصنفوں میں میاں محمد اسلم (جو عرت عام میں ایم اسلم کہلاتے ہیں) کا نام نامی سب سے زیادہ مرکزِ نظر بنا رہا ہے۔

سرود، گھنٹا رنگ، کتابی چہرہ، خنداں پیشانی، چمکدار آنکھیں، ان پر عینک پتے پتے لبوں پر کتر داں مونچھیں جن میں ایک ٹکلیں مسکراہٹ چھپی رہتی ہے، بخوڑی سے استقلال ٹپکتا رہتا ہے۔ ترکی ٹوپی، کوٹ اور شلوار، کالر اور ٹائی۔ عمر سترے مچاؤز، کاٹھی مضبوط۔ یہ ہے ایم اسلم کی ظاہری وضع۔ جیسا اُن کا ظاہر جلابے دیباہی اُنکا باطن بھی سُکھرا ہے۔ باتیں بڑی موثر اور دلکش کرتے ہیں۔ اُن کے انداز گفتگو سے اُنکی شرافتِ نفسی چمکتی ہے۔ ان کی کوئی بات قرینے اور سلیقے سے خالی نہیں ہوتی۔ سادہ پُر کاری جو اُن کی تحریر کی نمایاں خصوصیت ہے۔ ان کی نئی زندگی میں بھی کار فرما ہے۔ بہت معمولی انداز میں کوئی بات کہیں گے مگر ہوگی گہری اور وزنی۔ دوستوں پر جان دیتے ہیں اور انہیں زیر بار منت کرنے کی جستجو نہیں کرتے ہیں۔ دل کے صاف ہیں، کبھی کسی کو مُشتبہ نظر سے نہیں دیکھتے۔ اپنی اس کمزوری کی بدولت اکثر نقصان اور تکلیف اُٹھاتے ہیں اور بے مہری احباب کے شکوہ سن رہتے ہیں مگر وسیع قلبی نے چشم پوشی اور درگزر کو ان کا شعار بنا دیا ہے۔

ہیں ایسی کئی مثالیں معلوم ہیں کہ جن لوگوں کو دولت کی رودنی بھی مشکل سے جڑتی

تھی آج اسلم صاحب کی امداد کی بدولت ہزاروں روپے رول رہے ہیں۔ میرا چشم دید واقعہ ہے کہ مسئلہ میں ایک صاحب آئے جنگی ہیئت کذا فی بد مغلی اور بد مالی کی چھاپ تھی۔ ان سے میرا تعارف کرنا یا گیا تو معلوم ہوا کہ میسر ہم پیشہ ہیں۔ ان صاحب نے بیڑا اٹھا یا تھا کہ طباعت کتب کا کاروبار نہایت ایمان داری سے کریں گے چنانچہ اسلم صاحب سے چھپی چھپائی کتابوں کا اسٹاک لے گئے اور اسکے علاوہ تین کتابوں کے سودے بھی۔ اس وقت میاں صاحب سے بہتر ادیب اور ایسا کریم انفس انسان ان صاحب کے نزدیک دنیا میں اور کوئی نہیں تھا۔ کتابیں چھپیں اور خوب بکیں۔ کئی کئی ایڈیشن ہو گئے۔ چند سال بعد انہی ناشر صاحب سے ملاقات ہوئی تو انہیں پچھلے میں تکلف ہوا کہ پرکھ کر دیا ہوا، تو نہ ان سے فٹ بھرا گئے چلتی تھی، بیفکری اور فارغ البالی کی مہر ان پر لگی تھی۔ معلوم ہوا کہ ان کا کاروبار خوب چمک گیا ہے، کچھ زمین بھی خرید لی ہے۔ انہیں دیکھ کر بہت جی خوش ہوا مگر ان کی باتیں سن کر بڑی حیرت اور نفرت ہوئی۔ سرمایہ دارانہ ذہنیت نے ان کے اخلاقی فرائض کو تباہ اور ان کی انسانیت کو برباد کر دیا تھا۔ دوسروں کے حقوق ادا کرنے کو یہ ان کی عادتیں خواب کرنا کہتے تھے اور ان کا مقولہ یہ بن گیا تھا کہ بزنس میں ایمان داری سے کوئی شخص ترقی نہیں کر سکتا۔ چنانچہ واقعہ تو یہ ہے کہ ترقی تو وہ کر گئے اور ایسی کہ شاید ہی کسی نے کی ہو مگر یہ بھی ایک عبرتناک واقعہ ہے کہ شاید ہی کوئی ان کا اعتبار کرتا ہو۔ ایک سرے سے سب ہی ان سے متنفر نظر آتے تھے۔ اب کے ایم اسلم صاحب سے ملاقات ہوئی تو دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ اب تو عرصہ سے ان صاحب نے خدا واسطے کا بیڑا بندھ رکھا ہے۔ اور مشتاقان ملاقات کو باز رکھنا اور درغلانا اپنے ایمان کا جزو سمجھتے ہیں۔

نکوئی بابتوں کے دن چٹان است کہ بدکردن بجائے نیک مردوں

صاحب کا رجسٹر دیکھنے سے معلوم ہوا کہ بقول اسلم صاحب بے ایمان بک ڈپو۔ پر ڈھائی ہزار روپے نکلتے ہیں اور اس رقم کو بٹہ کھاتے میں ڈال دیا ہے۔ یہ میں نے صرف ایک مثال پیش کی ہے، ایسی کئی مثالیں موجود ہیں جن کی نگرار بے فائدہ ہے۔ البتہ ایک اور واقعہ کا بیان کرنا ضروری ہے جس سے اسلم صاحب کی وسیع القبلی کا پتہ چلتا ہے۔

ایک معروف ترقی پسند ادیب کو اسلم صاحب سے بغض لگا ہی ہے اور اپنے کئی مضامین میں ذل کے پھپھوٹے پھوٹ چکے ہیں۔ اسلم صاحب یوں تو جہاں تک ممکن ہو سکتا ہے چشم پوشی اور درگزر سے کام لیتے ہیں مگر ضبط اور صبر کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ کبھی کبھی اپنے مضامین میں اپنے مخالفین کی خبر لے لیتے ہیں وہ بھی اس طرح کہ تہذیب و شائستگی کا دامن کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ مگر ان صاحب کی جلی کٹی کا انتقام لینا بھی اسلم صاحب نے پسند نہ کیا۔ شرمی قسمت سے یہ صاحب ایک مقدمہ میں ماخوذ ہو گئے۔ عدالت میں میں بھی موجود تھا، اسلم صاحب بھی تھے اور کئی اور کرم فرما بھی ایک صاحب نے ضمانت میں اپنا نام بھر دیا۔ مگر مجسٹریٹ ضامن کو نہیں جانتا تھا اس لئے تصدیق کرنے کے لئے ایک ایسے گواہ کی ضرورت ہوئی جسے مجسٹریٹ شخصی طور پر جانتا ہو۔ ضامن نے اسلم صاحب کی طرف ضمانت نامہ بڑھادیا انہوں نے بے چون و چرا اس پر دستخط کر دیئے ضمانت منظور ہو گئی اور ترقی پسند ادیب کو اتنی بھی توفیق نہیں ہوئی کہ خالی شکریہ کے دو لفظ ہی کہہ دیتے۔ اسلم صاحب نے اس بد تمیزی کا بھی بڑا نہ مانا اور کہہ تو یہ کہا کہ ان صاحب سے مجھے کتنا ہی اختلاف کیوں نہ ہو لیکن میں عدالت کچھری میں ان کا مخالف نہیں ہو سکتا آخر میں تو اہل قلم ہی۔ ان کی پریشانی سے مجھے خوشی نہیں ہو سکتی۔

آسائش دو گیتی تفسیر میں دو حوت است

بادرستاں تملطف بادشمنان مدارا

ادیب کی حیثیت سے میں اسلم صاحب کو پتیس سال سے جانتا ہوں اور شخصی طور پر ۳۲ سال سے۔ تصنیف و تالیف کے سلسلے میں اسلم صاحب اب تک پندرہ بیس ہزار صفحات کی کتابیں لکھ چکے ہیں اور شاید ہی کوئی اردو پڑھنے والا ایسا ہو کہ ان کی کتابوں سے مستفیض یا نکتہ اندوز نہ ہوا ہو۔

اسلم صاحب نے مذہب، تاریخ، تنقید، افسانے اور مزاحیہ مضامین، سبھی کچھ لکھا ہے۔ اس لئے ہر مذاق کے پڑھنے والے کو ان کی کتابوں میں اپنی تسکین و ذوق کا سامان مل جاتا ہے۔

اسلم صاحب کی ادبی تخلیقات پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور لکھا جائے گا۔ اردو میں بھی ان کتابوں کے ذریعے ہر شخص بقدر ہمت اور ادب میں ان کا درجہ متعین کر سکتا ہے۔ اسکے علاوہ ایک نظریہ یہ بھی ہے تصنیف مصنف کے کاروبار و جان کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے اسلم صاحب کی سیرت کا بھی اندازہ کیا جاسکے گا مگر میں سمجھتا ہوں کہ اسلم صاحب کے باب میں اس نظریہ کی صداقت بہت کچھ مستند ثابت ہوگی۔ تاہم وہ پاکیزگی جو ان کی روزمرہ زندگی میں کارفرما ہے انکی ادبی تخلیقات میں بھی طاری و ساری ہے۔

اسلم صاحب لاہور کے ایک نہایت معزز گھرانے کے چشم و چراغ ہیں۔ انکے خاندان میں بڑی قابل قدر ہستیاں پیدا ہوئی ہیں۔ موجودہ افراد میں خان بہادر میاں امیر الدین اور میاں امین الدین۔ آئی۔ سی۔ ایس شامل ہیں۔

تمام پاکستان سے پہلے لاہور کو ہندوستان کا پیرس کہا جاتا تھا غالباً اس وجہ سے کہ نہایت نئے فیشنوں کی ایجاد یہیں سے ہوتی تھی، چنانچہ ہندو بیہ رنگ

نے پنجاب کی قدیم تہذیب کو دلیرانہ لگا لادے دیا تھا۔ جب تہذیب نے اپنے رواج پایا تو نئی اخلاقی اقتدار بھی رائج ہو گئیں۔ یہ سیلاب کسی کے روکے نہیں سکا۔ یہاں تک کہ ڈاکٹر اقبال مرحوم کی آگاہی بھی صدابعد ثابت ہوئی۔ لاہور کے اونچے گھرانوں میں پوری تہذیب نے دخل پالیا۔ شعائیر اسلامی کو ترقی میں حائل سمجھا گیا اور انہیں پس پشت ڈال دیا گیا۔ متوسط طبقے کی معاشرت آدھا میٹر آدھا بطیر۔ اپنی گوارا نہیں ہدائی کا یا را نہیں۔ نچلے طبقے میں چولا بدلنے کی استطاعت کہاں؟ مگر متاخر ہوئے بغیر یہ بھی نہ رہ سکا۔ لیکن ہے کہ کچھ اور خاندان بھی ہوں مگر میں نے ہدائی تہذیب کا رکھ رکھاؤ اور وقار صرف اسلم صاحب کے ہی خاندان میں دیکھا۔ ادب و آداب، قرینہ سلیقہ، وضعداری، خلوص و محبت، غرض جو شرفائے قدیم کا دستور تھا اب بھی ان کے ہاں اس کی پوری باندی کی جاتی ہے۔ آپ کا جی چاہے تو اسے قدامت پرستی ہی کہہ لیجئے مگر یہ دیو تو ہرے جکے آخری پرستار علامہ مرحوم تھے۔ مغرب کی خوبیوں سے جس حد تک مستفید ہونے کی ضرورت ہے۔ اس خاندان کے افراد اس میں کسی سے پیچھے نہیں رہے چنانچہ مردوں میں آئی۔ سی۔ ایس اور خواتین میں بی۔ اے اور ایم۔ اے موجود ہیں۔ مگر اس اعلیٰ تعلیم نے نہ تو ان سے ان کا مذہب چھینا اور نہ انہیں نقل تہذیب اختیار کرنے پر مجبور کیا۔

اسلم صاحب جس زمانے میں گورنمنٹ کالج (لاہور) میں پڑھتے تھے تو انہیں شاعری کا شوق تھا۔ شعر دلکش کہتے تھے اور اکثر انعامات بھی شاعری کی بدولت ملے۔ ڈاکٹر اقبال اس زمانے میں فلسفہ کے پروفیسر تھے اور اسلم صاحب کے خاص کرم فرما۔ ان کے ادبی ذوق کو ڈاکٹر اقبال ہی نے اُبھارا اسلم صاحب کو شہر کھنے پر مرحوم بی۔ اے مائل کیا۔ ڈاکٹر صاحب سے ان کے تعلقات آخر تک

بہت غلصانہ رہے۔ اسلم صاحب کی معیت میں جب مجھے علامہ مرحوم کی خدمت میں حاضر ہونے کا پہلا موقع ملا تو ان کی مہلک بیماری کی ابتدا ہو چکی تھی۔ علامہ کی آواز بیٹھی ہوئی تھی اور بولنے کو ان کے تنفس پر زور پڑتا تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ عید کی نماز ہا دشاہی مسجد میں پڑھتے گئے تھے، فرش ٹھنڈا تھا، دیر تک بیٹھنا پڑا۔ سردی کا اثر ہو گیا، آواز بالکل جاتی رہی۔ اس حالت میں بھی اپنے لئے دالوں سے گھنٹوں باتیں کرتے اور ان کی باتیں اتنی دلکش ہوتیں کہ وہاں سے اٹھنے کو جی نہ چاہتا تھا۔ مجھے اردو میں اور اسلم صاحب سے پنجابی میں باتیں کرتے رہے۔ اسلم صاحب سے جو باتیں ہوئیں ان سے مجھے معلوم ہوا کہ ان کے باہمی تعلقات کس قدر دیرینہ اور غلصانہ ہیں۔ علامہ کے انتقال کے بعد اسلم صاحب کے لئے لاہور کی ادبی زندگی ویران ہو گئی۔

اسلم صاحب کو بفضلہ دنیا کی سب نعمتیں میسر ہیں مگر اولاد کا کٹھ ان کے نصیب میں نہیں ہے یہ ایک ایسا دکھ تھا جس نے ان کی زندگی کو کرکڑا کر دیا۔ کوئی چالیس سال ہوئے انہوں نے اپنی بھانجی اصغری کو گود لیا اور اسے اس طرح پالا کہ اپنے پیٹ کی اولاد کو بھی کوئی کیا پالے گا مگر خدا کی شان کہ یہ بچی بھی چند سال ہی میں جنت کو سدھار گئی اور اسلم صاحب کی زندگی کی ٹریجڈی کو مکمل کر گئی غم و مایوسی نے انہیں دنیا سے بے زار کر دیا۔ اصغری کی یاد نے انہیں دیوانہ بنا دیا۔ کھانا پھوٹ گیا۔ نفیس لباس جاتا رہا۔ ہر وقت اصغری کی یاد میں نالہ گرم و آہ سرد۔ جب دل بہت بے قابو ہوا گھر سے نکل کھڑے ہوئے شہر سے تین میل دور قبرستان میں جا پہنچے اور تخت جگر کی قبر پر داری صدقے ہو رہے ہیں۔ کہتے ہیں کہ وقت سب سے بڑا طبیب ہے، رُوح کا یہ زخم آہستہ آہستہ مندمل ہو گیا مگر اس کا داغ ساری عمر کے لئے رہ گیا۔ جب کسی بچے کو

دیکھتے ہیں زخم ہرا ہوا جاتا ہے۔ اصغری کی جدائی نے ان کا دل گذار کر دیا۔ اور ان کی تحریر میں ایک کسک پیدا ہو گئی جو ان کے اسٹائل کی ایک نمایاں خصوصیت اور خوبی سمجھی جاتی ہے۔ اصغری کو سدھارے بیس سال ہو گئے مگر آج بھی مرحومہ کا کمرہ بچوں کا توں گھر میں موجود ہے اس کمرے میں اصغری کی سب چیزیں بطور یادگار رکھی ہوئی ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بچی کھیلتے کھیلتے ابھی کہیں باہر چلی گئی ہے۔

غم دنیا سے بچنے کے لئے انسان چند مشاغل اپنے لئے وضع کر لیتا ہے۔ جن میں انہماک سے مصائب و آلام زندگی سے تھوڑی دیر کے لئے نجات مل جاتی ہے۔ اسلم صاحب کے مشاغل میں سب سے زیادہ نمایاں حیثیت ذوقِ فارغ فرسائی کو حاصل ہے۔ ادب کے جملہ شعبوں پر انہیں یکساں طور پر عبور حاصل ہے۔ شاعری سے انہیں مناسبت طبعی ہے۔ ان کی ادبی زندگی کا آغاز ہی شعور شاعری سے ہوا مگر اسے کچھ زیادہ کارآمد نہ پا کر نشر کی طرف رجوع ہوئے۔ اور تنقیدی مضامین کے ساتھ ساتھ افسانہ نگاری پر بھی طبیعت مائل ہوئی۔ اس صنف میں اتنی مقبولیت حاصل ہوئی کہ آج ان کا شمار ہمارے صنفِ اول کے افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ اب تک کم و بیش ایک ہزار افسانے لکھ چکے ہیں۔ ان میں ہر قسم کے افسانے شامل ہیں۔ رومانی، تصویری، حقائق، حزمینہ، طریقہ، عبرتناک، بیتناک۔ اسلم صاحب کے افسانوں کا پس منظر بہت وسیع ہے۔ اتنا وسیع کہ ایک عالم پر محیط ہے۔ ہندوستان کے دیہاتوں اور شہروں کے علاوہ یورپ، مصر، اردن، ترکستان، عرب، چین، اور جاپان کی سرزمین، باشندے رسم و رواج، رہن سہن وغیرہ بھی اسلم صاحب کے موضوع افسانے ہیں۔ آپ کو ان افسانوں میں کسی سوسائٹی کی تصویریں ہی نہیں ملیں گی بلکہ سوسائٹی کے ہر طبقے

کامیاب عکس ان افسانوں میں آپ کو دھوپ چھاؤں کی طرح دکھائی دے گا۔ کہیں امیر کا محل کھڑا تہقے لگا رہا ہے اور کہیں غریب کی بھونپڑی آنسو بہا رہی ہے۔ کہیں زندگی کی کش مکش ہے کہیں رومانی سکون۔ کہیں گناہ و موت کی لرزہ خیز داستان ہے کہیں محن و عشق کی دلکش کہانی ہے کہیں زندگی و موت کی کسنسی پیدا کرنے والے نقشے، کہیں جرم و سزا، انسانی درندگی و شیطنت کی لرزہ خیز داستان۔ کہیں ہنس کھڑی مزاحی میں جنگی ہر بات لطیف ہوتی ہے کہ مائے ہنسی کے ہیٹ میں بل پڑ جاتے ہیں یا پھر ایک ٹپکی کہ سہلاتے اور تھلائے ہی پھر یہ ان سب افراد و قصہ کی نفسیاتی تحلیل ایک ماہر افسانہ نگار کی طرح لہجے کے چنے چباتا ہے مگر اسلم صاحب نے کچھ اس سادگی سے یہ ہفت خواں طے کیا ہے کہ پڑھنے والے کی طبیعت پر ذرا بار نہیں پڑتا۔ مصنف کا طرز بیان دل کا کنول کھلانا جانتا ہے۔ اور تاثر افسانے میں طاری و ساری ہو کر پڑھنے والے کے شعور میں غیر عیسوی طور پر پھر گھل مل جاتا ہے۔

طبع زاد مصنفین کے علاوہ اسلم صاحب نے انگریزی کی بعض مشہور کتابوں کے تراجم بھی کئے ہیں۔ مہدی، طلسم سامری، اور زنگس نے کافی شہرت پائی۔ بالخصوص موخر الذکر ترجمہ کی خوبی یہ بھی جاتی ہے کہ اصل کی ساری خوبیاں ترجمہ میں قائم رہیں اور عبارت گنجگاہ نہ ہو۔ اسلم صاحب آسان زبان لکھتے ہیں وہ زبان جو ساری دنیا میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ عبارت آرائی اور ثقیل الفاظ سے مرعوب کرنے کے عادی نہیں ہیں اس لئے ان کا ترجمہ شستہ و رفته ہوتا ہے اور پڑھنے والوں کو کتاب میں طبع زاد تصنیف کا لطف آتا ہے لہذا ایک معرکتہ آرا ترجمہ ہیرا پنچا ہے۔ جو دارلشہادہ کے شاہکار کا ترجمہ ہے جن لوگوں کو پنجابی نہیں آتی انہیں اب تک صرف افسانہ معلوم تھا کہ یہ ایک عشقیہ داستان

ہے، دوسری پنجابی عشقیہ داستانوں کی طرح۔ مگر اب جب کہ اس کا ترجمہ پڑھنے کا موقع ملا تو معلوم ہوا کہ یہ قلوب کا ایک خزانہ ہے جو اب تک پنجابی میں پوشیدہ رہا۔ رومان سے قطع نظر اس کی ایک میٹ پرماؤنی حیثیت بھی ہے۔ اچھوتے خیالات و درتضیبات لطیف کنسے، فلسفیانہ بحثیں، دلکش مکالمے، خیال انگیز بیان غرض ادب کا ایک شہ پارہ ہے جس سے اب تک ہم محروم رہے۔ اردو کو مالامال کرنے میں تراجم کا بڑا حصہ ہے۔ اور ہیرا پنچا ایک ایسا اضافہ ہے کہ اسلم صاحب کی یہ سعی ہمیشہ مشکور رہے گی۔

اسلم صاحب کے طبع زاد مصنفین کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ان میں سے بعض سال کے بہترین افسانے قرار دیئے گئے اور گرانقدر انعامات سے ان کی قدردانی کی گئی۔ تعلیمی اداروں میں ان کی بیشرکت ہیں منظور ہو چکی ہیں۔ پبلشرز میں ہر طرف سے ان کے مسودات کی مانگ رہتی ہے۔ پہلے یہ کسی سے انکار نہیں کرتے تھے اور سائل کی دلکشی گنا سمجھتے تھے مگر جب انہیں تجربہ ہو گیا کہ کیسے کیسے ماہر آستین پبلشر ہیں تو ان کا خلوص و اعتماد مجرد ہو گیا اور اب محتاط رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ویسے بھی اسلم صاحب زیادہ درست بنانے کے قائل نہیں ہیں اور تلخ تجربات کی بنا پر انہوں نے ایک طرح سے گوشہ نشینی اختیار کر لی ہے۔ ان کے حلقہ احباب میں اکثر حضرات نیاز مندانہ داخل ہوتے۔ منافقانہ شامل رہے اور ان کے اثر و رسوخ سے فائدہ اٹھا کر معاندانہ رخصت ہوئے اور اب مخالفانہ طرز عمل کو ضروری سمجھتے ہیں۔

اردو میں ناول کی ابتدا ڈپٹی نذیر احمد سے ہوئی اور ان کے اخلاقی و معاشرتی ناول آج تک اسی ذوق و شوق سے پڑھے جاتے ہیں۔ شری نے اسلامی تاریخ کو ناول کا موضوع بنایا اور اردو ناول کو کافی فروغ دیا۔ ان کے بعد ناول نگاری میں ابتلال

آبشار شروع ہوا اور اس حد تک کہ ناول ایک بدنام لفظ ہو گیا کہ بھلے آدمی اس کے نام سے ہی کالوں پر ہاتھ رکھنے لگے۔ علامہ راشد انجیری اور پریم چند نے اس صنف ادب کو بستی سے نکال کر پھر عروج دیا مگر ان دونوں کے انتقال کے ساتھ ناول کی بساط بھی اُٹ گئی۔ اسی زمانے میں مختصر افسانہ ترقی کے پر لگا کر اُٹا اور سب کی آنکھوں کا چراغ بن گیا۔ اسی زمانے میں ناول کو حیات نو دینے کی کئی کوششیں ہوئیں مگر ترجمہ کی حد سے آگے کوئی مفید نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ پھر ہر انسان نگار کو ناول نویسی کا شوق ہو گیا اور متعدد ناول شائع ہوئے۔ نئی پریم چند نے جہاں ناول کو چھوڑا تھا اس سے آگے اسے کوئی نہ بڑھا سکا۔ اسلم صاحب نے بھی اس کی کوشش کیا اور ایک ضخیم ناول شمس لکھ کر بطور نمونہ پینک کے سامنے پیش کیا۔ پانچ مہینے میں ایک ہزار جلدوں کا ایڈیشن ختم ہو گیا۔ اس کے بعد شام و سحر شائع ہوا۔ اس کی ایک ہزار جلدیں تین ماہ میں ختم ہو گئیں۔ اس کے بعد رقص بہار شائع ہوا اور ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ پھر تو اسلم صاحب کے ناولوں کا تانتا بندھ گیا اور ہر سال کئی کئی ناول چھپنے لگے۔ میں دُشوک سے کہہ سکتا ہوں کہ اردو کے کسی مصنف کو اتنی مقبولیت حاصل نہیں ہوئی کہ اس کی کسی تصنیف کا ایک ایڈیشن تین مہینے ہی میں ختم ہو جائے۔

بظاہر یہ ایک اچھا نظر آتا ہے کہ پانچ ہزار مضمون اسلم صاحب نے صرف دو سال میں لکھے اور ان کی قدر دانی سے ثابت ہے کہ ان میں بھرتی کو کوئی دخل نہیں ہے۔ یہ سب نتیجہ ہے اُن کے ذاتی ذوق و شوق کا۔ اردو سے دالہا نہ عشق کا مجھے معلوم ہے کہ ان کی پانچو مضمون کی ایک مشہور کتاب صرف پچیس دن میں لکھی گئی ہے۔ آمد کا یہ حال تھا کہ قلم خیالات کا ساتھ نہ دے سکتا تھا۔ گھنٹوں لکھتے تھے، دن کو رات کو جب بھی فرصت ملے، یہاں تک کہ بازو دھل ہو جاتا اور انگلیاں سیدھی نہ ہوتیں برخلات اس کے کہیں ایسا بھی ہوتا ہے کہ مہینوں کچھ نہیں لکھتے، کچھ لکھا ہی نہیں جاتا ایسے بخر

زمانے ہر مصنف کی جگہ میں آتے ہیں۔

اسلم صاحب کی روز افزوں شہرت و مقبولیت نے بعض تنگ دلوں کو چرمیو نیال کرنے پر مجبور کر دیا۔ بعض ادیبوں نے حب یہ آٹھویں چڑھتی اور اپنے چراغ بجھانے دیکھے تو مخالفت پر دیگنڈا شروع کر دیا، اور بعض نقادوں نے بھی اس سے متاثر ہو کر غلط مسلط رائے زنی کی۔ ایک صاحب نے لکھا کہ اسلم صاحب کی زرد تو نویسی نے انہیں نقصان پہنچایا۔ حالانکہ تنقید کے کسی اصول کے مطابق زرد تو نویسی عیب نہیں بھی گئی۔ ایک اور کرم فرمانے فتویٰ دیا کہ اسلم صاحب ضرورت سے لکھتے ہیں۔ ان صاحب کا مطلب یہ تھا کہ اسلم صاحب روپے پیسے کی ضرورت سے مجبور ہو کر لکھتے ہیں، چنانچہ جب انہیں معلوم ہوا ہو گا کہ مالی مشکلات اسلم صاحب کے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتیں تو خود اپنی نظر میں اپنی رائے کی کیا وقعت رہ گئی ہوگی؟ اس قسم کے بعض بے جا اعتراضات سے اسلم صاحب اکثر بد دل ہو جاتے ہیں۔ اور شکایت کرتے ہیں کہ ساری عمر اردو کی خدمت کرنے کا یہ صلہ ملا ہے۔ اسلم صاحب کو خوش ہونا چاہیے کہ اللہ نے انہیں محمود بنایا ہے اور ان کی محنت و خدمت کا صلہ اصل میں ان کی تصانیف کی مقبولیت و شہرت ہے۔

اسلم صاحب کا دوسرا مشغلہ شکار ہے۔ شکار ہے کہ نشانات اچھا لگتے ہیں۔ اور ان کے ہاں کھالوں کی کثرت سے معلوم ہوتا ہے کہ شکار ان کے پاس خود کھینچ کر آتا ہے۔

ہم آہوان صحرا میں خود نہادہ برکت

بہ امید آنکہ روز سے بد شکار خواہی آمد

شکار کے سلسلے میں دیہاتی زندگی کا گہرا مطالعہ کرنے کا اسلم صاحب کو اچھا موقع ملا۔ اس مشاہدہ اور مطالعہ نے ان کے انساؤں کو زندگی کی وہ تازگی و توانائی بخشی ہے جو شہری سٹائی باؤں یا کتا بوں سے حاصل نہیں ہو سکتی اُن کے انساؤں میں

جو دلکش منظر کشی ہوتی ہے وہ بھی اسی سیر و شکار کا نتیجہ ہے۔ یوں شکار جو قبول شہنشاہ اور ملک ذریعہ کاروں کا کام ہے ان کے لئے ایک کارآمد مشغلہ ثابت ہوا اور دیہاتی زندگی کو ادب سے روشناس کرانے میں اسلم صاحب کا حصہ منشی پریم چند سے کم نہیں۔

اسلم صاحب کا تیسرا مشغلہ موسیقی ہے۔ گراموفون کے سینکڑوں ریکارڈ ان کی دلچسپی کا سامان ہیں، اور جب سے لاسکی نشریات ہندوستان میں شروع ہوئیں تو ان کے ڈرہنگ روم میں ایک آل دیوریز یوسٹ کا اضافہ ہو گیا۔ ان کی حساس طبیعت یوں توپنے گانے سے بھی بیزار نہیں ہوتی مگر کچھ پھٹکے گیتوں سے بہت متاثر ہوتی ہے۔ چنانچہ ان کے اکثر افسانوں کی تحریک بعض بہت معمولی گیتوں سے ہوئی ہے۔ مثلاً پنجاب کا کوئی ڈھولک گیت انہوں نے سنا اور دل کو لگ گیا تو اُسے پھر سنا۔ کچھ بھولے بسے مناظر اور ان سے وابستہ تاثرات اُجاگر ہونے لگے۔ ریکارڈ پھر بجا یا اور پھر بجا یا اور بجاتے رہے یہاں تک کہ ایک پورا منصوبہ افسانے کا گٹھ گیا۔ اور جتنی دفعہ بھی ریکارڈ بجا یا کہانی کی تفصیلات پرے باندھ باندھ کر سامنے آتی رہیں اور بالآخر خیال کے شیشے میں افسانے کی پری اُتر آئی۔ اسلم صاحب کے ریکارڈوں کا جائزہ لیتے وقت معلوم ہوا کہ ایک ہی گانے کے تین تین ریکارڈ موجود ہیں۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ دو ریکارڈ ڈگھس کر بالکل بیکار ہو چکے ہیں۔ اس لئے تیسرا ریکارڈ ڈولا نا پڑا، اور غلام عنوان کا جو افسانہ لکھا گیا تھا اُس کی تحریک اسی گیت سے ہوئی تھی، لہذا افسانے کی فضا پوری طرح طاری کرنے کے لئے یہ ریکارڈ بے شمار مرتبہ سنا گیا۔ خلوت میں، جلوت میں، آدلی شب، آسز شب، دن کے ہنگامے میں، رات کے ستارے میں اور جب تصور مکمل ہو گیا تو تصویر پیش کرنے میں بھلا ہوا کیسے معذور کو کیا دشواری ہو سکتی تھی؟ دو گھنٹے نہیں چار گھنٹے۔ مگر اسلم صاحب کے افسانوں

کے شائقین کو کب معلوم کہ افسانہ لکھنے کے لئے انہوں نے کتنی راتیں کالی کی ہیں۔ اور چول سے چول بٹھانے میں انہیں کتنی دماغ سوزی کرنی پڑی ہے کہانی کا پلاٹ مرتب کرنے میں کس ذہنی کرب و اذیت سے انہیں دنوں جدم جدم کرنی پڑی ہے۔ آج اردو کے مصنفین میں ایم۔ اسلم سے زیادہ ہر دلعزیز اہل قلم اور کوئی نہیں ہے۔ اور یہ شہرت اور مقبولیت انہیں یوں ہی کسی نے ہاتھ اٹھا کر نہیں دیدی بلکہ محنت و شغف دماغ سوزی، دماغ کا ست اور آنکھوں کا تیل نکالنے کے بعد حاصل ہوئی ہے۔ خدا کرے کہ ان کے قلم کی شگفتگی قائم و دائم رہے تاکہ ادب کی معطر کلیاں سدا کھلتی رہیں۔ لگے ہاتھوں اسلم صاحب کے دونوں چشم ہلے اور فریاد خاموشی کے بارے میں بھی چند باتیں سن لیجئے۔

سردار اسکاٹ جس کمرے میں بیٹھ کر لکھتے تھے اسکی کھڑکی کچھ اس طرح پر واقع تھی اور میز کچھ اس انداز سے رکھی تھی کہ لکھتے وقت سامنے کے فلیٹ سے صرف انکا ہاتھ ہی نظر آتا تھا۔ وہ دن بھر لکھتے، رات بھر لکھتے، سامنے کے فلیٹ میں ایک لڑکی رہتی تھی، وہ جب کبھی چھپے پر آتی تو وہ دیکھتی کہ ایک ہاتھ مسلسل چل رہا ہے۔ تو کچھ دن تک اسے غور سے دیکھتی رہی لیکن سمجھنے سے قاصر رہی کہ یہ کیا چیز ہے جو ہر وقت قلم لئے چلتی رہتی ہے؟ البتہ کچھ دن بعد اسے یقین ہو گیا کہ یہ کوئی بھڑوت ہے اور اس پر یہاں تک اثر ہوا کہ اس نے چھپے پر آنا چھوڑ دیا۔ ایک دن اس نے اپنی ماں سے پوچھا کہ اماں! یہ کیا چیز ہے جو قلم ہاتھ میں لئے ہر وقت چلتی رہتی ہے۔ نہ کوئی آدمی نظر آتا ہے اور نہ کوئی اور۔ اس کمرہ میں بھڑوت رہتا ہے۔ جب ہی تو صرف یہ ہاتھ لکھتا رہتا ہے۔ ماں نے بھی اس چلتے ہوئے ہاتھ کو غور سے دیکھا اور بڑی سہٹائی۔ پوچھ گچھ کی تو معلوم ہوا کہ سامنے کے فلیٹ میں سردار اسکاٹ رہتے ہیں اور وہ اپنے نادل لکھا کرتے ہیں۔

تو صاحب بات یہ ہے کہ ایم۔ اسلم بھی لکھنے کے لحاظ سے اردو کے مالٹر اسکاٹ ہیں۔ وہ جس تیزی کے ساتھ ضخیم ضخیم ناول لکھتے ہیں یہ کچھ انہی کا دل گرہ ہے۔ صبح سے شام تک لکھتے رہتے ہیں۔ رات گئے تک ان کا قلم کاغذ پر چلتا رہے گا اور جب ہاتھ ٹھک کر شل ہو جائے گا اس وقت کہیں جا کر لکھنا بند کر دیں گے۔ ان کے لکھنے کی رفتار کا اندازہ اس سے ہو سکتا کہ وہ ضخیم سے ضخیم ناول مہینہ بھر میں لکھ لیتے ہیں۔ آٹھ سو صفحے کی چشم بلیا۔ انہوں نے ڈیڑھ ماہ میں لکھ دی اور ”فریاد خاموش“ پندرہ بیس دن میں ہو سکتا ہے کہ اس میں ان کی فانیخ البالی کو بڑا دخل ہو کہ اس کے علاوہ انہیں کوئی اور کام نہیں ہے۔ لیکن اور کچھ نہیں اس تیزی اور روانی سے اس کا اندازہ تو ہو ہی جاتا ہے کہ ان کے دماغ میں ہلاٹ کہاں، مکالمہ اور منظر کا بڑا ترانہ پوشیدہ ہے اور ناول اور افسانے لکھنے کی ان میں کسی قدر صلاحیتیں پنہاں ہیں۔ اس لحاظ سے ایم۔ اسلم ہی اردو کے واحد ناول نگار ہیں جو اس قدر تصانیف کے مصنف ہیں۔ کم و بیش وہ اب تک پچاس ہزار صفحات سے اردو کی خدمت کیچکے ہیں۔ اس لئے مجھے تو کم از کم یہ دیکھ کر بڑا انوس ہو تا ہے کہ ہلکے ہاں کے نقاد ایم۔ اسلم کی خدمات کو بالکل ہی نظر انداز کر جاتے ہیں اور جتنی انہیں صلہ کی صورت میں تحسین ملنی چاہیے تھی وہ نہیں ملی۔

یہی نہیں کہ وہ صرف لکھتے ہیں بلکہ ان کے ناول بڑے شوق سے عوام میں پڑھے بھی جاتے ہیں۔ ان کی کتابیں گرما گرم رونیوں کی طرح ہاتھوں ہاتھ لی جاتی ہیں، اس سے اندازہ ہو تا ہے کہ عوام ان سے اور ان کی تحریروں سے کس قدر محبت کرتے ہیں۔ ان کے ہر ناول کا پہلا ایڈیشن تقریباً چار ماہ کے اندر ختم ہو جاتا ہے۔ اور اکثر ناولوں کے ساتھ تو یہ ہو تا ہے کہ اس کے کئی کئی ایڈیشن سال بھر کے اندر ہی چھپ جاتے ہیں، اس کی تازہ مثال ”رقص ابلیس“ ہے سال بھر کے اندر ہی اندر اس کے کئی ایڈیشن شائع ہو کر عوام و خواص میں مقبول ہو چکے ہیں احفاظ نے سچ کہا ہے

قبول خاطر و لطف سخن خدا داد است

عوام کن چیزوں کو پسند کرتے ہیں؟ اس کا سیدھا سا جواب یہ ہے کہ وہ چیزیں جو عوام کے دلوں کی ترجمانی کرتی ہیں، جو ان کے عموماًت و جذبات سے قریبی تعلق رکھتی ہیں۔ اس لحاظ سے ایم۔ اسلم کے ناول ”عوامی ادب“ کے ذیل میں شمار کئے جاسکتے ہیں۔ روس میں ان ناولوں کی بڑی عزت کی جاتی ہے جو عوام میں مقبول ہوتے ہیں۔ اور ان میں سے کئی ناول نگاروں کو ”اسٹالن پرائزر“ بھی مل چکا ہے۔ ایم۔ اسلم کے ناولوں نے ”عوامی ادب“ میں بیس ہزار اضافہ کیا ہے، اسلم صاحب عوامی ادب ہی نہیں ہیں وہ مسلمان بھی ہیں۔ وہ اپنے دل میں اسلامی جذبات اور اسلام کا صحیح درو بھی رکھتے ہیں۔ اس لئے ان کے ناولوں میں پاکستانی ادب کے اساسی تقویات بھی رواں دواں نظر آتے ہیں اور اس لحاظ سے ان کے ناول پاکستانی ادب کے ذیل میں بھی آسکتے ہیں۔ اس وقت اردو میں کوئی ایسا عوامی ناول نگار نہیں جو ایم۔ اسلم کے مقابلہ میں کھڑا کیا جاسکے۔ ایم۔ اسلم اردو کے عوامی ادب کے سب سے بڑے علمبردار ہیں۔

ان کے دو تازہ ناولوں میں چشم بلیا۔ ایک حسین وادی کے ایک گویہستانی علاقے کی ایک رومانی داستان ہے۔ ایک ایسی مظلوم لڑکی کی داستان جو محبت کی تلاش میں زندگی بھر سرگرداں رہتی ہے لیکن اسے مرد و صو کے میں رکھتا ہے اور اس کی معصوم زندگی سے فائدہ اٹھاتا رہتا ہے۔ اس ناول میں یہ لڑکی اپنی زندگی کی داستان سناتی ہے اور اس کی زندگی کی دل موہ لینے والی داستان پر ہی ناول کا بڑا حصہ مشتمل ہے۔ جب مرزا اس سے پوچھتا ہے کہ تمہیں کس چیز کی تلاش ہے؟ تو وہ جواب دیتی ہے۔

”ایک رنگ رنگیل دنیا کی۔ اس دنیا کی جہاں جوانی کے جذبات بیدار ہو کر

زندگی کے لطف سے ہشتا ہوتے ہیں۔ اُس دُنیا کی جہاں آرزوئیں مِلتی ہیں۔ جہاں
مشوق نشوونما پاتے ہیں اُس دُنیا کی جو قہقہوں کی دُنیا ہے وہ دُنیا جہاں شباب اور
جوانی اپنی قدر قیمت سے بیگانہ نہیں ہوتے۔

میل نے اپنی زندگی جیسی گراں بہا چیز بھی اس فریب ہی کی نظر کر دی۔ نا تجربہ کار
لڑکی سے اور توقع بھی کیا کی جاسکتی ہے؟ اور آخر میں شہباز اس سے محبت کی بٹنگیں
بڑھا کر لے لیکن جب اسے اس کی حقیقت معلوم ہوتی ہے تو وہ بھی کترا کر نکل جاتا ہے
یہ غلگین لڑکی جس کی ماں ٹھیکیدار کے ساتھ بھاگ جاتی ہے۔ یہ ستم رسیدہ لڑکی جس کا
باپ اپنی بیوی کے غم میں گھل گھل کر مر جاتا ہے۔ یہ فلاکت زدہ لڑکی، ایک عیسائی قہیم خانہ
میں پرورش پاتی ہے اور یہاں سے ایک دکھار مرد سے بھاگ کر لے جاتا ہے اور اُسے اُن
امریکی سپاہیوں کے سپرد کر دیتا ہے جنہیں تفریح کے لئے ایک لڑکی درکار ہوتی ہے۔
لیلیٰ روتی دھوتی ہے مگر بے سود۔ دکھار مرد اسے مجبور کرتا ہے۔ ایک گنہ سے بچنے کے
لئے اس سے مجبوراً بار بار گناہ سرزد ہوتے ہیں اور آخر کار یہ ایک کوہستانی علاقے میں
مریم اور قزاق کے ساتھ رہنے لگتی ہے۔ مرزا پنجاب کا ایک شکاری وہاں پہنچتا ہے۔
جلد ہی دونوں میں اُس بڑھ جاتا ہے اور لیلیٰ تعلیم یافتہ مہذب اور سمجھدار لڑکی اسے
اپنی زندگی کی غلگین داستان سناتی ہے۔ مرزا لیلیٰ سے حقیقی محبت اور ہمدردی کا ثبوت
دیتا ہے اور شہباز کو جس سے وہ محبت کرتی ہے، لیکن جواب لیلیٰ کے ہلنے واقعات
معلوم ہو جانے کی وجہ سے نفرت کرنے لگتا ہے، اس سے ملا دیتا ہے۔

شکر ایزد کہ میان من داد وصلی فتاد

حوریاں قصص کناس ساغرستان زدند

اس طرح چشم لیلیٰ، رومانی اور نشاطیہ داستان بن جاتی ہے۔

آٹھ سو صفحے کے اتنے ضخیم ناول میں فنکارانہ تناسب و توازن رکھنا کچھ ایم۔ اسلم

ہی کا حصہ ہے۔ کرداروں میں لیلیٰ، مرزا، قزاق اور مریم کے کردار جیتے جاگتے انسان ہیں۔
ان میں سے ہر ایک کردار دل پر ایک خاص اثر چھوڑتا ہے اور ہم ہر کردار کی کسی نہ کسی خوبی
سے متاثر ہوتے بغیر نہیں رہ سکتے۔ مثلاً لیلیٰ کی معصومیت، ذہانت اور بے باکی۔ مرزا
کی حقیقی غربت پاکبازی اور خلوص۔ مریم کی بے لوث خدمت، قزاق کا وحشی پن اور
متر ہونے کے باوجود لیلیٰ سے شادی کرنے کی خواہش۔ اس کی حرکات و سکنات اور بعد
میں لیلیٰ کو بیٹی بنا لینا ایک خاص اثر مرتب کرتا ہے۔

ایک بات اس ناول میں اور قابل ذکر ہے اور وہ ہے موقعِ دل کے مطابق رسیلے
گیتوں کا استعمال۔ اور اشعار کی برجستگی تو گویا سونے پر شہاگ ہے۔

ایم اسلم کی یہ خصوصیت تو اظہر من الشمس ہے کہ وہ فطری مناظر کو ایسی خوبی سے
صفحہ قرطاس پر لاتے ہیں کہ قارئین اپنے ذہن میں وہ سب کچھ دیکھنے لگتے ہیں جو مصنف
دکھانا چاہتا ہے۔ سبزے کی تراوت اور چشموں کی ٹھنڈک ہمک محسوس ہونے لگتی ہے اور
اس طرح یہ منظر محاکات کے لازوال نمونے بن جاتے ہیں۔ مثلاً نمونہ از خردارے۔

مشاطہ قدرت نے سبزے کا ایک بہت خوبصورت فرش بچھا رکھا ہے، اس
زمردیں فرش پر چا بجا خوشام اور رنگارنگ کے پھول بڑی کثرت سے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے
کہ کشمیر کے پرستان کی پریوں کے لئے ہمالیہ کے دیوؤں نے ایک عظیم الشان ادبیلے بدل
قالین بچھا رکھا ہے۔۔۔ کہیں چھوٹی ٹھچھوٹی ٹندیاں پہاڑیوں کے بطن سے پیدا ہو کر پتھروں
اور وادیوں کی آغوش میں اٹھتی کو دتی، مستی اور شباب کے گیت گاتی کسی تیز رو مسافر
کی طرح کسی دور کی منزل کو چلی جاتی ہیں۔ اور کبھی ان گل ریز وادیوں میں۔ دفتر خوش خرم اُڑ
پہاڑوں سے اتر کر وادیوں کے مکینوں کو حیاتِ نو کی نوید دیتی پھرتا ہے۔

ایم اسلم بڑی پاکیزہ زبان لکھتے ہیں اور مکالمے تو بہت ہی چست اور رواں جلتے
ہیں۔ ناول پڑھتے وقت یہ گمان ہوتا ہے کہ یہ واقعہ ضرور کہیں ہوا ہے اور اس کا احساس

مصنف کو بھی ہے اسی نے تو وہ بار بار کہا کرتا ہے۔

۱۰۔ اور جب مجھے یہ خیال آتا ہے کہ کس طرح بعض دوستوں نے یہ حیرت انگیز واقعات میری ہی زندگی کے رومان سمجھ لئے تو مجھے بہت ہنسی آتی ہے۔ خصوصیت سے جمال رام کی کہانی۔ حیات نازہ، غیر وزہ، جام شکستہ، آشوب زمانہ، زرگس اور شب غم کے متعلق پڑھنے والوں میں سے تو اکثر یہ قسم کھاتے کہ کبھی تیار نہ تھے کہ ان تمام رومانوں کا ہیرو میں ہی ہوں۔

۱۱۔ چٹم لیلٰی جہاں ایک دلکش رومانی ناول ہے۔ اس کے برعکس "فریاد خاموش" ایک المیہ رومان ہے۔ ایک نوجوان لڑکی کی زندگی کی زبردست ٹریجڈی۔ یہ لڑکی مستحکم سے محبت کرتی ہے۔ لیکن نا تجربہ کاری کی بنا پر شام اور لڑکی (سیتا) دونوں ایک دوسرے سے شادی کے وعدہ و وعید کے باوجود دور دور ہو جاتے ہیں۔ جب وہ ایک دوسرے سے جدا ہوتے ہیں اور اس الگ ہونے میں غلط فہمی کو بھی دخل ہے تو سیتا اس وقت حاملہ ہوتی ہے۔ شام بھی سیتا ہی سے شادی کرنا چاہتا ہے اور سیتا بھی شام ہی سے شادی کرنے کی خواہش مند ہے مگر حالات اور زمانہ کے واقعات انہیں دوسرے دور تر کر دیتے ہیں وہ اپنی عزت کو بچانا چاہتی ہے اور اپنے ایک محسن سوامی کے پاس جاتی ہے اور ان کے ذہن میں سوامی کے کوئی حل سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ اس سے شادی کریں اور باہر والوں پر یہ ظاہر کریں کہ بچہ ان کا ہے۔ سوامی کی یہ زبردست قربانی تھی۔ لیکن سوامی درپردہ اس کو اپنی بیٹی بنالیتا ہے۔ اور یہ لڑکی شام کے غم میں بچہ ہونے سے پہلے ہی گھل گھل کر مر جاتی ہے۔ موت۔ اور پھر سیتا کی موت۔ اس سے زیادہ اور کیا المیہ کہانی ہو سکتی ہے۔ یہ کہانی بڑی دلچسپ انداز میں لکھی گئی ہے اور قارئین کے ذہن پر بڑے المیہ تاثرات چھوڑتی ہے۔

ایک بات جو میں ایم اسلم کے ہاں خاص طور سے منفرد ممتی ہے وہ ہے پلاٹ کا

ٹیلر حامیر سے ملنا۔ اگر آپ کوئی ناول شروع کریں تو آپ کو شروع شروع میں اندازہ ہو گا کہ آگے کہانی کچھ اس انداز میں چلے گی۔ لیکن جیسے جیسے آپ ناول پڑھتے جائیں گے آپ کی حیرت و استعجاب میں اضافہ ہوتا رہے گا۔ واقعات و حالات آپ کی توقع کے خلاف نکلیں گے اور شاید ایم اسلم کے ناولوں میں دلچسپی کا سبب بھی یہی ہے یہ حیرت و بے ادب کا جزو لا ینفک ہوتی ہے۔ اور اگر حیرت کے احساسات مصنف واضح طور سے ظاہر کر سکے تو یہ اس کی بہت بڑی کامیابی ہوتی ہے۔ انگریزی اور فرانسیسی ادب میں یہ خصوصیت کے حامل متعدد ناول ہیں لیکن اردو میں یہ خصوصیت خال خال ہے اس کی طرف ایم۔ اسلم اپنے ناول کے دیباچہ میں خود لکھتے ہیں کہ۔

۱۲۔ میں جب کوئی ناول لکھنا شروع کرتا ہوں تو یہ کبھی نہیں سوچا کرتا کہ اس کا اختتام یا انجام کیا ہو گا۔ ناول کا اختتام یا انجام واقعات پر منحصر ہوتا ہے۔

ایم۔ اسلم کے اس نہ سوچنے سے ان کے ناولوں میں بڑی جان سی آ جاتی ہے اور مجھے یقین ہے کہ ایم۔ اسلم جب بھی اپنے ناولوں کے انجام پر غور و فکر کرنے لگیں گے اور جب وہ اپنے ناولوں کو بڑی فکر کے بعد لکھیں گے تو مقبول عام ناول نگار نہ رہیں گے۔

اس کے علاوہ ایک اور خصوصیت جو اردو کے کسی ناول نگار میں نہیں ہے وہ یہ ہے کہ اگر ایم۔ اسلم کو کوئی ایسا منظر دکھانا ہے جس میں ان کا ہیرو اپنی محبوب کے انتظار میں ایک گھنٹہ سے کھڑا ہے لیکن محبوبہ نہیں آتی، تو ایک گھنٹہ تک قاری کو بھی انتظار کی گھڑیاں گنتی پڑیں گی ناول کا پلاٹ وہیں کا وہیں رہے گا اور انسردگی اور تنگی کا جو احساس ہیرو کے ذہن پر ہوتا ہے وہی قاری کے ذہن پر ہو گا۔ یہ وہ فنی کامیابی ہے جس کے لئے لکھنو اور دہلی کے داستان گو مشہور تھے۔ دہلی میں ایسے داستان گو بھی گزرے ہیں جنہوں نے مسلسل ہمارے تک روز داستان سائی اور داستان وہیں کی وہیں رہی جہاں چار سال قبل تھی اور پار کے دیدار کے لئے جو پردہ اٹھنے والا تھا وہ اسی طرح پڑا رہا۔ یہ

فن کا بڑا کمال سمجھا جاتا ہے۔ مائتائی نے اپنی کتاب آرٹ کیا ہے؟ میں غلیم فن کی ہی تعریف کی کہ جو اثر مصنف کے ذہن پر مرتب ہو رہا ہے اگر وہ اس اثر کو کاغذ پر منتقل کر دے لکھ دھننے والے پر بھی وہی اثر طاری ہو تو یہ فن کا کمال ہے۔ ایم۔ اسلم اس بات پر نگاہی میں اس معیار پر پورے اُترتے ہیں۔

ایم۔ اسلم بڑی صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ مجھے ان میں اردو کے ناول کا مستقبل نظر آتا ہے۔ لیکن بہتر ہو تا کہ وہ اب ان رومانوں کو چھوڑ کر تاریخی ناولوں کی طرف توجہ کرتے۔ اردو میں تاریخی ناولوں کی بے حد کمی ہے۔ اچھے اور بُرے رومان تو مل ہی جاتے ہیں اور پھر ایم۔ اسلم کے متعدد رومان خود موجود ہیں۔ لیکن تاریخی ناول عبدالحلیم شرر کے بعد سے اب تک نظر نہیں آتے۔ تاریخی ناول سے اسلم صاحب اسلامی جذبہ بھی پیدا کر سکیں گے۔ ملک و قوم کی خدمت بھی انجام دے سکیں گے اور مسلمان قوم کو اس کا ماضی دکھا کر اس کے مستقبل کو ایک زبردست جذبہ کے ساتھ درخشاں بھی بنا سکیں گے اس وقت قوم و ملک کو ایم۔ اسلم کے قلم کی، ایم۔ اسلم کی صلاحیتوں کی اس اعتبار سے بڑی ضرورت ہے۔ اس طرح وہ ایسی خدمات انجام دیں گے کہ پاکستان کی ادبی اور معاشرتی تاریخ میں ان کا نام جلی حروف میں لکھا جائے گا۔

اسلامی تاریخ کی مختصر کہانیاں ایم۔ اسلم صاحب پہلے لکھ بھی چکے ہیں۔ خود ان کے دل میں مسلمانوں کے لئے سہارا دہے۔ ناول نگاری تو ان کا محبوب مشغلہ ہے ہی۔ مجھے یقین ہے کہ اگر وہ اسلامی ناول یا تاریخی ناول لکھیں گے تو نہ صرف کامیابی سے لکھیں گے بلکہ اللہ کی ہر نعمت بڑی میں بھی کئی گنا اضافہ ہو جائے گا۔ یوں وہ عندا اس ملک اور عندا اللہ ماحور بھی ہوں گے۔
(اس مضمون کا کچھ حصہ بیتیں بائیں سال پہلے لکھا گیا تھا اور کچھ حصہ

دس بارہ سال پہلے۔ مضمون کی نظر ثانی میں نے کر دی ہے مگر اس میں کسی قسم کا رد و بدل کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ گزشتہ دس سال میں اسلم صاحب نے متعدد اسلامی تاریخ کے ناول بھی لکھ دیئے ہیں اور ناولوں کا ایک ایسا سلسلہ بھی شروع کر رکھا ہے جس میں آنحضرت صلعم کی سیرت پاک مکمل طور پر آجائے گی۔ یہ ان کا ایک بہت بڑا کارنامہ ہو گا۔ (انشاء اللہ۔)

جوش ملیح آبادی — دیدہ و شنیدہ

میرے والد مرحوم کو اردو کی نئی مطبوعات منگوانے کا شوق تھا۔ کتابیں اور سارے چھپتے ہی ان کے پاس پہنچ جایا کرتے تھے۔ غالباً ۱۹۳۷ء کا ذکر ہے کہ نئی کتابوں میں ایک کتاب صبح ادب بھی آئی تھی۔ یہ کتاب اس زمانہ میں شائع ہونے والی کتابوں سے یکسر مختلف تھی۔ اس کی ہر بات اذکی تھی۔ بانگ درا کے سائز پر چھپی تھی جو اس زمانہ میں بالکل نادر و نایاب تھی۔ کتابت و طباعت بڑی دیدہ و زیب تھی۔ چند تصویریں بھی اس کتاب میں شامل تھیں۔ ”روح ادب“ میں چھوٹے چھوٹے شاعرانہ مضامین تھے۔ شاعرانہ مختصر مضامین لکھنے کا غبطہ اب سے چالیس سال پہلے ہر ادیب کو تھا۔ بلکہ اسے کمالِ شہرت و سجا جاتا تھا کہ ایسی عبارت لکھی جائے جس میں مرثیے عربی فارسی کے الفاظ اور مفصلات ترکیبیں ہوں اور اصل بات بہت فدا سی ہو۔ بلکہ اگر اصل بات سرے سے اس میں ہو ہی نہیں تو ادب بھی اچھا۔ اس صورت میں یہ تحریر ادیب کا شاہکار بن جاتی تھی۔ ایسے ہر ادیب کی ہر تحریر شاہکار و تصدیق کی جاتی تھی۔ کتنے ہی ادیب ایسے تھے جو صرف شاہکار ہی لکھا کرتے تھے۔ اصل میں یہ بیماری گیتا بخل کے ترجمہ سے اردو میں پھیلی تھی۔ یگود کی مابعد الطبیعیاتی شاعری کو یاد لوگ سمجھتے ہیں یا نہ سمجھتے ہوں جھٹ اس کے ترجمہ پر اتر آئے۔ چونکہ یگود کو لوہل پر اتر ملا تھا اس لئے یہ سمجھ لیا گیا کہ ضرور اس میں کوئی بڑے کام کی بات کہی گئی ہے۔ حالانکہ آج تک یورپ والوں ہی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ ملازمی اور مارٹنک

قسم کے شاعر یہ کیا فرماتے ہیں کہ

ایک دروازہ کھلا

ایک دروازہ بند ہوا اور

ایک بچے کے رونے کی آواز آئی۔

انہیں یہی معلوم نہ ہو سکا کہ اس پر کہاں سر دھنا جائے؟ یگود نے بھی یہی گڑ استعمال کیا اور ٹیس نے اسے جھنڈے پر چڑھا دیا۔ اردو کی شامت اعمال، یہ کتاب کہیں سے نیاز خجوری کے ہاتھ لگ گئی۔ موصوفی نے اس کے نام سے اس کا ترجمہ فوراً تیار ہو گیا۔ نام ہی دیکھ لیجئے موصوفی نے اس کے اندر جو گت یگود کے شاہکار کی بنی ہے اسے کسی وقت فرصت سے دیکھئے گا تو اس کے جوہر آپ پر کھل جائیں گے۔ ہمارے ادیبوں کے ہاتھ ایک سہل نسخہ لکھنے لکھانے کا آیا، لگے سب کے سب عرض نہ کرنے البتہ اتنا اضافہ یگود پر اور کیا کہ اپنی تحریروں میں بہت سارے آہ — ڈیش اور نقطے اور ڈنڈے (!) جہاں تھاں ڈال دیئے تاکہ پڑھنے والے ان ڈیشوں اور ڈنڈوں سے نفس مضمون کی پھیلی پر سر ٹھپٹل کرتے رہیں۔ پیاز کو چھیلے، پرت ہی پرت اترتے چلے جائیں گے، مغز آپ کیس نہیں پائیں گے۔ یہی حال اس نیاز یا پیازی ادب کا تھا جسے ”ادب لطیف“ موسوم کیا گیا۔ جو دراصل ہماری نثر کا ”چوما چائی اور سانڈے کے تیل“ کا درد تھا۔

بات میں سے بات نکل آئی

ذکر جب چھڑ گیا قیامت کا

بات پہنچی تری جوانی تک

ہاں تو ذکر تھا ”روح ادب“ کا۔ اس میں جو نثر پاپے درج تھی ان کا انداز تحریر

روحیں عام سے یکسر مختلف تھا۔ واقعی یہ معلوم ہوتا تھا کہ نثر میں نظمیں لکھی گئی ہیں مصنف

کا نام تھا ذوالشیر حسین خان جو شش ملیح آبادی میں نے جو شش صاحب کو یہیں

سے جانا پہچانا۔ اس کے بعد ہمایوں میں ان کا کلام بالانتظام شائع ہونے لگا اور بعض اور
مقتدر ادبی رسائل میں بھی۔ ساقی میں جنوری ۱۹۳۳ء یعنی پہلے ہی پرچے میں جوش صاحب
کا کلام آنے لگا۔ ۱۹۳۲ء میں مجھے اپنے منجملے بھائی منبشر احمد اور دوسرے عزیزوں سے
ملنے حیدرآباد جملے کا اتفاق ہوا۔ مجھے جن ایہوں اور شاعروں سے حیدرآباد میں ملنا تھا
ان کی فہرست خاصی طویل تھی۔ منجھو صاحب پولیس کے آدمی! انھیں تمام سلسلوں
کی خبر تھی۔ فہرست دیکھ کر بڑے فرحت اللہ بیگ سے تمہیں سید وزیر حسن ملوائینگے۔
فانی، جوش اور علی اختر سے کرنل اشرف الحق۔ مولوی عنایت اللہ سے تابش، میں
بھی ساتھ چلا چلوں گا۔ تمہیں کاظمی تو یہ ملنے ادارہ طہیر میں روز شام کو آتا ہے۔ اور یہ
ناکارہ اور آوارہ اند کون کون ہے! انھیں تھانے میں یہیں کیوں نہ بلوایا جائے؟ میں
نے کہا: مناسب نہیں ہوگا۔ پہلے میں ایک ایک بار سب کے ہاں ہواؤں۔ بولنے تو
پھر یہ کرتے ہیں کہ تھانے میں نہیں کھانے پر سب کو بلائے لیتے ہیں۔ میں نے کہا: اسے بھی
بعد کے لئے اٹھا رکھو۔ یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ کرنل اشرف الحق باہر ہی سے
آوازیں دیتے دے آئے: شاہد کہاں ہے، شاہد کہاں ہے! میں دودھ گران سے پوٹ گیا۔
اس وقت مجھے سے عمر میں دو گئے تھے۔ میرے پھر بھی زاد بھائی تھے۔ چودہ سال دلاہیت
میں رہ کر ایڈنبرا سے ڈاکٹری کی سند لے کر آئے تھے اور قلعہ گوگندہ میں افواج باقاعدہ
کے بڑے ڈاکٹر تھے۔ اللہ ان کی روح کو نہ شرمائے ہر وقت اتنی پیٹتے تھے کہ مرنے لگتے تھے۔
وہ تو شراب کو کیا چھوڑتے شراب انہیں چھوڑ دیتی تھی۔ اچھے ہونے کے بعد مہینوں
نہیں پیتے تھے، پھر کوئی دوست ہشکادینا اور سلسلہ پھر جاری ہو جاتا۔ مگر اتنی پینے
پر بھی میں نے ڈاکٹر صاحب کو کبھی بہکتے یا مدحوش ہوتے نہیں دیکھا۔ وہ اس قدر
عجیب و غریب کردار کے آدمی تھے کہ ان پر ایک طبعہ مضمون لکھنے کی ضرورت ہے۔
غفر ایں مجھے کہ منجملہ اور صفات کے شر کہنے کا بھی خاص ملکہ رکھتے تھے مگر ہزل زکریا

نرا کھرا فحش، عریاں تخلص تھا۔ شعر شاعری کی وجہ سے حیدرآباد کے تمام شاعروں سے
تعلق تھا۔ اور سب کا دم بھی ان سے نکلتا تھا کیونکہ وہ اسی بات پر فحش جو لکھ دیا کرتے
تھے، اندر ستم بالائے ستم یہ کہ خود جا کر اسے سنا بھی دیتے تھے۔ خیر تو ڈاکٹر صاحب سے
یہ طے ہو گیا کہ جوش صاحب سے مجھے وہ اگلے دن ملوادیں گے۔ دوسرے دن صبح
دس بجے ڈاکٹر صاحب آئے اور مجھے دارالترجمہ لے گئے۔ سب سے پہلے ابوالخیر موسوی
سے ملوایا جو ابوالاعلیٰ مودودی کے بڑے بھائی تھے۔ دھان پان سے نرم و نازک آدمی
تھے مگر ان کے لفظ لفظ سے طبیعت ٹپکتی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کے خاص دوستوں میں
سے تھے۔ جوش اخلاق سے کھانے پر مدعو کیا۔ مولانا عادی سے ملوایا۔ انھوں نے
بھی دعوت کی پیشکش کی۔ جوش صاحب سے ملوایا۔ مگر جوشی سے ملے۔ دعوت کا دن
مقرر کر لیا۔ باہر نکل کر میں نے کہا: بھائی جان، اگر دعوتیں ایسی فراخ دلی سے منظور
کی گئیں تو منجھو صاحب بگڑ جائیں گے۔ بڑے: میں منجھو کو بھاؤں گا۔ اس کے بعد
گھڑی دیکھ کر بڑے: ابھی دوپہر کے کھانے میں کچھ دیر ہے، آگے ہاتھوں علی اختر سے بھی
مل لو میں نے کہا چلئے۔ علی اختر کے گھر پہنچے۔ دروازہ کھٹکھٹایا۔ لڑکا برآمد ہوا۔ ڈاکٹر صاحب
نے پوچھا: آبا ہیں؟ وہ ہیں! مہر کر اند بھاگا۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا: سنو، ان سے برو
شاہد احمد دہلوی ملنے آئے ہیں۔ لڑکا میرا نام جانتا تھا، ایک نظر اس نے مجھے دیکھا
اور تیری ہو گیا۔ پانچ منٹ گزر گئے واپس نہیں آیا۔ ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ آج کل
علی اختر کے سارے جسم پر پھوڑے پھنسیاں نکل آئی ہیں۔ دوا لے بیٹھا ہوگا۔ دفتر سے
چٹھی لے رکھی ہے۔ بارے لڑکا منہ لٹکائے واپس آیا اور نیچی نظریں کئے بولا: آبا کہیں
باہر گئے ہوئے ہیں۔ جب ہم کاریں واپس آ بیٹھے تو ڈاکٹر صاحب نے کہا: گھر ہی میں تھا
میں نے پوچھا تو ملے کیوں نہیں؟ بڑے کل معلوم ہو جائے گا۔ اگلے دن ڈاکٹر صاحب
علی اختر کے ہاں سے ہوتے ہوئے آئے۔ انھوں نے بتایا کہ علی اختر ملے تھے اور بہت

شرمندہ تھے کہ کل تم سے نہیں ملے۔ دراصل اس بچا بے کے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں کہ تمہاری دعوت کر سکے۔ یہاں کا رواج یہی ہے کہ ہمان کی دعوت ضرور کی جاتی ہے۔ انکی اس حرکت پر مجھے غصہ بھی آیا اور ترس بھی آیا کہ محض ایک یہودہ رواج کے باعث اس دفعہ اُن سے ملاقات نہ ہو سکی۔

جوش صاحب کے ہاں ڈاکٹر صاحب مجھے لے گئے۔ خاصی پر تکلف دعوت تھی۔ دسترخوان پر منہس مذاق کی باتیں ہوتی رہیں۔ ڈاکٹر صاحب بڑے زندہ دل آدمی تھے۔ روتوں کو ہنساتے تھے۔ جوش صاحب شاعر بھی تھے اور بادہ خوار بھی، اس نے ڈاکٹر صاحب سے ان کی خوب نہجی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کی زبانی مجھے جوش صاحب کے بہت سارے واقعات معلوم ہوئے۔ ان میں سے چند آگے بیان ہوں گے۔

ڈاکٹر صاحب عمدہ ذہنی شراب پیا کرتے تھے جوش صاحب بلا نوش تھے، جو بھی بن جاتے چڑھا جاتے تھے۔ انہیں جب بھی فرصت ملتی شام کو ڈاکٹر صاحب کے ہاں جانیچہ، عمدہ اور صفت کی ملتی تھی اس لئے گلاس پر گلاس چڑھائے پلے جاتے۔ ڈاکٹر صاحب دوتین گلاسوں میں چمک جاتے تھے۔ بوتل یا تو منہ میں ایک خرچ ہوتی تھی یا اب تیسرے ہی دن ان کی بیوی کہہ دیتیں کہ آپ شہر جائیں تو اپنی بوتل لیتے آئیں۔ شروع شروع میں تو یہ ڈھرا چلتا رہا مگر جب ہنگام پڑنے لگا تو ڈاکٹر صاحب کے نشہ ہرن ہونے لگے۔ ایک دن شہر گئے تو ایک ولایتی بوتل بھی لائے اور دیسی ٹھڑے کی بھی۔ ٹھڑا دیکھ کر ان کی بیوی چمکیں۔ جب ٹھڑا آپ کو نہیں بچتا تو آپ کیوں لائے ہیں؟ اُس موئے شرابی نے آپ کو بھی ٹھڑے پر لگا دیا۔ ڈاکٹر صاحب نے بڑی متانت سے کہا یہ ٹھڑا اسی موئے شرابی کے لئے ہے۔ ڈاکٹر صاحب گلاس خود کبھی نہیں بناتے تھے۔ گھر میں بیوی بنا کر دیتی تھیں اور گھر کے باہر ایک ملازم جو ہمیشہ ساتھ رہتا تھا۔ اب یہ ہونے لگا کہ جب جوش صاحب آجاتے تو ڈاکٹر صاحب کے آواز لگانے پر ملازم دو گلاس بیگم صاحب سے ہوا کر یا خود بنا کر لاتا اور ٹھڑے والا گلاس

جوش صاحب کو بھڑا دیتا۔ جوش صاحب کہتے کہ آپ نے بھی دیسی مینی شروع کر دی؟ تو ڈاکٹر صاحب کہتے ہاں۔ مگر یہ دیسی اچھی ہے۔ فریب کا یہ سلسلہ دفن جاری رہا۔ بعد میں ڈاکٹر صاحب نے خود ہی اس کا بھانڈا پھوڑ دیا۔ اُن کے دل میں کوئی بات رہتی نہیں تھی۔ شاید ہر شرابی کا دل منافقت سے خالی ہو جایا کرتا ہے۔

جب جوش صاحب کے لئے نظام دکن میر عثمان علی خان نے ملک بددی کا فرمان جاری کیا تو مجھے کسی نے حیدر آباد سے اطلاع دی کہ ساقی میں غزل گو سے خطاب ہو نکلم جوش کی چھپی ہے اس پر یہ خطاب ہوا ہے پیشی کے ایک منہ چڑھے آدمی نے نظام کو سنکا دیا کہ حضور یہ گستاخی جوش نے آپ کی شان میں کی ہے۔ اُس زمانے میں جریدہ شاہی اور روزنامہ دہر دکن میں روزانہ میر عثمان علی خان کی ایک کھپچھی سی غزل مع رائے استاد حلیل چھپا کرتی تھی۔ یہ رائے بھی حضرت خود ہی لکھ دیا کرتے تھے کہ بھان اللہ! کیا عزل ہوتی ہے، مجھے اطلاع دینے والے نے یہ اندیشہ بھی ظاہر کیا تھا کہ شاید ریاست میں ساقی کا داخلہ ممنوع قرار دے دیا جائے گا مگر اس کی فوج نہیں آئی۔ جوش کو چوبیس گھنٹے میں مالک ہر دوسرے نکل جانے کا حکم ملا تھا۔ یہ بارہ ہی گھنٹے میں وہاں سے نکلے کہ کہیں ضبطی اور قید کا دوسرا فرمان جاری نہ ہو جائے۔ دہر دکن میں روزانہ ذرا اسی بات پر فرمان نکلتے رہتے تھے۔ بھان اللہ! پڑھنے کے لائق ہوتی تھی عبارت ان فرمانوں کی۔ کاشش کوئی انھیں جمع کر کے شائع کر دے۔ خوبی اور حاجی بغلول کو آپ بھول جائیں گے۔ خیر، یہ ایک الگ کہانی ہے۔ دراصل نظام کے منسلک شہزادے معظم جاہ کے شبینہ دربار میں جوش کا عمل دخل ضرورت سے زیادہ ہو گیا تھا اس دربار کے واقعات سن کر دو ٹوٹے ٹوٹے ہو جاتے ہیں۔ مختصر آویں سمجھئے کہ شروع کا دربار حرام پور اس کے آگے گھر تھا۔ جوش اس دربار کے حاضر باش تھے۔ میں نے حیدر آباد کے ثناء وادیں سے سنا ہے کہ معظم جاہ کے اشارے پر کل حاضر باش ننگے ہو کر ناچنے لگتے تھے، اور اس کے بعد جو کچھ ہوتا تھا وہ لکھا نہیں جاسکتا۔ اگر کوئی پچھر دوزا انہیں ننگے کرتا

ترتیب خدمتوں کو حکم ہوتا کہ آپ کو جلالہ وہ اس عزیز کو اٹھالے جلتے اند پھاڑ کر اتنی پلاتے کہ اُسے اپنے تن بدن کا جوش نہ رہتا پھر اسے دہبار میں برہنہ کر کے پیش کیا جاتا اور اُسے اندھا کر کے جلتی ہوئی موسم اتنی لگادی جاتی یہ منظر دیکھ کر سب کے دلوں کے کنول کھل جاتے۔ اور جب وہ جوش میں آتا تو اس سے کہا جاتا آئندہ سرکار کے کسی حکم سے سرتابی نہ کرنا۔ ان تمام سپردگیوں کی اطلاع عاجزہ کو پہنچتی رہتی تھی مگر وہ شفقت پندی میں مرے جاتے تھے۔ بیٹے سے کچھ نہ کہتے اس کے حاضر باشوں کی تاک میں لگ جاتے۔ چنانچہ طویل کی بلا بندر کے سر جوش پر نزلہ گرانے کا انھیں بہانہ ہاتھ آگیا۔ جوش صاحب حیدر آباد چھوڑنے کے کچھ عرصہ بعد دلی آئے۔

حیدر آباد میں جوش صاحب دارالترجمہ میں ناظر ادبی تھے۔ سُنلے کہ علامہ اقبال سے کسی بڑے آدمی کے نام تعارفی اور سفارشی خط لے کر حیدر آباد گئے تھے۔ نرا کھرا شاعر سوائے شعر کہنے کے اور کیا کر سکتا ہے؟ مگر اس وقت ہمارا جکشن پر شاد جیسے علم دوست برسرِ اقتدار تھے۔ وہ شاعروں کو بھی کہیں نہ کہیں کھپا دیا کرتے تھے۔ چنانچہ قافی کو انہوں نے کسی اسکول کا ہیڈ ماسٹر بنا دیا تھا اور لگانہ کو کہیں اصلاح میں سب رجسٹرار رکھوا دیا تھا۔ جوش کو انہوں نے دارالترجمہ کی پزل میں دھانس دیا۔ ان کا کام یہ تھا کہ تراجم کی نظر ثانی کیا کریں۔ وہاں وہ کیا کرتے ہوں گے! اس کا اندازہ یہاں ترقی اور دہرڈ میں ان کی کارکردگی سے ہوا۔ دہرڈ نے اردو کی نایاب اور کم یاب کتابوں کے شائع کرنے کا انتظام کیا ہے۔ مولوی نذیر احمد کی کتاب منتخب الحکایات کے متعلق دہرڈ کے سرکاری شان الحق صاحب کا ایک مراسلہ میرے نام آیا کہ آپ اس مطبوعہ کتاب میں جو غلطیاں کتابت و طباعت کی وجہ سے داخل ہو گئی ہیں ان کی تصحیح کر دیجئے اور کتاب پر آٹھ دس صفحے کا مقدمہ لکھ دیجئے۔ پاکستان میں یہ کتاب مجھے کہیں نہیں ملی، لہذا دلی سے اس کا ایک نسخہ کسی نہ کسی طرح منگایا اور اُسے ٹھیک ٹھاک کر کے دہرڈ کو بھیج دیا۔ ایک مہینہ بعد حقی صاحب کا ٹیلیفون

آیا کہ منتخب الحکایات کا کوئی اور نسخہ ہو تو دہرڈ کو بھیج دیجئے۔ دہرڈ اس کی قیمت ادا کر دیا۔ میں نے کہا قیمت تو اس کی چھ آنے یا آٹھ آنے ہی ہے مگر وہ کتاب ملتی کہاں ہے! پہلے بھی مشکل سے ملی تھی۔ معلوم ہوا کہ ناظر ادبی نے نہ صرف میرے مقدمہ کی زبان ٹھیک کر دی بلکہ اصل کتاب کی زبان بھی ٹھیک کر دی۔ اور فقرے کے فقرے اس بُری طرح کالے ہیں کہ اصل عبارت پڑھی نہیں جاسکتی۔ میں نے کہا خیر میری زبان تو وہ ٹھیک کر سکتے ہیں مگر جس کی کتاب میں پڑھ کر ہم سب نے اردو زبان سیکھی ہے۔ اس کی زبان میں بھی جوش صاحب کو غلطیاں نظر آگئیں۔ ذرا مجھے اصلاح شدہ نسخہ بھیج دیجئے۔ تاکہ میں بھی جوش صاحب کے اخراجات سے محروم نہ رہوں۔ حقی صاحب دہرڈ آدمی ہیں، انھوں نے بہ لطافت الحیل اس تفسیر کو ٹالا اور میں نے دلی سے ایک اور نسخہ ٹھیک کر کے انھیں بھیجا۔ دارالترجمہ کے ناظم مولوی عنایت اللہ مرحوم بڑے مرنجان بنج آدمی تھے۔ ان کی باتوں سے مجھے اندازہ ہوا تھا کہ وہ جوش صاحب سے خوش نہیں تھے۔ جب کام کرنے کا یہ اسلوب ہو تو کوئی خوش ہو بھی کیسے سکتا ہے؟ دلی آنے کے بعد جوش صاحب نے ایک ادبی ماہنامہ جاری کیا۔ انہوں نے یہ نہیں دیکھا کہ جو ادبی ماہنامے شائع ہو رہے ہیں ان کی مالی حالت کیسی ہے اور انھیں کیسے چلایا جا رہا ہے۔ یار لوگوں نے درغلایا اور جوش صاحب چڑھ گئے سسلی پر۔ دلی گنج میں ایک مکان کرایہ پر لیا گیا اور بڑیوں کے کڑے میں دفتر کے لئے ایک بالا خانہ کروفر سے سجایا گیا۔ ایک دفعہ مجھے بھی اس دفتر میں جانے کا اتفاق ہوا۔ جوش صاحب کو راہ واہ کر لے والے گھیرے رہتے۔ دن بھر چائے، شربت، پان، سگریٹ سے تواضع ہوتی۔ ادھر سودر غروب ہوا اور جوش صاحب پیمانہ بکف طلوع ہوئے۔ مُنت خوروں کو بھی چُکی لگانے کا موقع ملا۔ گھنٹہ ڈیرٹھ گھنٹہ یشغل رہا۔ اس کے بعد سب اپنے اپنے گھر سدھارے۔ ادبی رسالے کہیں ایسی شاہ خیر چل

سے چلتے ہیں؟ چند مہینے بعد دفتر چھوڑنا پڑا۔ گھر پر میں دفتر بھی چلا گیا۔ ہرچے چلنے کی کوئی صورت نہیں نکلی۔ جوش صاحب کو یہ معاملہ تھا کہ جتنی جی وہ نظم لکھتے ہیں اتنی ہی اچھی نثر بھی لکھتے ہیں۔ ایک نیا مضمون لگا راسرائیل احمد خاں انھوں نے خدا جلے کہاں سے تلاش کر کے نکالا تھا۔ وہ اینڈے مینڈے مضامین لکھا کرتا تھا۔ یہ زمانہ تھا ہاویں ادبی دنیا، نیرنگ خیال، عالمگیر ادب ساقی کے شباب کا جوش صاحب نے محسوس کر لیا کہ پبلک بڑی ناقدہ شناس ہے، وہ نسل کبھی مستقبل بعید میں پیدا ہوگی جو ان کے رسالہ کلیم کی صحیح قدر دانی کر سکے گی۔ رسالہ بند کرنے کے بعد انھوں نے ایک مقامی پبلشر سے اپنی کتابیں چھپوانے کا معاملہ کیا۔ چندے ان کی رائٹنگ پر گزارہ ہوا۔ پھر یہ مسئلہ کہ ملیح آباد کی طرف ان کا کوئی بہت بڑا زمیندار عزیز مر رہا ہے یا مر گیا ہے اور اس کی پوری املاک کے وارث جوش صاحب ہی ہیں۔ اب انھیں کئی کروڑ روپیہ ملنے والا ہے اسلئے وہ دلی سے چلے گئے ہیں۔ یہ سننے میں آج تک نہیں آیا کہ انھیں وہاں سے کیا ملا۔

جوش صاحب کے دوران قیام دہلی ہی میں ایک دفعہ کرنل اشرف الحق دلی آئے تو مجھ سے کہا کہ جوش صاحب کے ہاں چلو۔ میں نے کہا مجھے تو ان کا گھر معلوم نہیں کہ کہاں ہے۔ کہیں دیا گئے میں رہتے ہیں۔ پھر کوپ ہی نے تو کہا تھا کہ جوش سے دود کی دوستی رکھنا۔ ویسے بھی میں شاعر ہی کا آدمی نہیں، اور جوش کا ہم مشرب۔ کج تک میں ان کے گھر نہیں گیا اور نہ میرے گھر آئے۔ سر رہا ہے گلے یا کسی اجتماع میں ان سے سرسری سی ملاقات ہو جایا کرتی ہے۔ آپ ان کے ہاں ہوتے ہیں ساتھ جا کر کیا کروں گا؟ ڈاکٹر صاحب نے اس زمانے میں شراب بالکل چھوڑ رکھی تھی۔ بولے تمہارا چلنا ضروری ہے۔ اگر وہاں پیئے پلانے کا قصہ ہوا تو تم مجھے روک سکو گے۔ لہذا مجھے ان کے ساتھ جانا پڑا۔

مغرب کے بعد ہم جوش صاحب کے مکان پر پہنچے۔ نیچے ایک بڑا سا گروہ تھا جس میں جوش صاحب کے ساتھ پانچ سات آدمی بیٹھے خوش گپیاں کر رہے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کو

دیکھا تو رہے انھیں تنظیم دی۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا: شاید کو تو جانتے ہوں؟ جوش صاحب نے کہا: جی ہاں۔ مگر کبھی ملاقات نہیں ہوتی۔ بیٹھنے کے بعد اندر سے تعارف ہوا۔ حکیم آزاد انصاری کو میں پہلے سے جانتا تھا۔ اب وہ جوش صاحب کے ہاں مستقلاً آن پڑے تھے۔ بڑھاپے اور بیماری میں ان کا کوئی پرسان حال نہیں رہا تھا۔ کبھی کسی کے ہاں اور کبھی کسی کے ہاں جا پڑتے۔ میزبان ان کے ہنر کی وجہ سے انھیں ہاتھوں ہاتھ لیتا۔ اس کے بعد ان سے شعر کہلو اکھلو کر اپنی بیاض بھرتا جب وہ اپنے شعر دینے میں پس دہش کرتے تو میزبان اُپر اُپر لگتا۔ حکیم صاحب اس بے غوری اور ناقدری کو تاثر دیتے اور کسی اور شاگرد دیا قدر دان کے ہاں اٹھ جاتے۔ ایک صاحب کا تو پورا دیوان آزاد انصاری ہی کا کہا ہوا ہے۔ دلی میں انہوں نے کئی ٹھکانے بدے۔ آخر میں ایک مجلس معرخص شاگرد کے ہاں چلے گئے تھے، اور جب ان کی حالت بگڑی اور ڈاکٹروں نے جواب دے دیا تو وہ غریب شاگرد حمید آباد انھیں لے کر پہنچا، اور ان کے بیٹے کے گھر انھیں چھوڑ آیا۔ بیٹا اچھا خاصا پیسے والا تھا۔ معرہ استکراہ اس نے باپ کو وصول کیا۔ بڑے میں دھڑا ہی کیا تھا۔ دو چار دن بعد اللہ کو پرہیز ہو گیا۔ تو یہ آزاد انصاری بھی جوش صاحب کے ہاں موجود تھے۔ نہال سیوہادی بھی پہنچے ہوئے تھے۔ دود شراب تو ہمہری رہا تھا، ایک مجلس ڈاکٹر صاحب کے لئے اور ایک میرے لئے تیار کر کے پیش کیا گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا: شاید تو نہیں جانتے، اور میں نے بھی آج کل چھوڑ رکھی ہے۔ جوش صاحب نے حیرت سے میری طرف دیکھا اور بے ساختہ ان کے منہ سے نکلا:

ساتی کے مدیر اور نہیں میں نمودر برعکس نہند نام زنجی کا نور!

کیا واقعی بالکل نہیں؟ میں نے کہا: جی ہاں، میں نہیں جانتا۔ جوش صاحب نے ان کا عینیت مزید اصرار نہیں کیا مگر ڈاکٹر صاحب سے بولے جی یہ نہیں ہو سکتا۔ آپ کو تو مینی پڑ گئی یہ کہہ کر ان کے ہاتھ میں مجلس تھا دیا میں نے ڈاکٹر صاحب کو ہڈو کا دیا مگر انھوں نے متانت نظر سے میری طرف دیکھا اور چپکے سے بولے: جوش نہیں مانتا تھوڑی سی پی لینے میں

کوئی مضائقہ نہیں۔ جوش صاحب کو سرور گنڈہ رہا تھا، ان کی نکل انسانی شروع ہو گئی۔ بلا کا حافظ پایا ہے اس شخص نے نہ بڑھتا جاتا تھا اور زبان کھلتی جاتی تھی۔ بعد از رباعیوں کے بعد اپنا نقش کلام سنانا شروع کر دیا۔ جب وہ بھی ختم ہو گیا تو فی البدیہہ اپنا شروع کر دیا۔ مگر آخر میں اعتراض بھی کیا کہ اس کا استاد توفیق احمد خاں ہے۔ دو گھنٹے بعد میں نے اجازت چاہی تو ڈاکٹر صاحب بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کے قدم لڑکھڑاہے۔ بڑے شاہد، تم مجھے گھر پہنچا کر جانا۔ باہر نکل کر میں نے ترا بزم خاں کا ناگہ کیا۔ پچانگ سے بیڑھی جو بی بی تک نہیں سہارا دے کر لے گیا۔ نیچے کرایہ دار تھے، اوپر کی منزل میں ڈاکٹر صاحب کا قیام تھا۔ زینہ طے کرنا ایک عذاب ہو گیا۔ جب انھیں ان کے کمرے میں پہنچایا تو ان کی چھوٹی بیگم جو ان کے ساتھ آئی تھیں برلین شاہدیاں، یہ کیا کیا؟ ڈاکٹر صاحب بھی بھٹی بھٹی آنکھوں سے بیوی کی طرف دیکھتے رہے، میں نے کہا: بھائی، یہ جوش صاحب کے ہاں سے آ رہے ہیں؟ پچ کر برلین اس مائی ملے کے پاس انھیں گول لے گیا تھا؟ میں نے کہا: خود ہی گئے تھے۔

شاہدیاں، تم نے بھی انھیں نہیں روکا؟

”روکا تھا، کھلائے رکھنے والے ہیں؟“

ڈاکٹر صاحب بڑبڑائے: عباسی، شاہد کو جانے دو۔ اُسے دیر ہو رہی ہے۔

اس کے بعد خدا جانے میاں بیوی میں کیا نصیحتا ہوا۔ اگلے دن ڈاکٹر صاحب میرے ہاں آئے تو ان کے بیگ میں ملائی بوتل موجود تھی اور وہ ہر آدھ گھنٹہ بعد گلاس بولتے اور پیتے رہے۔ ان کی شراب پھر شروع ہو گئی تھی ادب خاندان کے روکے بھی نہیں رگ سکتی تھی۔ پھر دو دن تک ڈاکٹر صاحب نہیں آئے تو مجھے مزاج پرسی کے لئے ان کے گھر جانا پڑا۔ پہلے بھائی ادب بچوں کا کمرہ بیچ میں پڑتا تھا۔ بھائی کا چہرہ اترتا ہوا تھا۔ برلین: نہ کچھ کھا سکتے ہیں اور نہ پی سکتے ہیں۔ اُبکانی لگی ہوئی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے کمرے میں جا کر دیکھا کہ وہ بے سرو پلنگ پر پڑے ہوئے ہیں اور ڈاکٹر محمد عمران کے سر ہانے بیٹھے ہوئے ہیں۔ میرے چلتے ہی

ڈاکٹر عمر نے میری ٹانگ لی: اماں کیوں لے گئے تھے انھیں اس کے پاس؟ میں نے کہا: اب کیفیت کیلے؟ بڑے مر رہے ہیں۔ میرے پیروں تلے کی زمین نکل گئی۔ روجھی، اُلٹی مہنتیں لگے پڑیں۔ پھر ڈاکٹر صاحب کو بھی کھانسی لگی اور وہ اُدکتے ہوئے اٹھ بیٹھے۔ آنکھوں میں طعنے پڑے ہوئے، چہرے پر زردی کھنڈی ہوئی۔ سینے میں سانس نہ سہاتا تھا۔ عرض مزاجی کی دہی کیفیت۔ ہانپ کر بولے: بھائی۔ یہ عمر کتنا ہے کہ میں مر رہا ہوں، مگر میں مردوں کا نہیں عباسی ایک کلاس بنا دینا۔ ڈاکٹر عمر نے کہا: مرنے سے بدتر تو ہو گئے مگر چھوڑتے اب بھی نہیں۔ بولنے تیری طرح کم ظرف تھوڑی ہوں سپینے کا نام بھی بدنام کرتا ہے: اتنے میں عباسی بیگم کلاس بنالائیں۔ ڈاکٹر صاحب کے منہ سے لگا دیا۔ پی کر بولے: بھائی اب میری دوا بھی نہیں ہے۔ غرض ڈاکٹر صاحب ایک ہفتہ تک زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا رہے۔ یہ ہوشی میں ڈاکٹر عمران کے انکشن لگاتے رہے، ہوش میں آنے کے بعد انہوں نے شراب نہیں پی۔ مہینہ بھر میں سانس نہ ہو گئے اور خیر سے حیدر آباد سدھارے۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ پطرس بخاری نے مجھے رُتھ بھجوا اور زبانی بھی کہلوایا جیسا کہ سالک

صاحب آئے ہوئے ہیں، کل رات کا کھانا میرے ساتھ کھانا۔ میں وقت مقررہ سے کسی قدر پہلے پہنچ گیا تاکہ سالک صاحب سے باتیں کرنے کا موقع مل جائے۔ ہم دو چار آدمی سالک صاحب کے گپ شپ کر رہے تھے کہ جوش صاحب بھی آئے پہنچے۔ طیک سلیک کے بعد کوٹھی کے برآمدے میں گئے۔ وہاں جنگل کشور مہرا بیٹھے ہوئے تھے جو اس وقت تک سلمان نہیں ہوئے تھے اور پطرس بخاری کے پرسنل اسٹنڈ تھا۔ جوش صاحب نے ان سے پوچھا: پتہ پلے کے لئے کیا ہے؟ انہوں نے گہرا کر کہا: بخاری صاحب تو نہیں پیتے، جوش صاحب نے کہا: وہ نہیں پیتے تو کیا ہم تو پیتے ہیں۔ جاد بخاری صاحب سے کہو کہ ہمارے لئے کچھ پینے کو بھیجیں۔ وہ دوڑے ہوئے آئے اور بخاری سے کچھ کھسکھس کر کے پھر جوش صاحب کے پاس پہنچے۔ خبر نہیں ان دونوں کے درمیان کیا گزری۔ وہاں آنے شروع ہو گئے

آنے والوں میں بڑے متنازعہ کے وگ تھے۔ خواجہ حسن نظامی بھی تھے اور دیوان سنگھ منوں بھی۔ تقریباً بیس جفاہدی قسم کے حضرات کھلنے پر جمع ہو گئے۔ جوش صاحب الگ گھاس پر ٹپتے رہتے تھے۔ مجھے اُن کے قریب جگر ملی۔ پوچھنے لگے: اسے کس نے بلایا! میں نے کہا: "کے؟" خواجہ صاحب کی طرف اشارہ کیا۔ بولے: جب سے یہ آئی ہے والدہ کن والد کی برہنہ آ رہی ہے۔ ان کے اس فقرے کا مزہ اردوں نے بھی لیا۔ بات شدہ شدہ بخاری صاحب تک بھی پہنچ گئی۔ وہ کھکھلا کر ہنسنے لگے۔ اس کے بعد جوش صاحب نے بھری میز پر بخاری صاحب کو مخاطب کر کے کہا: "دشتر ہو گئے ہیں، سُن یہ لُجے۔" مجھے تو دشدریر یاد نہیں رہتے مطلب یہ تھا کہ نام تو بخاری ہے مگر ہندوئی اتنی سی ہے کہ پینے کو شراب مانگو تو ملتا ہے ٹھنڈا، برت کا سادہ پانی، سب سے واہ واہ سبحان اللہ میں ان اشعار کو اڑا دیا۔ خود بخاری صاحب نے کسی قسم کی ناگواری کا اظہار نہیں کیا بلکہ خوب داد دی۔

فقیر دی کے قریب ایک ہوٹل میں فراق گد کھپودی دتی اگر ٹھہرے تھے۔ شام کو اُن کے کمرے میں بہت سارے پینے والے شاعر جمع ہوئے۔ ان میں جوش، نہال، مجاز، اردنا شیر بھی تھے۔ جوش صاحب تو شاعر انقلاب ہونے کے علاوہ شاعر اعظم بھی ہیں مگر اپنے پندار میں فراق اُن سے اپنے آپ کو کم نہیں سمجھتے تھے۔ جوش نے جب رباعیاں کہنی شروع کیں تو فراق نے بھی اردو ہندی آمیز زبان میں روپ سروپ کی رباعیوں کی بھرمار شروع کر دی۔ جوش صاحب نے کبھی کسی سے مقابلہ نہیں کیا۔ خبر نہیں یہ اُن کی بزدلی ہے یا شرافت۔ مگر فراق صاحب ہمیشہ میدان میں اتر آتے ہیں اور شیر برماں بن جاتے ہیں۔ دیے تو جوش اور فراق میں بڑا درستانہ تھا اور دونوں ہم نوالہ دم پیالہ تھے مگر فراق جوش کو اپنا حریف سمجھتے تھے۔ جب ہوٹل کے کمرے میں کئی دفعہ ہو گئے تو پینے والوں کے دل کھل گئے اور دونوں کے ساتھ زبانیں بھی کھل گئیں۔ جوش اور فراق میں چلتی شروع ہوئی، پہلے مذاق ہی مذاق میں

پھر نشہ زدہ بخندگی کے ساتھ۔ حاضرین میں سے کچھ جوش کے ساتھ ہو گئے اور کچھ فراق کے ساتھ۔ فراق کچھ حد سے آگے ہی نکل گئے۔ نوبت تیزم تازی اور گالی ملو ج تک پہنچی۔ اس میں ذرا کمی آتی تو تاثیر کبھی جوش کو شہ دیتا اور کبھی فراق کو۔ فراق ایسے بے قابو ہوئے کہ ماں بہن کی گالیوں پر اُتر آئے۔ جوش نے ان گالیوں کو بھی کوڑا گھونٹ بنا کر خلق سے نیچے اتار دیا مگر جب فراق نے بیٹی کی گالی دی تو جوش کے تیر ہو گئے۔ بولے: "ہم پٹھان ہیں، اب ہم آپ کو قتل کر دیں گے۔" یہ کہہ کر اٹھنے لگے تو سب نے بڑھ کر ان کو پکڑ لیا اور معاملہ رونق دے دیا۔ اس سارے قیصے میں تاثیر کے چہرے پر جزا بات کی خوشی تھی وہ دیکھنے کی چیز تھی۔

جوش صاحب اور علی اختر مرحوم کا کسی بات پر اختلاف ہوا۔ دونوں میں بڑی دوستی تھی۔ کوئی بڑی ہیروہ بات ہوئی ہوگی جوش صاحب کی طرف سے۔ جو علی اختر جیسے سادہ دم کے آدمی کو ناگوار گزری۔ اس زمانے میں نیاز فتح پوری بھی حیدر آباد پہنچے ہوئے تھے۔ ان کے مراسم دونوں شاعروں سے تھے۔ علی اختر تو بیچارے خاموش ہو گئے مگر نیاز صاحب نے عکس کیا کہ انہیں جوش سے بدلہ لینا چاہیے چنانچہ لکھنؤ واپس پہنچ کر نیاز صاحب نے نگار میں کلام جوش پر تنقید لکھنے کا سلسلہ جاری کر دیا۔ جوش نے بڑی عقلندی کا ثبوت دیا کہ یکسر خاموشی اختیار کی۔ نیاز صاحب بک جھک کر خود ہی خاموش ہو رہے۔ جس نوعیت کی تنقید نیاز صاحب لکھتے ہیں اس سے خود اپنی ملی قومیت جتنا مقصود ہوتا ہے مگر پڑھنے والا بھانپ جاتا ہے کہ اس میں جو کچھ تو بہت ہوتی ہے خلوص مطلق نہیں ہوتا۔ اس مصرع میں "دب رہی ہے۔ یہ مصرع چُمت نہیں ہے۔ پہلے مصرع کا دوسرا مصرع سے ربط نہیں ہے۔ اس میں تازہ ہے۔ اگر یہ مصرع یوں ہوتا تو بہتر تھا۔" اس کے بعد وہ اپنی اصلاح پیش کر دیتے ہیں اور شرکا اٹھا روپ بھی کھودیتے ہیں۔ حال ہی میں انہوں نے "نگار" کا "جگر نمبر" شائع کیا ہے۔ اُن کا

انداز تنقید ملاحظہ فرمایا جائے۔

کرنل اشرف الحق بڑے جہاں دیدہ اور گرم و سرور زمانہ چشیدہ آدمی تھے۔ اوپر سے بالکل ٹھنڈے اور اندر لاد اکھوتا دھات تھا۔ دو چار ہی باتوں میں تازہ جاتے تھے کہ کون کتنے پانی میں ہے، در نہ آڑ مانے کے لئے کوئی اشتعلہ چھوڑ دیتے تھے۔ دکن میں کامٹینس رکھنے کا عام رواج تھا۔ یہ بیچ قوم کی جوان عورتیں ہوتی ہیں جو عموماً اوپر کے کام کئے رکھی جاتی ہیں۔ ایسی ہی ایک سنگب اسود کی ترش ہوئی جوان کامٹینس یٹا ڈاکٹر اشرف کے ہاں ملازم تھی۔ راوی نے بیان کیا کہ ایک شام کو آواز دینے پر یٹا دو گھاس اندر سے بنوا کر لائی۔ جوش صاحب اس کالی پری کو دیکھ کر دھچکتے ہی رہ گئے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا: دیکھتے کیا ہو، اوپر لے جاؤ۔ بس اتنا کہنا کافی تھا، آگے تڑپی میں۔ لگے ایک طرف لے جا کر انتفات کرنے۔ اس نے جھڑک دیا۔ نالام واپس آئے تو ڈاکٹر صاحب نے کہا: سنو جوش، بیوی میری بھی جوان ہے۔ تمہارا کیا اعتبار، کل کو تم اس پر بھی ہاتھ ڈال دو گے۔ لہذا آج سے یہ سلسلہ بند۔ جوش پر گھڑوں پانی پر گیا اور شرمندگی میں انہوں نے واقعی گونگندہ آنا جانا چھوڑ دیا۔ ڈاکٹر صاحب ہی جوش کے پاس پہنچ جایا کرتے تھے۔

دلی میں ایک جید عالم ہیں مولانا عبدالسلام۔ قلندر مزاج اور یونان قدیم کے رواقی فلسفیوں جیسے آدمی ہیں۔ عربی، فارسی اور اردو کے منشی ہیں جس علم سے کہو خدا کے وجود کو ثابت کر دیتے ہیں۔ اُن کا سکوت پہاڑوں کا سکوت اور گفتگو دیباؤں کی روانی ہے۔ اب تو اسی سے اُونچے ہوں گے۔ جوش صاحب جب دلی آئے تو اُن کی تعریف سن کر اُن سے ملنے گئے۔ مولانا نے جب جوش صاحب کے خیالات سنے تو اُن کا ناریل چٹھا۔ بولے: تمہارا دماغ تو شیطان کی گھڑی ہے۔ اس سے مختصر اور جامع تجزیہ جوش صاحب کا نہیں ہو سکتا۔

جوش صاحب کنڑ کانگریسی تھے۔ مٹلماؤں سے انہیں کیا ملتا؟ مسلمان ان کے لحدانہ اندگستاخانہ خیالات کی وجہ سے انہیں بُرا سمجھتے تھے، لہذا یہ ہندوؤں سے جا ملے تھے۔ پنڈت جواہر لال نہرو اور مسز سروجنی نائیڈو جیسے ادب دوستوں نے اُن کی سرپرستی قبول کر لی تھی۔ ایسے رکابیر مذہب والوں کا کوئی کردار تو ہوتا ہی نہیں۔ جہاں دیکھتا تو اپرات، وہیں گزاری ساری رات۔ کردار تھا یگانہ کا کہ بھوکوں مرا، ذلت و غماری اٹھائی، اندر مرنے مر گیا مگر اپنی بات پر اڑا رہا۔ جوش نے ہمیشہ اپنے ترنولے کی خیر منائی۔ جوشخص خدا کا مذاق اٹھا سکتا ہے اور ابلیس و ابوجہل کی عظمت کی قسم کھا سکتا ہے۔ اس کے لئے پاکستان اور قائد عظم کو بُرا بھلا کہنا کیا مشکل ہے۔ جوشخص ازراہ قوت و تہذیب نہیں بلکہ نہایت سنجیدگی سے ایسی باتیں کرتا ہوتا ہے اس کے لئے مسلمان کیا اور پاکستان کیا! ڈٹ کر پاکستان کی مخالفت کی اور قیام پاکستان کے بعد ہندوستان ہی میں رہ گئے۔ ہندو پرستی کا یہ عالم رہا کہ گاندھی جی کے ہلاک ہونے پر جوش صاحب نے اپنی نظم شہید عظم لکھی۔ ہر چند کہ جوش صاحب کے گزشتہ اعمال اس لائق تھے کہ انہیں پاکستان بدر کر دیا جاتا تاہم پاکستان کی حکومت اور پاکستان کے عوام نے وسیع قلبی سے کام لے کر انہیں امان دی اور ترقی اور دودھ میں سولہ سو روپے ماہانہ پر لغت نویسی کے کام پر انہیں لگا دیا۔ جوش اور لغت نویسی! ماردوں گھٹنا پھوٹے آئینے! یہی وہ زمانہ تھا کہ موصوف نے ایک طویل نظم چنا جہد گرم لکھی جس میں پاکستان کی بھٹی اڑائی اور جسے وہ بڑے طعراق سے اپنے مخصوص حلقوں میں سناتے پھرتے تھے بے فی اور پاکستان دشمنی کے باوجود اور حکومت ہند کی سرپرستی کے باوجود جوش صاحب ہندوستان میں نہیں رہ سکے اور پاکستان آگئے۔ خبر نہیں ان کی غیرت نے اسے کیسے قبول کر لیا بے دینی کا داغ چھپانے کے انہوں نے مرثیہ کہنے شروع کئے اور پاکستان دوستی کے اظہار کیلئے صدر ایوب کی

کی شان میں ایک نامحاذ قصیدہ کہا جوتیوں سمیت انھوں میں گھسنا اس کہتے ہیں۔

پاکستان بن جانے کے بعد جو مسلمان ہندوستان میں رہ گئے تھے ان کی وفاداری کو ہمیشہ مشہد کی نظر سے حکومت ہند نے دیکھا۔ یہاں تک کہ ابوالکلام آزاد کے بعض بیانات پر پٹیل نے انہیں بھی مطعون کیا۔ مگر جوش صاحب کی وفاداری کسی کو مشتتبہ نظر نہ آئی۔ پنڈت نہرو و مروت کے آدمی ہیں، انہوں نے ان کے حلوے ماندے کا انتظام کر دیا۔ تقریباً دو ہزار روپے ماہانہ کی انہیں یافت کرا دی گئی۔ کام کچھ نہیں، صرف نگرانی اور مشورہ۔ حکومت ہند نے انہیں پدم بھوشن کے اعلیٰ خطاب سے بھی نوازا دیا۔ دس سال تک جوش صاحب ہندوستان میں خوب موج مارتے رہے۔ لیکن ہندو ایک مسلمان کو چھ حالات میں دیکھنا بھلا کیسے پسند کر سکتے تھے۔ تاک میں لگے رہتے۔ اور ان کی ذرا ذرا سی بات کی گرفت کرتے۔ جوش صاحب ایک خیر غماخ آدمی، قدم قدم پر ان سے لغزش ہوتی، خیف الہرکتی اور بعض غلط باتیں بھی کرتے۔ یار لوگ بڑا چڑھا کر اوپر کے حلقوں میں پہنچاتے اور وزیر غلظت کے کان بھرتے پنڈت جی طرح سے جاتے۔ مگر چشم پریش کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ سنا ہے کہ جوش صاحب کی ساکھ اتنی بزرگائی کہ ہندوستان میں ان کا مزید قیام خطرے میں پڑ گیا۔ جب دلی کی نضا ان کے لئے ضرورت سے زیادہ گرم ہو گئی تو انہوں نے پاکستان کا رخ کیا۔ یہاں آکر کراچی کے چیت کشر نقوی سے ملے اور ان کے ذریعہ صدر سکندر مرزا سے۔ و صاحب! یہاں کوئی چار ہزار روپے ماہانہ کا ان کے لئے انتظام ہو گیا۔ یہاں کا معاملہ ٹپا کر کے موصوف پھر دلی پہنچے اور سنا ہے کہ پاکستان کی پیشکش دکھا کر پنڈت جی سے پھر معاملت کرنی چاہی۔ مگر وہاں سے جواب مل گیا کہ آپ کا پاکستان چلا جانا ہی بہتر ہے۔ چنانچہ اردو ہندی اور لپے بچوں کے مستقبل پر ایک بیان دے کر جوش صاحب کراچی چلے گئے۔ ادھر اخبار داروں کو سن گئے مل گئی کہ نقوی صاحب نے جوش پروردی کے لئے کیا کیا اسباب ٹھیلے ہیں۔ اردو اخباروں میں

نے شروع ہو گئی اور جوش صاحب از ان سوراندہ و از بس سوراندہ کی زندہ مثال بن کر رہ گئے۔ چار ہزار روپے ماہوار کا سہانا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہوا۔

اپنے موجودہ حالات سے جوش صاحب سخت نامطمئن و ناخوش ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ مجھ پر پندرہ بیس افراد خاندان کا بار ہے۔ اپنی اولاد کے علاوہ اولاد کی اولاد کے بھی جوش صاحب ہی کفیل ہیں۔ بیہوشی تیا ہی بیٹی اور داماد بھی انہی کے سر میں سنبھے کہ داماد صاحب بی۔ اے بی۔ بی۔ بی۔ اسکول کی ملازمت کو بہت گھٹیا چیز تصور کرتے ہیں۔ حضرت جوش صاحب کا داماد اسکول ماسٹری! دنیا کیا کہے گی! لہذا منع بیوی اور جوان جوان بچوں کے جوش کے گھر میں ہاتھ پاتھ دھرے بیٹھے ہیں اور شاعر انقلاب کی عزت و ابرو کی حفاظت کر رہے ہیں۔ جوش صاحب ستر کے پیٹے میں ہیں۔ اتنی عمر اور اتنی دنیا دیکھنے کے بعد بھی ان کے مزاج کا بھولپن نہیں گیا۔

بھوپن پور ان کے مزاج کا ایک اور پہلو یاد آ گیا۔ اپنی شاعری کی بدولت جوش صاحب ہمیشہ سے حاکم رس رہے ہیں۔ اہل غرض انہیں گھیرے رہتے ہیں۔ سنی سفارش کرنے میں ذرا بھی چرچہ نہیں کرتے۔ سفارش بیشتر نالائقوں ہی کی کی جاتی ہے۔ جوش صاحب نے کسی بڑے آدمی سے کسی کی سفارش کی اور اس کی تعریف کے پل بھی باندھ دیئے۔ بڑے آدمی نے کہا "مگر جوش صاحب! یہ صاحب تو اس جگہ کے لئے موزوں نہیں ہیں۔"

بی اور کیا بالکل ناموزوں ہیں۔

"تو اس صورت میں یہ جگہ تو انہیں نہیں دی جاسکتی۔"

چلیے ٹھٹھی ہوئی۔ امیدوار سے کہہ دیا کہ صاحب آپ تو اس جگہ کیلئے قطعی ناموزوں ہیں۔

اس نے داد دیا مچا یا کہ حضرت مجھ سے زیادہ موزوں تو کوئی اور ہے ہی نہیں۔

یقیناً آپ سے زیادہ موزوں کوئی اور کیسے ہو سکتا ہے۔

صاحب یہ بڑا متعجب افسر ہے۔

جی ہاں۔ میرا بھی یہی اندازہ ہے۔ سخت متعصب ہے کم بخت؛

غالباً جوش صاحب سب کو خوش کرنے کی کوشش کرتے ہیں اس لئے ان کی گفتگو ہمیشہ اثنائی ہوتی ہے۔ اسے آپ چاہیں تو ان کا بھولپن کہہ لیں، چاہے یہ کہہ لیں کہ جوش صاحب بے پندیدی کے بدھے ہیں۔

اسی سے ملا جلا واقعہ گلڈ کے قیام کے وقت پیش آیا۔ جمیل جالبی صاحب سے جوش صاحب کا خاصہ ربط مضبوط ہے۔ طے پایا کہ جمیل صاحب جا کر جوش صاحب کو گلڈ کے پہلے اجلاس میں شرکت کی دعوت دیں۔ جمیل صاحب نے مجھے بھی ساتھ لے لیا۔ ڈرگ روڈ میں اُن کی کوٹھی پر پہنچ کر کچا لنگ پیٹا تو ایک ادھیر عمر کے صاحب تشریف لائے اور بے آہا، میں اطلاع کرتا ہوں: جمیل صاحب نے بتایا کہ یہی وہ جوش صاحب کے معروف داماد ہیں جو کچھ نہیں کرتے۔ تھوڑی دیر میں لوٹ کے آئے اور بے چلے جلیے۔ مکے میں جوش صاحب براجمان تھے اور ان کے چند ہوا خواہ انہیں گھرے ہوئے تھے۔ جمیل صاحب نے گلڈ کی مختصر روداد سنائی اور جوش صاحب سے شرکت کی استدعا کی۔ بے ضرور، ضرور، مگر آپ اگر مجھے جائیں: جمیل صاحب نے کہا۔ میں خود اگر آپ کو لے جاؤں گا۔ معذرت مقررہ پر جب جمیل صاحب انہیں لینے گئے تو بے نیل مرام واپس آئے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ جو لوگ انہیں گھرے رہتے ہیں انہوں نے جوش صاحب کو یہ کہہ کر شکا دیاکہ گلڈ کی طرف سے آپ کو کوئی عہدہ تو پیش ہی نہیں کیا گیا۔ اس صورت میں آپ کا جانا مناسب نہیں۔ دوسرے دن ایکشن ہونے والا تھا۔ اس میں پانچ چھ سوادیب اور شاعر عہدیداروں اور مجلس عاملہ وغیرہ کا انتخاب کرنے والے تھے۔ گھر بیٹھے جوش صاحب کو عہدہ کن دے جانا؟ چنانچہ کچھ تک جوش صاحب گلڈ کے ممبر نہیں بنے اور اُن کے دل میں یہی سوال ہوتی ہے کہ انہیں گلڈ میں کوئی بڑا عہدہ ملا چلیے۔ گریا گلڈ میں ہمدوں کی خیرات بہت رہی ہے جس کی تقسیم ان کے گھر سے شروع ہونی چاہیے۔

بہت سی خرابیاں ہیں جوش صاحب میں۔ خرابیاں سب میں ہوتی ہیں کسی میں کم کسی میں زیادہ۔ مگر اپنی تمام خرابیوں کے باوجود جوش ایک مقام طبعی شخصیت کے مالک ہیں۔ اُن سے طبیعت متغیر نہیں ہوتی۔ اُن سے محبت کرنے کو جی چاہتا ہے۔ شعرا تو اُن کے جواب ہی نہیں دے سکتے۔ شاعروں میں جب وہ پڑھتے ہیں تو سب کے چراغ گل ہو جاتے ہیں۔ باتیں بھی بھولی بھولی اور مزے دار کرتے ہیں۔ بس۔ وہ کہیں اور سنا کرے کوئی۔ ایک پٹا ہوا مفلس شاعر پاکستان میں اُن سے پٹ گیا۔ کبھی حیدر آباد میں ان کی جان کو نکار دیا تھا۔ کچھ عرصہ ہوا اچانک اس کا انتقال ہو گیا۔ اللہ اس کی روح کو نہ شرما سکے بڑا ہی بے عزت تھا۔ جوش صاحب نے اس کا نام ہی کتا رکھ دیا تھا۔ سنٹرل ہوٹل میں جوش صاحب کو کسی نے غصہ نہ دیا۔ غصہ نہ ختم ہوا، جوش صاحب نے اپنا کلام سنانا شروع کیا کہ مرحوم سپر پٹر کتا آپہنچا۔ جوش صاحب نے میزبان سے کہا: دیکھو، وہ کتا آیا ہے! اُسے کچھ کھانے کو دو۔ کتے نے خوب سیر ہو کر کھایا اور داد دینے آ بیٹھا۔ مرحوم ہر فن مولا تھا، نثر بھی لکھتا تھا، شعر بھی کہتا تھا، مزید کی تعریف میں ایک پوری کتاب بھی اس نے لکھی تھی جسے چھاپنے کے لئے اسے کوئی پبلشر نہیں ملا تھا۔ گانے بجانے میں بھی کچھ دخل تھا۔ کھانے بھی پکا لیتا تھا۔ ایک دفعہ جوش صاحب سے بولا۔

”ٹھیک تو کبھی میں آپ کو پکا کر کھلاؤں گا۔ آپ انگلیاں ہی چلے رہے ہیں گے؟“

”ارے بھئی تو کھلاؤ نا کسی دن!“

”کل ہی لیجئے۔“

اگلے دن وہ ٹھیک پکا کر لے گیا۔ اچھی پکانی تھی، مگر چلنے وقت پتلی کے ساتھ سولہ روپے کچھ آنے بھی لاگت کے جوش صاحب لے گیا۔

جوش صاحب جس گھن گرج کے شعر کہتے ہیں پڑھتے ہی اسی گھن گرج سے ہیں۔ لہذا ذہن صبح کو باقاعدگی سے شعر کہتے ہیں۔ شائقین اُن کا کلام سننے کے لئے بے تاب رہتے

ہیں۔ آج تک کوئی پچھپسا شعرا کا نہیں سنا۔ سابق چیف کشر نقوی نے سابق صدر سکندر مرزا کو یاد کر دیا تھا کہ جوش اردو کا سب سے بڑا شاعر ہے، یہ لطیف حکومت کے ایک بڑے عہدیدار نے سنا یا کہ کوئی وزیر قلم کا اعتراف پاکستان کیا ہوا تھا۔ ایران صدر میں اسکے اعزاز میں ڈنر تھا۔ معزز مہمانوں میں جوش صاحب بھی شامل تھے۔ آج کل تو کھڑا کھانا (بوفے) ہڈ تلبے۔ کھاتے بھی جاؤ اور ذرا ٹہل ٹہل کر مہمانوں سے باتیں بھی کرتے جاؤ۔ معزز مہمان کے ساتھ ٹہلنے ہوئے سکندر مرزا جوش صاحب کے قریب آگئے۔ جوش صاحب کا نام تو انہیں یاد نہ آیا تعارف کرتے ہوئے بولے۔

"MEET THE GREATEST POET OF URDU"

رو بھی ایک ہی بوجھ جھک کر تھا۔ اٹھ بڑھا کر بولا۔

"OH I SEE! SO YOU ARE MR. GHALIB."

انجمن دانشوران اور کے صدر جناب عبدالخالق عبدالرزاق ایک قابل اور علم دوست آدمی ہیں۔ اصل وطن تو روتی تھا مگر سالہا سال سے کراچی میں رہتے ہیں۔ سگریٹ کنگ کہلاتے ہیں۔ پینے دو پینے میں ان کے ہاں ایک پُر تکلف دعوت ہوتی ہے۔ جس میں پندرہ بیس ممبر اور دو چار اعزازی مہمان شریک ہوتے ہیں۔ اتفاق سے اس انجمن کے تقریباً تمام ممبر جوش خود بھی ہیں (سوائے جناب صدر کے، جو کھاتے کم ہیں مگر کھلا کر زیادہ خوش ہوتے ہیں)، لہذا شیخ صاحب کھانے کا انتظام کرتے ہیں۔ کبھی بریانی اور قرمرہ کی دعوت ہوتی ہے، کبھی ریح کے کباب اور پوریوں کی، کبھی مرغ مسلم کی، اور کبھی آموں کی۔ چاروں میں نہادی اور پالیوں کی دعوت ہوتی ہے۔ کبھی کبھی اس میں جوش صاحب بھی شریک ہوتے ہیں۔ شیخ صاحب ان کے قدردان اور ناز بردار ہیں۔ اسلئے ان کے لئے عمدہ سے عمدہ شراب بھی منگواتے ہیں۔ مغرب کے بعد ہی مہمان جمع ہو جاتے ہیں۔ فضلی، ماہر القادی، محمد تقی، رئیس امر دہوی، جون ایلیا، رازق الخیری، اے بی ظہر

مہربا لکنوی، ممتاز حسین، شان الحق حسنی، الطاف گوہر، مہاجر صاحب اور کئی اور حضرات جی کے نام اس وقت یاد نہیں آ رہے شیخ صاحب کی کوکھی کے کشادہ اور سرسبز محسن میں بیضوی طے میں کرسیاں لگی ہوئی ہیں۔ مہمان آتے جلتے ہیں اور بیٹھے جاتے ہیں۔ ہنسی مذاق کی باتیں ہوتی ہیں۔ جوش صاحب کی میز الگ ایک طرف لگی ہوئی ہے۔ شراب کی بوتل ہے، سوڈا ہے، تھرمس میں برت کی ڈلیاں ہیں۔ دو گلاس ہیں۔ ایک ٹائم پیس بھی میز پر دھری ہوئی ہے۔ کیونکہ جوش صاحب گھڑی رکھ کر پیا کرتے ہیں۔ وقت ختم ہوا شراب کا دور ختم ہوا۔ مجاز موعوم کو بھی جوش صاحب نے نصیحت کی تھی کہ میاں گھڑی رکھ کر پیا کرو۔ اس بلا نوش نے جواب میں کہا تھا کہ "میرا بس چلے تو کھڑا رکھ کر پیوں۔"

جوش صاحب کا ساتھ دینے کے لئے ایک اور صاحب جا بیٹھے ہیں۔ جوش پیتے رہتے ہیں، یہ چسکی لگاتے رہتے ہیں۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ میں جوش صاحب پانچ چھ گلاس پی جاتے ہیں، یہ دوہی میں چھک جاتے ہیں اور جب کھڑے ہوتے ہیں تو ان کی ٹانگیں لڑکھڑانے لگتی ہیں۔ جوش صاحب میں کوئی فرق دکھائی نہیں دیتا کھانے کا وقت ہو گیا۔ بی میز پر کھانا چٹا گیا۔ کھانا کھا نا بھی ہوتا ہے اور کھانا کھا نا بھی۔ جوش صاحب کا کھانا انہی کی میز پر پہنچ گیا۔ ماشاء اللہ خوش خور ہیں بھی تو ستر سال کی عمر میں بھی ٹانٹے بنے ہوئے ہیں۔ سچ ہے ایک ڈاڑھ چلے، مٹر بلاٹے: شیخ صاحب ایک ایک کے پاس جا کر کہتے ہیں "آپ نے یہ تو لیا ہی نہیں: آپ تو کچھ کھا ہی نہیں رہے:" بھائی آپ کیا کر رہے ہیں؟ یہ لیجئے نا: اصرار کر کے سب کو کھلا رہے ہیں۔ شیخ صاحب، آپ بھی تو کچھ لیجئے نا: جی ہاں، میں بھی کھا رہا ہوں: یہ کہہ کر انھوں نے کچھ چینگ لیا اور آگے بڑھ گئے۔ ماہر القادی کھانے کے ساتھ پورا پورا انصاف کرتے ہیں۔ یعنی اتنا کہ اس کے بعد مزید انصاف کرنے کی گنجائش نہیں رہتی۔ اتنے

میں برت میں لگے ہوئے آسم آجاتے ہیں تو مولانا تاسف سے فرماتے ہیں: ارے! یہ تو پہلے بنا دینا چاہیے تھا کہ آسم بھی ہیں: میں نے کہا: یہی تو نقصان ہے مولانا شارٹ ہینڈ میں کھلنے کا! اور صہبائے کتبہ ہیں: قوم کا نقصان کر دیا شیخ صاحب نے: پھر تو آسموں پر دستِ لاری شروع کرتی ہے مگر مولانا ماہر القادی بھی تین دانوں سے زیادہ نہیں کھا سکتے۔ آسموں سے نمٹے نہیں پاتے کہ آسم کریم آجاتی ہے۔ مولانا انس روگی سے کہتے ہیں: مجھے ابھی یہ بھی باقی ہے: اس کے لئے بھی کہیں نہ کہیں گنجائش نکل آتی ہے۔

کھانے سے فارغ ہو کر سب کُرسیوں کے حلقے میں آ بیٹھے ہیں جوش صاحب بھی حلقے میں شامل ہو جاتے ہیں۔ ان کے دائیں ہاتھ سے شرخانی لاکچر چلتا ہے۔ شاعر اپنا اپنا کلام سُنتے ہیں۔ آخر میں جوش صاحب کا نمبر آتا ہے۔ وہ خوب سٹیم بھر چکے ہیں۔ ایک بیاض سامنے رکھ کر شروع ہو جاتے ہیں۔ کس بلا کا کلام ہے! سُنتے دالے پھر پھر پھر کر دوادیتے۔ بیسیوں بند کی طویل نظم ہے مگر اکھرتی نہیں۔ جی یہی چاہتا ہے کہ نظم کبھی ختم نہ ہو۔ اور ماشاء اللہ کتنی جان ہے پڑھنے والے میں، پوری آواز سے پڑھتے گھنٹہ ڈنڈہ گھنٹہ ہو گیا۔ آواز کھر کرائی نک نہیں کیا اس شاعر کا یہی ایک وصف ایسا نہیں کہ اس کے تمام صوبہ کو نظر انداز کر کے بس گلے لگایا جائے!

ظ نازت کبشم کہ ناز نینی

جمیل جالبی

ذرا تصور تو کیجئے — دو کمروں کے ماڈرن کوارٹر میں چوبیس افراد کا گنہہ! سامان کمروں اور برآمدے میں سے اُبل کر باہر نرگ پڑ گیا تھا۔ پاس پڑوس والے مہنتے تھے کہ یہ کباڑیئے کہاں سے آگئے۔ اسی کوارٹر کے برآمدے کے ایک گوشے میں ساقی کا دفتر بھی قائم کر دیا گیا تھا۔ دن بھر تو یہ جگہ دفتر بنی رہتی مگر رات کو اس میں بھی سونے والے پڑ رہتے۔ یہ کوارٹر اس احتیاط سے بنائے گئے تھے ان میں پانی اور بجلی کا گزر نہ ہونے پائے۔ باہر کہیں کہیں تل لگا دیئے گئے تھے کہ پو پھٹنے سے پہلے، اگر کسی کا جی چاہے تو پانی بھرے۔ رات کو روٹی ڈالی والے کے چراغ کی طرح لالٹین جلا کر اپنا جی خوش کر لو۔ مہنتی کی مہنتی، دکھ کا دکھ۔ اتنی شدید آبادی ہونے پر بھی ذرا چیل پہل نہیں بھتی۔ دن بھر جو کاعالم اور شام ہوتے ہی مری پھیل جاتی۔ کسی کو کسی کی خبر نہیں، سب اپنا اپنا آپاٹک رہے تھے۔ دراصل جھپکا ہی ایسا لگا تھا کہ لوگ اب تک اس سے سنبھل نہ سکے تھے۔ بھانت بھانت کا آدمی ہندوستان چھوڑ کر پاکستان چلا آ رہا تھا۔ اسی ریلے میں ہم بھی یہاں گرتے پڑتے پہنچ گئے تھے۔ مگر عجب معاملہ تھا کہ جتنے دوسرے آئے تھے اُن میں کھ پتی سے کم کوئی نہیں تھا۔ حدیہ کہ جنہیں میں اچھی طرح جانتا تھا وہ بھی اپنے آپ کو دلی کے روسا میں سے بتاتے تھے اور تم یہ کہ اپنے قول کی شہادت مجھے دلاتے تھے۔ مجھے سحران سوچتا تو کہتا: جی نہیں، رئیس نہیں، رئیس اعظم!

وہ کھیل جاتے تو میں دلی زبان سے کہتا : دلی میں نفیر تو صحت میں ایک تھا : اس پر ایک
تقبیر پڑتا اور ان کی زمیں ہی میں اڑ جاتی۔ بڑا نطف آ رہا تھا اس نئی زندگی میں۔ ہم نے
اچھا وقت دیکھا تھا نہ کیا بڑا وقت دیکھنے کے لئے کوئی اور آتا ؟ وہ بھی دیکھا یہ بھی
دیکھ۔ ان مینوں کا یہی سیکھ۔ لہذا ہمارا عمل مرتے جائیں ہماریں گائیں پر ہمارا عاشق
کا جنازہ تو ذرا دھوم سے لکھنا چاہئے۔ ہم جس جس کر اپنے نیل اڑتے رہے اور گاکا
کر اپنے غم بھلاتے رہے۔

یہی شب دروز تھے کہ ایک دن دونوں وقت ملتے ایک بڑے زمین سے
نوجوان سامنے آکھڑے ہوئے اور نہایت ادب کے ساتھ انہوں نے سلام کیا۔ میں
نے انہیں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ سر پر سفید کشتی، ٹاٹنی، گول چہرہ، یاسینی رنگ،
کٹادہ پیشانی، غلانی آنکھیں، کٹا راسی ناک، پتلے پتلے گلابی ہونٹ، ٹھوڑی میں
ہلکا سا چاؤ، زخموں، ڈاڑھی موچنے صاف، سفید سلیک کی شیردانی، انکیرا پاچار،
اور پاؤں میں سفید سانہر کی جوتی۔ اس طرح دار نوجوان کو دیکھ کر مجھے اپنی جوانی یاد
آگئی (گو خوب صورتوں میں میرا شمار کبھی نہیں ہوا)۔ میں کو اڑ کے آگے چارپائی بچھائے
بیٹھا تھا ایسے موٹو لہر مجھے شکیں پیر کا ایک فقرہ ضرور یاد آ جاتا تھا۔ میں اپنے
غموں کے ساتھ یہاں بیٹھا ہوا ہوں، بادشاہوں سے کہو کہ یہاں آئیں اور مجھے تعظیم
دیں۔ نہ جانے کیوں مجھے اس فقرے سے بڑی تسلی ہوتی تھی۔ مجھے بالکل شرمندگی
نہیں ہوئی کہ میں گھری چارپائی پر تہمد اور بنیان پہنے بیٹھا ہوں اور ایک نفسی مزاج
ملاقاتی سامنے آکھڑا ہوا ہے۔ میں نے کہا : تشریف لائیے۔ یہیں آجائے میرے پاس۔
میں ذرا اوپر کو کھسک گیا اور وہ بغیر کسی پس و پیش کے اودان پر بیٹھ گئے۔ میرا نام
جیل جانی ہے۔ یہ نام میرا سنا ہوا تھا اور میں نے ان صاحب کا ایک آدھ مضمون
بھی پڑھ رکھا تھا۔ میں نے پوچھا : آپ کا تعلق کچھ مولانا جالب دہلوی سے ہے ؟

ہوئے جی ہاں، وہ میرے دادا تھے۔ تو پھر آپ ذرا آرام سے بیٹھیے اوپر ہو کر۔
آپ سے مفصل باتیں ہوں گی۔ اور پھر بہت دیر تک ان سے دنیا زمانے کی باتیں
ہوتی رہیں، اور مجھے اندازہ ہوا کہ یہ طرح دار نوجوان آج کل کے نوجوانوں کی طرح
کھوکھلا نہیں ہے اور اسکے ظاہر کی طرح اس کا باطن بھی اجلا ہے۔ شرافت نسب
شرافت نفس کی ذمہ داری تھی۔ میرا جالب دہلوی کو اس صدی کا کون اور پڑھا لکھا
آدمی نہیں جانتا ؟ انہوں نے بیسیوں اخباروں کی اڈیٹری کی۔ زندہ انسانیکلو پیڈیا
تھے۔ میرا صاحب سے اگر آپ نے کچھ پوچھ لیا تو سمجھ لیجئے کہ بس جان غضب میں آگئی۔
انہیں یہ خبر نہیں کہ سڑک ہے یا بازار ہے یا چوک ہے، ان کے علم کا دریا بہنے
لگتا۔ اب آپ لاکھ بچھا چھڑائیں میرا صاحب جھار کا کانٹا بن کر آپ کو لپٹے رہیں
گئے۔ یہاں تک کہ جب آپ اپنے گھر کا رخ کرینگے تو یہ بھی آپ کے ساتھ ہوں
گئے اور ان کا گھر جاری رہے گا۔ آپ اپنے گھر پہنچ جائیں گے تو میرا صاحب
ڈیوڑھی ہی میں کھڑے اپنے بے پناہ علم سے آپ کو فیض پہنچاتے رہیں گے۔ یہ
لکچر اُس وقت ختم ہوتا جب میرا صاحب چونک کر دیکھتے کہ ان کا مخاطب روپوش
ہو گیا۔ اور خود کھڑے درو دیوار سے باتیں کر رہے ہیں۔

جیل صاحب پہلے ہی دن اس قدر محبت، خلوص اور عقیدت سے ملے کہ
ان سے اسی دن سے دوستی کی بنیاد پڑ گئی۔ مارٹن کو رٹز کے چھپے پیر ایڈیشن کا لوٹی
کے دو ہزار کو رٹز زیر تعمیر تھے۔ کا لوٹی کا کچھ حصہ بن چکا تھا۔ اسی میں جیل صاحب
اپنے چھوٹے بھائی عقیل صاحب کے ساتھ رہتے تھے۔ ان کے والدین اور چھوٹے
بھائی اُس وقت میری ٹھہری میں تھے۔ یہ دونوں بھائی بغرض تعلیم پہلے چلے آئے
تھے۔ جیل صاحب ایمل۔ اے اور ایل ایل بی میں پڑھ رہے تھے اور ان کے چھوٹے
بھائی ڈاکٹری کے لئے تیاری کر رہے تھے۔ جیل صاحب کو ادبی ذوق دہلے میں ملا

تھا۔ علی اور نقیہ می مضامین لکھنے کا انہیں شوق تھا۔ رفتہ رفتہ ساقی کے کاموں میں میرا ہاتھ بٹانے لگے ہر مہینے ساقی میں باتیں بھی لکھنے لگے۔ میں نے اُن کا نام ادارہ ساقی میں شریک کر لیا تاکہ ان کی خدمت کا اعتراف ہو جائے۔

جمیل صاحب کے والد میرٹھ کے مقبول لوگوں میں سے ہیں جب تک ہندوستان اور پاکستان میں روپے کی اربابری میرٹھ سے دونوں بھائیوں کے اخراجات کے لئے روپیہ آتا رہا۔ جب یہ سلسلہ بند ہو گیا تو جمیل صاحب نے بہادر یار جنگ ہائی اسکول کی مہیڈیا سٹری سبول کر لی۔ اس سے انہیں اتنا مل جاتا تھا کہ دونوں بھائی با فرغت گزر کر لیں۔ ویسے بھی یہ دونوں بھائی بڑی محتاط زندگی بسر کرتے تھے۔ ان کے دوستوں کی تعداد بھی بہت کم تھی، پھر کسی عریب میں نہیں یہاں تک کہ سگریٹ بھی نہیں پیتے تھے۔ کوئی بیہودہ یا مہنگا مشغلہ بھی نہیں تھا۔ ادب کے چمکے نے انہیں بڑائیوں سے بچائے رکھا۔ مگر ادیبوں اور شاعروں کو اب بھی دیکھا ہے کہ دنیا جہان کے اُن میں عریب آجاتے ہیں۔ دراصل یہ ان کی شرارت نہی اور عمدہ تربیت تھی جس نے انہیں بدکرداری سے بچائے رکھا۔ بعد میں جب انکے والدین آگئے تو میں نے دیکھا کہ ماں باپ دونوں صوم و صلوا کے پابند اور بچوں پر کڑی نظر رکھنے والے ہیں۔ درنہ کی وجہ اور خوبصورت نوجوان کے بگڑنے میں کیا دیر لگتی ہے، خصوصاً جبکہ پیسہ بھی ہاتھ میں ہو۔ مجھے دوسرے ذرائع سے معلوم ہوتا رہتا تھا کہ کالج کی لڑکیاں جمیل صاحب کے التفات کر رہی ہیں مگر انکی بے التفاتی انہیں زیادہ قریب نہیں ہونے دیتی۔ جمیل صاحب عمر میں میرے لڑکے کی سیال مشہود سے دو ایک سال چھوٹے ہی ہونگے، اس لئے میں اُن سے ایسی بچکی باتوں کا ذکر نہیں کرتا تھا۔ وہ بھی میرا ادب لحاظ اسی طرح کرتے تھے جیسے اپنے کسی بزرگ کا کرنا چاہتے۔ یہ حفظِ مراتب خدا کا شکر ہے کہ اب بھی قائم ہے۔ بلکہ میں بعض اوقات

اپنی رومن اس حد کو قبول جاتا ہوں، جمیل صاحب کبھی نہیں بھولتے۔

جمیل صاحب سے تقریباً روزانہ ملاقات ہوتی تھی۔ اُن کی شخصیت میں کبریاہیت اور ان کی باتوں میں مومنی ہے۔ چھل فریب مکاری اور چالاک ان میں نہیں ہے۔ باتیں بڑی بھولی بھولی کرتے ہیں۔ ایک دن بچپن کے بچکپاتے بولے: "آج ہمارے ہاں کھانا کھا لیجئے" میں نے کہا: "کیا مضائقہ ہے، کھالیں گے"۔ چنانچہ دوپہر کو وہ مجھے لینے آگئے اور میں انکے ساتھ ہولیا۔ پیر کا کوئی میں ان کا کوڑا قریب ہی تھا۔ کوڑا میں سوائے ہن کے ایک دوست کے، جوانی کے ساتھ رہتے تھے اور کوئی نہیں تھا۔ چھوٹے بھائی عقیل کو میں نے پوچھا: معلوم ہوا کہ کالج سے دیر میں آتے ہیں۔ جمیل صاحب نے اپنے ملازم کو آواز دی۔ ایک منٹ میں اُس نے آکر میز لگا دی اور اس پر دسترخوان بچھا دیا۔ نوکر کی وضع قطع دیکھ کر میں چکرایا۔ اٹھا کر چلتا تھا اور خشک کربات کرتا تھا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے جمیل صاحب سے پوچھا: "کیا یہ تیسری جنس کا آدمی ہے؟" انہوں نے کہا: "جی ہاں۔ مگر بڑا وقار دار اور کافی ہے"۔ اتنے میں ٹرے میں رکابیاں اور دو ڈونگے لئے وہ آگیا اور میز پر انہیں رکھ کر ادائے محبوبی سے اٹھلاتا چلا گیا۔ میں نے کہا: "جمیل صاحب اچھا نمونہ پالا ہے آپ نے"۔ جمیل صاحب من کر چپ ہو رہے۔ دسترخوان میں روشیاں پیٹے وہ لپاک چھپاک چلا آ رہا تھا۔ روٹی رکھ کر اُن کے قدموں ٹوٹ گیا۔ ایلو! پھر چلا آ رہا ہے ٹرے میں شیشے کا جگ برف آب سے لبریز، اور تین گلاس نے۔ کٹھا کٹھا مسنے ایک برابر کی میز پر انہیں رکھ دیا اور پھر لپک گیا۔ میں نے کہا: "چھلا دابھا ہوا ہے کجوت"۔ اس کا نام تو آپ تجلی رکھئے: جمیل صاحب کے ساتھ ان کے دوست بھی نہیں پڑے۔ اب کے پھیرے میں وہ ایک طشتری میں ملا قند لایا اور میز پر رکھ کر نوذب کھڑا ہو گیا۔ جمیل صاحب نے کہا: "تم جاؤ۔ ضرورت

ہو گی تو کہا لیں گے : وہ چلا گیا۔ شاید ہم اس کی موجودگی میں بے تکلفی سے باتیں نہیں کر سکتے تھے۔ اس لئے اُسے چلنا کیا۔ جلیل صاحب نے ایک ڈونگا میری طرف بڑاتے ہوئے کہا : بسم اللہ کیجئے : میں نے جو ڈونگے کا سر پوش مٹایا تو پھلی کا بھنا ہوا سالن دکھائی دیا۔ تصویر کی صنعتی کی خوشبو نے اُڑ کر بھوک پر سان رکھ دی۔ دوسرا ڈونگا کھولا تو اس میں ماش کی دال جس پر ہری مرچیں اور پودینہ چھڑکا ہوا اور بریاں کی بوئی پیاز کے سرخ لچھے ! دل سے جلیل صاحب کے لئے دعا نکلی۔ مگر کیا جلیل صاحب دلوں کا حال بھی معلوم کر لیتے ہیں ؟ انہیں یہ کیسے معلوم ہوا کہ پھلی اور ماش کی دال میرا من بھانا کھا جا میں ؟ یا یہ محض حسن اتفاق تھا ؟ یہ بھید آج تک نہیں کھلا۔ خیر ہم نے خوب ڈٹ کر کھایا۔ میں نے پوچھا : یہ کھانا اپنی صاحب نے نہیں — اپنی خاتون نے — اپنی حضرت نے پکایا ہے ؟ جلیل صاحب نے کہا : جی ہاں۔ میں نے کہا : بھی کمال کر دیا۔ ہم نے تو سنا تھا کہ اس جنس کے کسی کام میں بھدرک نہیں ہوتی : وہ بولے : اب آپ خود دیکھ لیجئے۔ پھر گھر کو بھی صاف ستھرا رکھتا ہے۔ رات کو پاؤں بھی دباتا ہے۔ میں نے کہا : واقع میں، مگر کو تو اس نے خپل بنا کر کھلے۔ مگر کیا کہا آپ نے رات کو پاؤں بھی دباتا ہے ؟ جلیل صاحب میرے اشارے کو سمجھ گئے اور ان کا صبیح چہرہ گلابی ہو گیا۔ میں نے اس منہ سے کوٹا لے کے لئے کہا : یہ مخلوق واقعی بڑی خدمت گزار اور وفادار ہوتی ہے۔ پھر بھی آپ اس کی طرف سے ہوشیار رہیں : کھانے سے فارغ ہونے کے بعد ہم باہر برآمدے میں آئے تو دیکھا کہ کبھی صاحب ہاتھ میں ٹوٹا اور صابن لئے اور کندھے پر اجلا تولیہ ڈالے سدھ کھڑے ہیں۔ میں نے اب کے انہیں ذرا غور سے دیکھا۔ تو یہ تو یہ خاصہ کردہ چہرہ تھا اس کا میں نے کہا : گھانا تم نے بہت اچھا پکایا : مسکر کر کہیں نکال دیں۔ ہاتھ دھوئے تولیہ پیش کیا۔ اس کی سلیقہ مندی سے جی بہت خوش ہوا مگر اس سے استکراہ پھر بھی باقی رہا۔ کچھ

عرصہ بعد جلیل صاحب کے ہاں پھر کھانا کھانے کا اتفاق ہوا تو دوسری آدمی نظر آیا۔ پوچھا : وہ کبلی صاحب کہاں ہیں ؟ بولے : وہ ٹھیک نہیں تھا، اُسے ہم نے نکال دیا : جلیل صاحب نے ایم۔ اے اور ایل ایل بی پاس کرنے کے بعد بھی ہڈیاں سڑی جاری رکھی۔ اسکول ورے ان کی اعلیٰ کارکردگی کی وجہ سے انہیں چھوڑ دیا نہیں چاہتے تھے اللہ نے اپنی سادگی میں تعلیمی پر قانع ہو گئے تھے۔ مگر چند بھلے آدمیوں کے کہنے سننے پر اس پر ضامن ہو گئے کہ پی۔ اے۔ ایس کے امتحان میں بیٹھ جائیں۔ غلطی اور ذہنی آدمی کے لئے کوئی راہ بند نہیں ہوتی۔ چنانچہ جلیل صاحب اس سخت امتحان میں بھی کامیاب ہو گئے اور انکم ٹیکس افسر بنا دیئے گئے۔ سرکاری ملازم بن جانے کے بعد ان کا نام ادارہ ساقی میں سے ہٹا دینا پڑا مگر کئی طور پر ان کا تعلق ساقی سے بدستور قائم رہا۔ بلکہ ان کی یہ وضع داری اب تک قائم ہے۔

جلیل صاحب حب اپنے عہدہ پر مامور ہوئے تھے تو میں نے انہیں دوستانہ اور ہزرگانہ نصیحت کی تھی کہ رشوت یا دل آزاری کا پیسہ کبھی نہ لینا۔ بری کائی ہمیشہ رنگ لاتی ہے۔ میں نے ایسے بہت سے تماشے دیکھے تھے۔ وہ قسے سب انہیں سنائے۔ میں اگر انہیں یہ نصیحت نہ کرتا تب بھی ان سے توقع یہی تھی کہ ایسا کوئی غلط اقدام وہ نہیں کریں گے، مگر روپیہ برسی چیز ہے، خصوصاً بڑی مقدار میں جب کسی ناخبرہ کار فوجوان کی دسترس میں ہو۔ خدا کا شکر ہے کہ جلیل صاحب قہر دریا میں نہ نہ ہونے کے باوجود ترو دائمی سے بچے رہے۔ ویسے بھی بچپن کی اچھی تربیت اور خانہ دان کی آسودہ حالی کے باعث ان کی سرپرستی نے انہیں لفریشن سے بچائے رکھا۔ اور جلیل صاحب بڑی ہوشیاری سے اس بہت خواں کو طے کرتے چلے جا رہے ہیں۔ اس عرصہ میں جلیل صاحب کے والدین کراچی آچکے تھے۔ مہندستان میں جلیل صاحب کے والد کی سبیں چلتی تھیں۔ یہاں بھی انہوں نے آکر بسیں چلائے

کا کام شروع کیا۔ پیسے والے ہوتے ہوئے بھی یہ مزدور قسم کے آدمی ہیں۔ اشارہ اللہ
بھرا پڑا خاندان۔ جیل صاحب کی تنخواہ اونٹ کی ڈاڑھ میں زیرہ ہو کر رہ گئی۔ کیا
پتی اور کیا پتی کا شور بہ! سامے خاندان کا خرچ بڑو گوار نے اپنے ذمے لیا۔ پہلے
جیل صاحب کی شادی کئے ہی کی ایک سلیقہ مند لڑکی سے کی۔ اس سے بہت سسی
امیدوار لڑکیوں کے دلوں پر سانپ لوثا۔ خود جیل صاحب بھی دبی دہائی کا می لڑکی کو
آج کل کی تیزیوں پر ترجیح دیتے تھے۔ اپنی شادی سے مطمئن اور خوش ہوئے کچھ عرصہ
بعد ان سے چھوٹی طبہن کی شادی ہوئی۔ پھر اس سے چھوٹی کی شادی ہوئی، ادب
آخر آخر میں عقیل کی شادی ہوئی۔ ڈاکٹر بن جانے کے بعد۔ اب سہل میاں
کو پانچ سال کے لئے اپنے خرچے سے ان کے والد اعلیٰ تعلیم کے لئے امریکہ بھیج
رہے ہیں۔ یہ باتیں میں اس لئے لکھ رہا ہوں کہ آپ کو معلوم ہو جائے اگر والدین سلیقہ مند
ہوں تو اپنی اولاد کو سہارا دے کر کس طرح باعزت زندگی بسر کرنے کی راہ پر لگا دیتے
ہیں۔ نتیجہ یہ کہ عہد میں خاندان تمام آفتاب است۔ لڑکیوں نے بھی اعلیٰ تعلیم پائی مگر انہیں
اس زمانے کی مہانہیں لگی سلیقہ مند ایسی کہ دسوں انگلیاں دسوں چوڑے۔ لڑکوں میں
ایک اکٹم ٹیکس افسر، دو بھرا ڈاکٹر اور تیسرا انجینئر بننے جا رہا ہے۔ مگر اتنے اطاعت گزار
اور حمیزاد کہ میں نے انہیں اپنے باپ سے نظریں ہٹا کر بھی بات کرتے نہیں دیکھا۔
باپ کا تو خیر مرتبہ ایسا ہوتا ہے، اپنے سے بڑوں کا بھی اسی طرح ادب لحاظ کرتے
ہیں۔ کراچی میں ایک ایسے خاندان کو دیکھ کر جی بہت خوش ہوتا ہے اور اب سے
چالیس پچاس سال پہلے کے دلی کے شرفا کے خاندان یاد آجاتے ہیں۔ ہمارے تعلقات
اس خاندان سے رفتہ رفتہ اتنے بڑھ گئے کہ اکثر حضرات سمجھتے ہیں کہ ہم ایک ہی گنبے
کے افراد ہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو میں اس پر فخر کرتا۔

جیل صاحب خالصے بھوئے آدمی ہیں۔ فوراً لوگوں پر اعتماد کر لیتے ہیں اور اکثر

مختار بعد میں غلط ثابت ہوتے ہیں تو انہیں غصہ نہیں آتا، انوس ہوتا ہے اور ان
پر ترس آتا ہے۔ انگریزی کا ایک اخبار نویس میرے پاس ایک دن آیا اور مٹی مٹی
باتیں کر کے چلا گیا۔ گفتگو میں بار بار جیل صاحب کا ذکر اس طرح کرتا جیسے ان سے
اس کے بڑے گہرے تعلقات ہوں۔ میں اس کے رویے سے کٹک گیا تھا کہ یہ کبھی
کڑے دالا اچانک اگر میری تعریف میں کیل مرا جا رہا ہے۔ مجھ پر مضمون کیوں لکھنا
چاہتا ہے اور مجھے سب باغ کیوں دکھا رہا ہے۔ لگے دن وہ چند پڑانے اخباروں کا
میلا سا پلندہ لے کر پھر آگیا اور اپنے چھپے ہوئے مضمون دکھانے لگا۔ ادھر ادھر کی
بانٹنے کے بعد بولا: اچھا اب اجازت دیجئے۔ جب آپ کو فرصت ہو اس نمبر پر مجھے
ٹیلیفون کر لیں، میں انٹرویو کے لئے حاضر ہو جاؤں گا۔ میں اسے دو دن تک
چھوڑنے گیا۔ پلٹ کر ایک دم سے اسنے کہا: ایک دس روپے تو نہیں ہوں گے
آپ کے پاس؟ میں جلدی میں اپنا پرس گھر بھول آیا۔ جیل کے پاس گیا تھا، وہ
گھر پر نہیں تھا۔ میں کل اسی وقت دسے جاؤں گا۔ میں جانتا تھا کہ شخص جھوٹ
بول رہا ہے مگر میں نے ایک لٹے ہی میں فیصلہ کر لیا کہ اگر دس روپے اسے دے کر
اس سے سچا چھوٹ سکتا ہے تو سمجھ کر سستے چھوٹے۔ میں نے دس کا ایک نوٹ
اندھے لاکر دیا۔ اسنے لے کر کہا: بس کل اسی وقت! اور چل دیا۔ لگے دن بھلا
کون آتا تھا۔ تیسرے دن میں نے کہا لاؤ ذرا ٹیلیفون کر کے دیکھیں تو سہی کہ کیا کہتا
ہے۔ دیئے ہوئے نمبر پر ٹیلیفون کیا تو معلوم ہوا کہ ایک بڑے انگریزی اخبار کا دفتر
ہے۔ میں نے ان صاحب کا نام لیا کہ ان کو بلوا دیجئے۔ جواب ملا کہ اس نام کا کوئی
آدمی اس دفتر میں نہیں ہے۔ اخبار کے آڈیٹر سے میری مشناسائی تھی۔ میں نے
ان سے ٹیلی فون ملایا۔ جیسے ہی میں نے ان صاحب کا نام لیا وہ بولے: آپ سے
وہ کچھ لے تو نہیں گیا؟ میں نے کہا: دس روپے لے گیا۔ وہ افسردہ ہو کر بولے

”مدت ہوئی ہم نے اُس شخص کو علیحدہ کر دیا۔ آدمی فریاد ہے مگر ناکارہ۔ اب وہ یہی کرتا پھرتا ہے اور زبردستی ہمارا سب کو بتاتا ہے۔ کئی اور شکایتیں بھی آچکی ہیں۔ اب صبر کیجئے اور آئندہ کبھی اُس شخص کا اعتبار نہ کیجئے جو کہے کہ میں اپنا پرس گھر تبدیل آیا ہوں۔ اگلے دن میں جیل صاحب کو آگاہ کرنے کے لئے اُن کے گھر پہنچا۔ اس کا نام سنئے ہی انہوں نے پوچھا ”آپ سے کچھ تو نہیں گیا؟“ میں نے کہا ”دس روپے۔ مگر آپ ہرشیار رہتے۔ وہ آپ کے پاس بھی پیونچے گا۔“ بولے ”مجھ سے تو وہ پہلے ہی بے جا چکا ہے۔“ میں نے کہا ”پندرہ روپے ہی پٹلی۔ بڑے ہی نہیں، پھر آئے گا۔“ مجھ سے تو وہ کئی بار دس دس پانچ پانچ کر کے لے جا چکا ہے۔ میں نے کہا ”اور آپ دیئے جا رہے ہیں؟“ بولے ”کیا کروں مجھے اُس کی مغفلی پر ترس آتا ہے۔“ کبھی انہیں ترس آتا ہے کبھی انہیں خوف خدا سستا ہے، اور کبھی ان کا جی چاہ جاتا ہے۔ طالب علموں کی فیس اپنے پاس سے دے دیتے ہیں، کتابیں دلوادیتے ہیں، امتحان کی فیس داخل کر دیتے ہیں۔ دوستوں میں سے کسی نے کہا ”جیل صاحب، آپ کا فلاں کام ہو گیا بٹھا لیوائیے۔“ بولے ”چلے۔“ دو چار جتنے بیٹھے ہیں سبکو عبدالحنان کی دکان پر لے کر پہنچ گئے اور بٹھائی اور سلونا کھلا لائے۔ ایک بے تکلف ہم دفتر نے کہا ”اپلی جیت گئے۔ دعوت ہوگی۔ مرغ اور آئس کریم کی۔“ صاحب! بارہ خاص خاص دوستوں کی دعوت ہوگئی۔ سب بٹھے ہوئے مرغ میز پر آگئے۔ اور تھوڑی دیر میں بٹیاں ہی بٹیاں میز پر رہ گئیں۔ کھانے کے ساتھ انصاف کرنے والے بھی تو ایسے ہوں! چار گھان آئس کریم کے بھی پیاروں کے پیٹ میں اتر گئے۔ اور جیل صاحب کھلے جارہے کہ دوستوں کی خوشی پوری ہو رہی ہے۔

بی، اسی ان کی نمائندگی کرتے جب وہ پیرس گئے تھے تو وہاں بھی ایک جگہ ان کا جی چاہ گیا تھا۔ پروفیسر سید علی حسن نے بتایا کہ یہ جیل بھی عجیب آدمی ہے پیرس

میں ہادی حیثیت بہانوں کی محنت، مگر جتنے مندوبین وہاں جمع تھے سب کو اس نے بہانے بہانے شراب پلا دی۔ میں نے پوچھا ”جیل صاحب، بھلا یہ کیا حرکت تھی؟“ بولے ”میرا جی چاہ گیا اُس وقت۔“

جیل صاحب کو سوائے لکھنے پڑھنے کے اور کسی بات کا شوق نہیں ہے۔ ملازمت کی دماغ سوز مصروفیت کے باوجود اتنا وقت ضرور نکال لیتے ہیں کہ اپنا مطالعہ بھی جاری رکھیں اور کچھ لکھ بھی لیں۔ انہوں نے اپنی ایک چھوٹی سی لائبریری بھی بنالی جس میں بعض نایاب کتابیں بھی ہیں۔ اس لائبریری میں وہ جم کر بیٹھتے ہیں اور گھنٹوں لکھنے پڑھنے کا کام کرتے ہیں۔ طبع آزمائی میں بھی لکھتے ہیں اور ترجمہ بھی کرتے ہیں۔ ایڈٹ کے مضامین کا ترجمہ کرنا جوئے شیر کا لانا ہے۔ دنوں کی محنت شاتو کے بعد انہوں نے اس مضمون کو سر کیا اور ایک مجموعہ چھپوا کر ہمارے علی سربراہ میں ایک اچھی کتاب کا اضافہ کیا۔ ایسے مشکل کام دی شخص کر سکتا ہے جو دُعا کا پکا ہو۔ اُردو کے کلاسیکی ادب کا بھی مطالعہ کرنے کے لئے بڑے مبرور سکون کی ضرورت ہوتی ہے۔ جیل صاحب اس کی ضخیم جلدوں کو کبھی دیکھ کی طرح چاہتے رہتے ہیں۔ نساء آزاد کی چار جلدوں کو مع مقدمہ و حواشی کے شائع کرنا چاہتے تھے، مگر اس کے لئے انہیں کوئی پبلشر نہیں ملا۔ منشی سجاد حسین کی نایاب کتاب ”حاجی بنگلہ“ انہوں نے ایڈٹ کر کے چھپوائی ہے۔ اور اب مبینوں سے جعفر زبلی کے کلام کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ اس کے مختلف نسخے ادھر ادھر سے جمع کئے ہیں۔ ہندوستان سے اس کی نقلیں منگوائی ہیں، لندن سے ایک مستند نسخے کا مائیکروفلم بھی منگوا لیا ہے۔ مجھے تو انہیں اس کام میں مہلک دیکھ کر وحشت ہوتی ہے۔ مگر یہ اللہ کا ہندہ اس خضوع و خشوع سے اس کام کو کر رہا ہے کہ اگر کوئی دینی کام اسی اہتمام سے کرتا تو اب تک کئی دنہ کھڑا اور پڑا حنیت میں چلا گیا ہوتا۔ دراصل ایسے بے عرض کام کرنے والوں کو کسی علی و ادبی ادارہ سے منسلک ہونا

چاہئے تھا۔ مگر یہاں تو مولوی عبدالحق مرحوم ہی کو کسی نے نہ پوچھا، کسی اور کا تو ذکر ہی کیا۔
 جمیل صاحب کے ادبی کارناموں میں "نیا دور" کا اجر بھی ہے۔ جب "نیا دور" جاری ہوا تو جمیل صاحب نے مجھے بھی مضمون لکھنے کی فرمائش کی۔ میں اس کے پیش رو میں بھی لکھا کرتا تھا اور دلی کے منادات پر میرا طویل مضمون (جو مجھے بعد میں شیریں صاحب نے بتایا کہ رپورٹاژ ہے) "دلی کی مینا" اسی کے منادات نمبر میں شائع ہوا تھا۔ نقوش کے شخصیت نمبر میں طفیل صاحب کی فرمائش پر میں نے مرزا عظیم بیگ چغتائی مرحوم کا خاکہ لکھا تھا۔ اور اسی خاص نمبر میں چند اور مستشرقان کے بھی لکھے تھے جس اتفاق سے انہیں قبول عام حاصل ہوا۔ جمیل صاحب کی فرمائش یہ تھی کہ یا تو رپورٹاژ لکھو، یا خاکہ، یا کسی عالمی مشہور کا ترجمہ دو۔ میں کئی دن تک سرگرداں رہا کہ اپنے پیارے دوست کے لئے کیا لکھوں۔ اور ایک دن میں نے بیٹھ کر ان کے لئے خواجہ حسن نظامی کا خاکہ لکھا۔ جمیل صاحب اسے پڑھ کر پھر تک گئے۔ حلقہ ارباب ذوق کی ایک نشست میں مجھے لے جا کر اسے پڑھا دیا۔ اس مضمون کو سننے کے لئے چند خاصان ادب کو بلوا دیا گیا تھا۔ غنیمت ہے کہ سب نے اسے پسند فرمایا۔ پھر اسے "نیا دور" میں شائع کیا تو فرمائشیں آنے لگیں کہ اس سلسلے کے اور مضامین بھی لکھو۔ اسے روشنی طبع تو برن بلاسٹری۔ میں لاکھ کہتا ہوں کہ میں ادیب نہیں ہوں، اڈیٹر ہوں، مگر اڈیٹر ہی کہتے ہیں تم ادیب پہلے اور اڈیٹر بعد میں ہو۔ مجھے مولیٰ کاکا "دربستی کا ڈاکٹر" یاد آیا۔ حق کہیں کئی تو بی بی سی۔ لاؤ آج سے ادیب بن جاؤ۔ چنانچہ بن گئے ادیب۔ مگر اس لفظ کی لاج رکھنی کس قدر مشکل ہے۔

"نیا دور" بڑی آب و تاب سے نکلا۔ میرے مضمون بھی اس میں شامل تھا۔ چند روز بعد اسکے شیخ صاحب آئے اور ایک بند لفاظ مجھے دے گئے۔ میں نے لفاظ کھولا۔ دس دس روپے کے کئی نوٹ نکلتے اور جمیل صاحب کا منگسرا خط تھا۔ کچھ بڑا سا معلوم

ہوا، حالانکہ اکثر پرچے میرے مضمون شائع کرنے کے بعد حسبِ وقت مجھے معاوضہ بھیجتے ہیں اور میں اسے شکریہ کے ساتھ قبول کر لیتا ہوں۔ یہ معلوم جمیل صاحب کی یہ پیشکش مجھے ناگوار کیوں گزری۔ شاید اس وجہ سے کہ وہ ہر بہانے میری خدمت کرتے رہتے ہیں، شاید اس وجہ سے کہ میں ان شہود کی طرح وہ ہمیشہ میرا خیال رکھتے ہیں۔ میں نے اسی وقت انہیں پرچہ لکھا کہ "یقیناً روپیہ دنیا کی بہت بڑی قوت ہے" اور روپے کی کس کو ضرورت نہیں ہوتی؟ لیکن سارے کام روپے ہی کے لئے نہیں کئے جاتے، بعض کام ہر بنائے خلوص کئے جاتے ہیں۔ آپ سے میں معاوضہ قبول نہیں کر سکتا۔ آئندہ اس کی زحمت نہ فرمائیں۔ میں نے لفاظ بند کر کے ان کے منہ پر کڑے دیا۔ بھٹوڑی دیر بعد جمیل صاحب خود حیران پریشان چلے آئے۔ بولے "شاہد بھائی، خدا کی قسم یہ آپ کے مضمون کا معاوضہ نہیں ہے، رو دینا ہی ہے، بھلا میں ایسی گستاخی کر سکتا ہوں؟ میں نے کہا "بھائی میں آخر تمہارے احسانات سے کہاں تک دبتا چلا جاؤ؟ میں اگر روپے پیسے سے تمہاری خدمت نہیں کر سکتا تو کیا قلم سے خدمت کرنے کا موقع بھی مجھے نہیں دینا چاہیے؟" جمیل صاحب آبدیدہ ہو گئے۔ انہیں معلوم تھا کہ میں دلی میں کیا تھا اور یہاں آئیے بعد مجھے کیا بن جانا پڑا۔ بچارے غیب مجھے میں پڑ گئے، گئے تھے نماز پنجشنبہ نے روزے گلے پڑے۔ میں نے کہا "آپ اس کا خیال یا طل نہ کیجئے۔ مضمون میں آپ کے لئے آئندہ بھی لکھتا رہوں گا۔ اب آپ بیٹھیے، چائے پیجیے اور کچھ اور باتیں کیجئے۔ بولے "اس وقت تو معافی چاہتا ہوں، جاننا ہے، پھر کسی وقت حاضر ہوں گا۔" اس کے بعد میرے اداؤں کے درمیان معاوضہ کا ذکر کبھی نہیں آیا۔ مگر جمیل صاحب غیور آدمی ہیں، تاک میں لگے رہے کہ اس کا تدارک آئندہ کس طرح کیا جائے۔ ایک دن آئے تو بولے "بڑی گرمی ہے۔ آپ نے پنکھا نہیں لگوایا؟ میں نے کہا "ہاں، ڈھایا ہی موقع ہوا ہے۔ لگے دن جو میں شام کو گھر واپس آیا تو دیکھا مینا

پنکھا چھت میں لٹکا ہوا ہے۔ بچوں نے بتایا کہ جمیل صاحب نے مسرتی کو بھیجا تھا، وہ لگا گیا ہے۔ اب خفیف ہونے کی میری باری تھی۔ عند المذاقات میں نے کہا حضرت یہ آپ نے کیا کیا؟ بولے اب آپ کچھ نہ کہتے۔ حساب دوستانہ دل۔ جب میری بیوی نے اس عمر میں دن بھر ایک اسکول میں پڑھانے اور زانیہ صحت کے باوجود سیکینڈ ڈیویژن میں ایم۔ اے پاس کیا تو سب کو بہت خوشی ہوئی اور جمیل صاحب کو سب سے زیادہ۔ گھر میں زندہ میلاد شریف ہوا۔ جمیل صاحب کی بیگم، والدہ اور بہنیں بھی آئیں مٹھائی تو کئی خواتین نے کرائیں مگر جمیل صاحب کی بیگم مٹھائی کے علاوہ ٹائیلوں کی ایک پھول دار ساڑھی بھی تحفہ لائے کرائیں۔ میری بیوی نے پوچھا یہ زیر باری کیوں؟ بیگم جمیل نے کہا ”بھائی، آپ کو اندازہ نہیں ہے کہ آپ نے کتنا ناممکن کام کیا ہے جمیل صاحب تو ایک ایک سے آپ کی تعریف کر رہے ہیں۔ آج صبح مجھے اپنے ساتھ المنی لے گئے تھے کہ بھائی کو تحفہ دینے کے لئے ایک ساڑھی پسند کر دو۔ میں نے آپ کے لئے یہ مہندی کا رنگ پسند کیا ہے۔ آپ کو شوخ رنگ پسند نہیں ہیں نا؟ مجھے تو یہ بہت اچھی لگی۔ آپ کو پسند آئی؟“ اور یوں جمیل صاحب کو جب بھی موقع ملتا ہے ہم پر احسان کا دار کرتے جاتے ہیں۔

یادیں بخیر حضرت جو شطرنج آبادی کھانے پینے کے شہساز ہیں۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ صرف پینے کے ہی نہیں کھانے کے بھی مجھے چند بار انہیں کھاتے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ اس معاملے میں وہ قطعی غیر شاعر ہیں۔ جوش صاحب بڑی بے دردی سے کھانے پیتے ہیں۔ جوتابہ کہ ادھر سواری غروب ہوا اور ادھر وہ ساغر بکف طلوع ہوئے۔ دو گھنٹے تک ان کا شغل جاری رہتا ہے۔ مفت خودے تو ساتھ لگے ہی رہتے ہیں مگر یہ اتنے تنگ ظرف ہوتے ہیں کہ ایک ایک دو دو گلاس ہی میں چھک جاتے ہیں۔ جوش بلا نوش ہیں۔ دو گھنٹے میں چار چھ جتنے بھی گلاس ہو جائیں سب چڑھا جاتے ہیں اور ذرا

نہیں بیگتے۔ بلکہ یہی وہ وقت ہوتا ہے جب ان کی گل افشانی گفتار دیکھنے کے لائق ہوتی ہے۔ دو گھنٹے کے اس ریاض کے بعد کھانا طلب کیا جاتا ہے۔ اب آپ ان کے تناؤ دل طعام کی رفتار دیکھئے۔ سر یاں کی چوٹی دار قابض آتی رہیں گی اور غائب ہوتی رہیں گی۔ تو مرد اور شیر بالیں پناہ مانگ جائیں گی۔ آم کی گٹھلیوں کا ڈھیر سامنے لگ جائے گا اور ہمارے کھوپڑیوں کے مینار کی یاد تازہ کر جائے گا۔ جوش صاحب کی اس خوش خوری کو دیکھ کر مجھے بڑی خوشی ہوتی ہے کہ کم از کم ایک شخص تو ہماری برادری میں ایسا ہے جو کھانے کے ساتھ پورا پورا انصاف کر سکتا ہے۔

ہاں تو جوش صاحب نے ایک دن لاؤ میں آکر جمیل صاحب سے کہا کہ ”آپ ہماری دعوت کر دیجئے“ انہوں نے کہا ”بسم اللہ جس دن آپ فرمائیں“ بولے ”مگر دعوت میں کتنی برائی اور بگھارے بیگن ضرور ہوں گے۔ آپ کی بیگم حیدر آباد میں رہ چکی ہیں اور سنا ہے کہ کھانا بہت اچھا پکاتی ہیں۔ بھولا اور تکلف کا آدمی، بیوی کی تعریف مگر خوش ہو گیا۔ دن مقرر ہوا اور وقت مقرر ہوا۔ مجھے بھی دعوت نامہ بھیجا گیا مگر مجھے لاہور جانا تھا، دعوت میں شریک نہیں ہو سکا۔ دایہی جمیل صاحب سے نہیں تو دایہی صاحب سے اس دعوت کی رد واداسکر ٹطف آگیا۔

اے اعجاز الحق تقدی بڑے سنجیدہ اور قابل آدمی ہیں۔ جوش صاحب کے رفیق دیرینہ اور مخلص دوست۔ یہ وہی صاحب ہیں جنہوں نے کوئی ۲۵ سال پہلے ایک مجبورہ چش کی نظموں کا ”سٹار“ کی دتیں چھاپا تھا۔ عربی، فارسی اور اردو کے منتہی ہیں۔ نیک اور صالح بزرگ ہیں۔ پیلوں دلہندہ رکھتے ہیں۔ محض فکر شاعرانہ خوش ذوق ان میں۔ مگر قسمت کے بیٹے ہیں۔ خامہ فرسائی پر گزارہ ہے، اس نے نسلی نے ان کے ہاں ڈیرے ڈال رکھے ہیں۔ مگر افلاس ان کا کچھ نہ بگاڑ سکا کیونکہ حبیب آبادی ہیں۔ جوش ان قادی کی کجائی اجتماع مذہب ہے۔

جیل صاحب نے بڑے اہتمام سے کھانا پکوا یا۔ کچی بریانی اور گجھاے بگینوں کے علاوہ اور بھی بہت کچھ تیار کرایا۔ وقت کی پابندی جیل صاحب نے کبھی کی ہے نہ کرینگے۔ مہمان نو بجے سے آئے شروع ہو گئے۔ جوش صاحب کو دل بچے جا کر لانا تھا جوش صاحب ہمیشہ لائے جاتے ہیں۔ آتے کبھی نہیں۔ ساڑھے دس بجے بیگم جیل نے اطلاع کرائی کہ کھانا تیار ہے۔ جیل اور جوش کے باہمی دوست قدوسی صاحب مبین الحق کی شیوے کے جوش صاحب کے ہاں پہنچنے تو گیارہ بج چکے تھے۔ معلوم ہوا کہ جوش صاحب کھانے سے فارغ ہو کر استراحت فرما رہے ہیں۔ قدوسی صاحب نے کہا: "انہیں اطلاع کر دو کہ جیل صاحب کے ہاں سے قدوسی لینے آیا ہے۔" بھلا جوش شخص کہ گھڑی رکھ کر سائے کام کرتا ہو وہ کیسے کسی تاخیر کو گوارہ کر لیتا؟ قدوسی صاحب نے قدوسی کر لی، جوش صاحب اس سے منہ نہ جوئے۔ کہا کہ بعضی اس بجارے نے بہت عمدہ انتظام کیا ہے اور دس بارہ معتز آدمی آپ کی وجہ سے بلوائے ہیں۔ آپ سب پر پانی پھیرے دے رہے ہیں۔ کچھ تو خیال کیجئے۔ مگر وہ سر ہلا کر یہی کہتے رہے کہ "اب تو ہم کھانا کھا چکے۔ اب ہم نہیں جائیں گے۔" بڑا ناز تھا قدوسی صاحب کو اپنی دوستی پر۔ اور کمال یہ ہے کہ اب بھی ہے۔ وہاں سے ناکام لوٹے تو آئے جیل صاحب پر بھبک پڑے کہ "میاں تم نے دیر کر دی۔ وہ کیسے آسکتے تھے۔ ان کے سونے کا وقت ہو گیا۔"

جیل صاحب کو جوش صاحب کی اصول پرستی سے بہت رنج پہونچا۔ مگر ضبط کر کے بولے: "ہاں دیر تو ہو گئی مگر جوش صاحب کو آجانا چاہئے تھا۔"

جیل صاحب کا اصول یہ ہے کہ وقت کی پابندی نہ کی جائے۔ جوش صاحب کا اصول یہ ہے کہ وقت کی پابندی کی جائے۔ ان اصولوں کی ٹکڑ میں دعوت کا بیڑا غرق ہو گیا۔ مہمانوں نے کھانا زہر مار کیا اور منہ نہ کھائے اپنے اپنے گھروں کو رخصت ہو گئے۔

جیل صاحبی ۲۴۹
مہینہ نمبر
وہ اپنی خود چھوڑیں گئے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں؟
در اہل جوش صاحب کی خود غصے بد ہے جو اپنے جواز میں ہزار بیانیے تلاش کر لیتا ہے۔ در حضرت کا اصول تو یہ ہے کہ ان کا کوئی اصول ہی نہیں ہے۔ جیل صاحب اس واقعہ سے کبیدہ خاطر ہو گئے تھے مگر ایک دن جوش صاحب ان کے دفتر پہونچے لائے اور جیل صاحب کی سادگی دیکھنے کو سب کچھ بھول بیٹھے اور جوش صاحب سے ان کے تعلقات پھر استوار ہو گئے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ زمانے کے بھی اصول بدل گئے ہیں۔

از ہر گال خطا و از خورد حال عطا

جوش صاحب بہانے تلاش کرنے میں یدِ طولی رکھتے ہیں۔ جب گلہ کی بنیاد رکھی گئی اور پہلے چلیے کے لئے کہا دے بھیجے گئے تو یہ طے ہوا کہ چند معتز و معتزات کی خدمت میں حاضر ہو کر ان سے شرکت کا وعدہ لیا جائے اور بطور خاص ان حضرات کا تعارف صدر پاکستان سے کرایا جائے۔ چنانچہ بابائے اردو، پروفیسر زائد محمد سعید، پروفیسر حامد حسن قادری اور جوش صاحب کی خدمت میں ہم فردا فردا گئے اور ان سب نے خوش ہو کر شرکت کا وعدہ فرمایا۔ جلسے کی صبح کو ایک ایک بنیادی رکن ان حضرات کی خدمت میں گیا اور انہیں جلسہ گاہ میں لے آیا۔ جیل صاحب جوش صاحب کو لانے گئے اور منہ نہ کھائے خالی آئے۔ "اسے بھی کیوں نہیں آئے؟"

"جی وہ کہتے ہیں کہ گلہ کا فارم انگریزی میں چھاپا گیا ہے، اس لئے میں شریک نہیں ہوں گا۔"

"کیا انہیں اتنا بھی معلوم نہیں کہ گلہ صرف اردو کا نہیں ہے، پاکستان میں بولی جانے والی تمام زبانوں کا ہے؟"

"جی ہاں معلوم ہے۔ اسکے باوجود۔"

جوش صاحب گلہ کے جلسے میں شریک نہیں ہوئے اور نہ گلہ کے نمبر بنے۔ ہوا

یہ کہ جو لوگ انہیں گھیرے رہتے ہیں انہوں نے انہیں سنا دیا کہ آپ کو تو گلہ میں کوئی بڑا عہدہ ملنا چاہئے معمولی ممبر کی طرح شریک ہونا آپ کی شان کے خلاف ہے۔ یہ بات ان کے گھٹ میں اتر گئی۔ مگر اپنے منہ سے کیسے کہیں کہ مجھے کوئی بڑا عہدہ دو تو جلے میں شریک ہوتا ہوں؟ لہذا بہانہ یہ تلاش کیا کہ انگریزی میں گلہ کے فارم کیوں چھاپے گئے۔ حالانکہ انہیں منہ پھوڑ کر جالبی صاحب سے کہہ دینا چاہئے تھا کہ مجھے کوئی بڑا عہدہ دو۔ آخر وہ بہت سی بیہودہ باتیں وہ دوستوں سے (اور غیروں سے بھی) کہہ دیا کرتے ہیں تو جمیل صاحب انہیں اطمینان دلا دیتے کہ گلہ میں عہدے نہیں بٹ رہے۔ سنا ہے کہ اب وہ اس واقعے کو ٹھیلاتے ہیں۔ کیا میں ان سے پوچھ سکتا ہوں کہ اگر یہ بات نہیں سچ تو آپ آج تک گلہ کے ممبر آخر کیوں نہیں بنے؟

بے ادب بشرط منہ نہ کھلواؤ

جمیل صاحب کا غل *FORGIVE & FORGET* پر ہے۔ میں ان سے خفا ہو کر کہتا ہوں کہ ایسے بے غیرتی کیوں نہ کہا جائے؟ وہ ایک دل آویز مسکراہٹ کے ساتھ کہتے ہیں: ہاں ہے تو ایک طرح کی بے غیرتی ہی۔ مگر میں کیا کروں کہ میرا جی چاہتا ہے۔

”تمہارا جی تو باؤلا ہو گیا ہے۔ ادب کے نقد و احتساب میں تو تم نے نظر پیدا کر لی ادیبوں کو پرکھنا بھی سیکھو۔ یہ کیا کہ ذہنی طور پر نابالغ ادیبوں سے ملے کر بوڑھے دانشوروں تک سب کو ایک لکڑی سے ہانک دیتے ہو۔“

بھولا آدمی پھر اپنے جی کا رونا لے بیٹھا ہے اور اس غریب کو اس کے حال پر چھوڑ دینا چاہیے۔ شاید اس حد سے بڑھی ہوئی شیریں مزاجی ہی کی وجہ سے لوگوں نے انہیں جالبی کے بدلے جلیبی کہنا شروع کر دیا ہے۔ جو شل صاحب کے پرستار خصوصی مولانا قدوسی سے میں نے کہا: جمیل صاحب کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ بولے: وہی جو

جو شل صاحب کی۔

”ان کی رائے کیا ہے؟“

”کل آپ کو جو شل صاحب کا خط دے جاؤں گا۔ دیکھ لیجئے گا۔“

اس خط کا اقتباس یہ ہے۔

”جمیل صاحب جالبی چشمہ دور کیلئے جوان اور طماع انسان ہیں۔

ان کی آنکھوں میں ذہانت کی چمک اور ان کے لبے میں شرافت کی لگک پائی جاتی ہے۔

قدرت نے انکو سخن نبی اور بدلتخی کا جو ہر بھی عطا کیا ہے اور عقل صحیح بات کہنے کی صلاحیت بھی دی ہے۔

ان کی شخصیت میں جاویدیت اور ان کی عقل میں تابانی کا امتزاج یہ کہنے پر مجبور کرتا ہے کہ

خدا کے فضل سے دوست جمال کہلائے

اب اد جاہتے کیا ہو پیمیری مل جائے؟

مرحوم جو شل :-

یہ مرحوم کا سابقہ بھی خوب ہے زندہ شہیدوں کی طرح یہ ”زندہ مرحوم“ ہیں۔ غم سلامت رہو ہر روز کے مرنے والے

خدا کا شکر ہے کہ جمیل صاحب شاعر نہیں ہیں، ابتدائے شعور یا بے شعوری کی عمر میں انہیں شکر کہنے کی لت لگ گئی تھی مگر اللہ نے انہیں جلد عقل دیدی اور شعر گوئی ترک کر کے انہوں نے نثر نگاری کی طرف توجہ کر لی مگر کچھ عرصے سے ان کی نثر نگاری میں ایک خطرناک رجحان آچلا ہے اور یہ رجحان ہے مقدمہ نگاری کا، جو نتیجہ ہے مولانا قدوسی کی دوستی کا۔ قدوسی صاحب تقوٰت کی تدریج کئی جلدوں میں لکھ رہے ہیں۔ تذکرہ صوفیائے سندھ اور

شیخ عبدالقدوس گنگوہی اور اُن کی تعلیمات پر جمیل صاحب نے عالمانہ مقدمے لکھ کر مجھے تو حیرت میں ڈال دیا کہ یہ ادب کا ایک شائستہ طالب علم اور اُردو کا ایک شریف نقاد و تصوف اور صوفیوں میں کہاں جا کر چھپس گیا؟ ان مقدموں کے لکھنے کے لئے اس کو اپنا کتنا خون پانی کرنا پڑا ہوگا؟ جمیل صاحب کو اس نوع کی مقدمہ بازی سے بچنا چاہئے۔ اگر خدا نخواستہ ان کا شمار علماء اسلامانوں میں ہونے لگا تو وہ نہ دین کے رہیں گے اور نہ دُنیا کے۔ مقدمہ بازی تو مولوی عبداللطیف مرحوم ہی پھیلتی تھی، اور اُنہی کے ساتھ ختم ہو گئی۔ صحبتِ ناجنس سے گریزاں رہنے والا کہاں اصفیا اور انقیب میں جا گھسا۔ دکانِ شیشہ گراں میں ساند کا کیا کام؟ نفیس مزاج لوگوں کو ایسی حرکتوں سے باز رہنا چاہئے۔

نفاستِ مزاج پر یاد آ رہا کہ جمیل صاحب کی عجیب نفائس پسندی بعض اوقات ان کے دوستوں کے لئے بڑی صبر آزمائش ثابت ہوتی ہے۔ مثلاً انہیں چاندنی راتیں بہت پسند ہیں۔ جاڑے کی چاندنی راتیں بھی، حالانکہ غریب کی جوانی اور جاڑے کی چاندنی کون دیکھتا ہے؟ جناب دیکھتے ہیں۔ ایک دفعہ مجھے جاڑوں میں چاہر کی چودھویں شب کو سینڈزپٹ اپنے ساتھ لے گئے۔ چاند نے کھیت کیا، تو سمندر میں دُور تک چاندی کے ٹکڑے تیرتے ہوئے بہت اچھے لگے۔ بس دیکھ لیا انہیں۔ اب گھر چلو۔ نہیں خاکوش بیٹھے انہیں نکلے جا رہے ہیں۔ ایک گھنٹہ دو گھنٹے، کوئی حد بھی ہے اس خوش منظری سے نطف اندوز ہو چکی؟ ٹھنڈی جود کے جھونکوں سے تھلی جی جا رہی ہے اور آپ ہیں کہ آنکھیں پھاڑے کبھی چاند کو دیکھتے ہیں اور کبھی سمندر میں کھیرے ہوئے چاند کے ٹکڑوں کو۔ تنگ آ کر میں نے کہا۔ اس سے پہلے کہ آپ ماہِ زدہ ہو جائیں اور *mad as a hatter* کہلائیں آپ کھڑے ہو جائیں۔ بہت لمبا جوتے بولے بس ابھی چلتے ہیں۔ اک ذرا۔ میں نے کہا تو رادوا کچھ نہیں۔ فوراً کھڑے ہو جائیے۔ درمیان میں یہ چلا۔ ٹھنڈی سانس بھر کر اٹھے اور ساتھ سوئے۔ رات کے بارہ بجے گھر پہنچے۔ ایسا ہی ایک واقعہ حیدر آباد سندھ میں پیش آیا ایک ات کو جب چاند چڑھ

گیا تو اللہ کا بندہ ساری رات شہر کے باہر سنان علاقوں میں گھومتا پھرا اور مجھے اس کے ساتھ گھسٹنا پڑا۔ تو یہ کی کر آئندہ کبھی چاندنی رات میں اس شخص کے ساتھ جاؤں گا۔ گلاب کا پھول کبھی کو اچھا لگتا ہے، خصوصاً کراچی میں کر کیا ب ہے۔ ایک نند ایک گلِ فردش سے سُرخ گلاب کا پھول لیا تو اسے چار آنے کا دیا۔ گلاب کا پھول جمیل صاحب کی کمزوری ہے۔ بے اجازت توڑ لینے یا اس کے چمڑ لینے میں بھی مصافحہ نہیں سمجھتے۔ جاڑوں میں جب آپ انہیں سوٹ پہنے دیکھیں گے تو دل کے اوپر گلاب لگا ہوا آپ کو مزور دکھائی دے گا۔ اور اگر کوٹ پہنا اور گلاب مل جائے تو اپنی کار کے امیٹرنگ ہی میں لگائیں گے۔

جمیل صاحب کی خوش اخلاقی بعض صورتوں میں اس حد کو پہنچ جاتی ہے کہ لوگ انہیں شک کی نظروں سے دیکھنے لگتے ہیں خصوصاً خواتین کے باب میں۔ میں نے بھی چند بار ان کے التفاتِ فراوان کو دیکھا ہے اور اس پر انہیں ٹوکا بھی ہے، مگر جمیل صاحب نے گھبرا کر نہایت سادگی سے جواب دیدیا کہ نہیں یہ بات تو نہیں ہے۔ مگر بد بیڑوں یا بد طبیعتوں کا کیا کچھ؟ مارتے کا ہتھ تو پکڑا جاسکتا ہے، کہتے کی زبان نہیں پکڑی جاتی۔ جو لوگ جمیل صاحب کی طبیعت سے واقف نہیں ہیں سمجھتے ہیں کہ عورت جمیل صاحب کی کمزوری ہے اور واقع میں جب کسی خاتون سے مصافحہ پڑتا ہے تو اس سے اس قدر گھل مل کر باتیں کرتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے ریشہ خطی ہو گئے۔ لیکن دراصل ان کا حسنِ اخلاق ہوتا ہے ان کا جذبہ احترام ہوتا ہے۔ اور تو اور متعارف ہو نہ لی خاتون کو کبھی مضابطہ جاتا ہے اور بعض دفعہ جمیل صاحب کی پوزیشن بڑی آگ دردمو جاتی ہے لیہ فقرہ میں نے سچل کی اُردو میں لکھا ہے۔ دراصل کسی غیر خاتون سے بات کرنا سانپ کا کھیلنا ہوتا ہے۔ شیکسپیر کہہ گیا ہے۔ لے عورت تیرا نام کمزوری ہے۔ خدا جانتے اس کی یہ کمزوری کب عود کر آئے۔

چنانچہ عود کر آئی۔ اور یہ واقعہ جمیل صاحب نے خود سنایا کہ گلڈ کے سالاد اجلاس کے سلسلے میں جو چند خواتین مشرقی پاکستان گئی تھیں ان میں سے ایک میا بی تیا بی خاتون نے اٹھا

ان پر مٹ مارا مگر جس اتفاق سے پنج گئے اور اُسے الٹی مٹ کی کھائی پڑی۔ ہوا یہ کہ گھٹ کے اجلاس ختم ہو جانے کے بعد مہاذوں کی ٹولیاں بنا کر مشرقی پاکستان کی سیر کرائی گئی اور چونکہ جمیل صاحب گھٹ کے ایک نہایت ذمہ دار رکن ہیں بلکہ گھٹ کے بنانے والوں میں سے ہیں اس لئے انہیں چند اور اداہیوں کے ساتھ خواتین کی ٹولی میں شریک کر دیا گیا۔ ریل کی نہایت خوش منظر علاقے سے گزرتی تھی، جمیل صاحب نے اپنے سامنے بیٹھی ہوئی ایک عورتوں سے کہا: "دیکھئے کتنا خوش منظر ہے۔" خاتون نے گھوم کر کھڑکی میں سے باہر جھانکا اور ایک دم سے پلٹ کر کہا: "ہوں، تو آپ میری مکر دیکھنا چاہتے تھے؟ یہ جملہ اس قدر اچانک ہوا کہ جمیل صاحب بھونچکے ہو کر رہ گئے۔ اور جمیل صاحب ہی کیا سائے ہم سفر عورت مرد ہٹا بٹا رہ گئے۔ جمیل صاحب کا چہرہ غصے سے تھما گیا، اگر مقابل کوئی مرد ہوتا تو یقیناً مارتے مارتے وہ اس کا ہر کس نکال دیتے۔ جن لوگوں نے یہ سین دیکھا تھا تاہنا کہ جمیل خون کا سا گھونٹ پی کر رہ گیا اور بڑی بربادی سے بولا: "آپ کی مکر میں کیا رکھا ہے جو میں اسے دیکھوں؟" زخمی سامنہ نے پھر بھین مارا: "آپ لوگ اپنی بیویوں کو ساتھ کیوں نہیں لاتے؟" جمیل نے کہا: "جب آپ اپنے شوہروں کو ساتھ نہیں لاتیں تو ہمیں اپنی بیویوں کو ساتھ لانے کی کیا ضرورت ہے؟" اس پر سب کی طرف سے ایک بلا جلا تمبھہ پڑا اور بات منہ میں اڑ گئی مگر جمیل صاحب کی پھلندا مٹ دیکھئے کہ اس واقعہ کے بعد بھی انہوں نے ان محترمہ کے ساتھ اپنے شائستہ رویہ میں کوئی فرق نہیں آنے دیدار ہل جس شخص کو اپنے بیوی بچوں سے محبت ہوتی ہے وہ ڈونڈاتا نہیں پھرتا۔ اسکول کے زمانے میں کسی انگریزی نثر میں بڑھا تھا کہ ایک ماں اپنے بچے کو یوں نصیحت کر رہی ہے: "بیٹا، اگر دنیا میں کامیاب زندگی بسر کرنا چاہتے ہو تو" نہیں کہنا سیکھو۔ اس کا مجھے بار بار تجربہ ہوتا رہا ہے اور آپ کو بھی تجربہ ہوا ہو گا کہ نہیں کہنا سیکھو۔ مشکل ہے اور ہاں کہنا کس قدر آسان۔ جمیل صاحب نہیں نہیں کہہ سکتے۔ انکے پاس

بسیوں ضرورت مند آتے رہتے ہیں۔ کبھی کسی کو فنی میں جواب نہیں دیتے اور کبھی کسی کا کام کرنے سے انکار نہیں کرتے۔ بہت سوں کا کام اپنی خلاف مری بھی کر دیتے ہیں، بعد میں اس پر متا سفت بھی ہوتے ہیں مگر اُس کا کام کر دیتے ہیں اور یہ بھی ہوتا ہے کہ کام ان کے بس کا نہیں ہوتا مگر اُس سے آخر تک ہاں ہاں کئے جاتے ہیں، اور جب کام نہ ہونے پر اگلا آکر گھڑتا ہے تو جی ہاں جی ہاں کہہ کر اُس کی کر دمی کیسی بھی گوارہ کر لیتے۔ میں نے انکے اس رویہ پر انہیں اکثر ٹوکا ہے مگر ان کی اس ادا میں کوئی فرق نہیں آیا۔ لہذا مجھے ان کی ہاں "مشتبہ نظر آنے لگی۔ سنی سے شوم بھلا جو ثرت دے جواب۔

جمیل صاحب بڑے خلوص سے جھوٹ بولتے ہیں۔ اور جب ان سے باز پرس کی جاتی ہے تو بڑی محبت سے کوئی خوبصورت عذر تراش لیتے ہیں اور ان کے اس بھولپن پر غصے کے بدلے پیارا آجاتا ہے۔ وہ وعدہ کر لیں گے کہ میں کل ٹھیک پانچ بجے آپ کے پاس آؤں گا، مگر اگلے دن وہ سرے سے آنے کے ہی نہیں۔

"اماں کل کہاں رہ گئے تھے؟"

"کیا بتاؤں شاید بھائی — سوتا رہ گیا۔ بیوی سے کہا تھا جگا دینا، وہ بھول گئیں۔"

ع ایسے قاتل کا کیا کرے کوئی

"بھئی سب انتظار ہی کرتے رہے، آپ کھانے پر تشریف ہی نہیں لائے؟"

"ارے! بالکل بھول گیا۔ بس دیکھئے یہ حال ہوتا جا رہا ہے حافظ کا۔"

ع اس سادگی پر کون نہ مر جائے اے خدا؟

جمیل صاحب وقت کی پابندی نہیں کرتے۔ گھنٹہ آدھ گھنٹہ لیٹ ہونا ان کا معمول ہے۔ چنانچہ اب میں ان کے لئے اتنا مار جن رکھتا ہوں۔ اگر مجھے اور انہیں ساتھ جانا ہوتا ہے تو وہ نہایت وثوق سے کہتے ہیں: "میں آج اڈل گا آپ کے پاس۔" میں عرض کرتا ہوں جی نہیں میں آؤں گا آپ کے پاس۔ میں وقت مقررہ سے آدھ گھنٹہ پہلے انکے

گھر پہنچا ہوں، بجلی کی گھنٹی کا بٹن دباتا ہوں۔ وہ آنکھیں ملتے ہوئے آتے ہیں اور میٹک
کو درد ادا دے کھولتے ہیں۔ آئیے، بس ایک منٹ میں تیار ہو کر آتا ہوں۔ پندرہ منٹ
کے بعد برآمد ہو کر کہتے ہیں: ایک پیالی چائے کی پیالی بس چلتے ہیں۔ الیکٹرک ریزر
ہاتھ میں لے چلے آتے ہیں۔ یہیں بیٹھ جاتے ہیں۔ آپ کیلے بیٹھے ہیں کہہ کر ریزر کا پلگ
لگاتے ہیں اور چپکے پاسٹری کی کرنے لگتے ہیں۔ ابھی بہت دیر ہے۔ دیکھ لیجئے گا وہاں
کوئی نہیں آیا ہو گا۔ لوگ وقت کی پابندی ہی نہیں کرتے۔ میں زبردستی کے ساتھ کہتا
ہوں جی ہاں لوگ وقت کی پابندی ہی نہیں کرتے۔ اور خندہ و دماں ہمارے ساتھ آنکے
خساروں پر سینکڑوں نئے نئے سے گڑھے پڑ جاتے ہیں شیو ختم ہو گیا، پلگ لگا لیا اور ریزر
میز پر رکھتے ہوئے بولے: آپ بھی اسی سے شیو کیا کیجئے۔ نہ صابن نہ پانی چاہیے بستر
پر لیٹے لیٹے شیو ہالیں، بس ابھی آیا۔ دس منٹ پھر گزور گئے۔ ملازم نے دو پیالیاں چائے
کی میز لاکر میز پر رکھ دیں۔ پھر سگریٹ کا ڈبہ رکھ گیا۔ بارے جہیل صاحب دھلا ہوا جوڑا
اور شارک اسکن کی دو دھیاں اکٹیں پہنے نمودار ہوئے۔ ہاتھ میں پاؤں کی تھیلی۔ صاف
کیجئے گا، کچھ دیر ہو گئی۔ میں نے کہا کہ جلدی سے ہنار کر پڑے بھی بدل لوں۔ اسے آپ
نے چائے نہیں پی، ٹھنڈی تو نہیں ہو گئی؟ پیالی کو ہاتھ لگا کر نہیں ابھی گرم ہے۔
دیکھ لیجئے گا سب سے پہلے ہم ہی پہنچیں گے۔ پان لیجئے۔ اور یہ سگریٹ دیکھئے کیسا ہے۔
ایک صاحب ترکی سے لائے تھے۔ آئیے چلیں۔ چلئے صاحب۔ ان کی کار میں جا کر بیٹھے۔
اس کار کو چلا کر انہوں نے اس کا پلٹین نکال دیا ہے۔ اس کی گدیاں پھٹ گئی ہیں اور
جگہ جگہ اس میں سہرے بدھیاں لٹکی ہوئی ہیں۔

اماں اس گاڑی کو تو بدلو۔ یہ کیا نیستی لگا رکھی ہے تم نے؟

جی ہاں بدل رہا ہوں۔ چھوٹی کار مل رہی تھی مجھے کوٹے میں۔ میں نے لینے سے
انکار کر دیا۔ فلٹی کی۔ اب بڑی کار دو سال بعد ملے گی۔

جب جلسہ گاہ میں پہنچے تو دیکھا کہ آدھا جلسہ ختم ہو چکا ہے۔
کمال کر دیا ان لوگوں نے! آج سب وقت پر آ گئے۔ اچھا یوں آ گئے ہوں گے
کہ وہاں خصوصی غیر ملکی ہے۔ خیر، آئیے یہیں بیٹھے جلتے ہیں پیچھے۔
مگر ان واقعات کے باوجود میں ان سے اور وہ مجھے غصے غصے میں جس شخص کے ٹھوٹ
نکلیں خلوص ہو اس سے بھلا میں کیسے ناراض ہو سکتا ہوں؟

جہیل صاحب اور آج کل کے دوستوں میں یہ فرق ہے کہ جہیل صاحب میری
برائی نہیں سن سکتے۔ اپنے کسی دوست کی برائی نہیں سن سکتے۔ اکثر حباب ایسے ہیں جو
مجھے کہتے ہیں کہ فلاں شخص آپ کی برائی کر رہا تھا۔ میں کہتا ہوں تو پھر آپ نے کیا کیا؟
کچھ نہیں کیا کرتا؟

تو گویا آپ نے اس کی باتوں پر صاف کر دیا۔

لگے بغلیں جھانکنے۔ معلوم ہو گیا کہ یہ دوست کتنے پانی میں ہیں۔

حال ہی میں جہیل صاحب کے ساتھ بھی ایک ایسا ہی واقعہ پیش آیا۔

ایک بڑے انسر کے داغ میں یہ سہائی کہ گلڈ پر قبضہ کرنا چاہیے۔ چنانچہ اس نے
اپنے ماتحتوں سے کہنا شروع کر دیا کہ یہ شہباز، عالی، جالبی، کیا ہیں؟ کیا گلڈ ان کی
نمائندہ ہے؟

مواخواہوں نے کہا: جی حضور دستیا ہاں کر رکھا ہے انہوں نے۔ اپنے باپ کی جاگیر
بچھ رکھا ہے گلڈ کو۔

ہم کہاں نہ چلائیں گلڈ کو؟

اگر ایسا ہو جائے تو سبحان اللہ۔ گلڈ کے دن پھر جائیں گے۔

بس تو اب کے الیکشن لڑنے کی تیاری کی جائے۔

حکیم حاکم مرگ، مفاہات۔ او صاحب پروپیگنڈا شروع ہو گیا۔ ایک صاحب میرے

پاس بھی تشریف لائے۔ وہ جانتے تھے کہ مجھے بھی گلڈ سے کچھ شکا متیں ہیں۔ مجلس عاملہ کے اجتماعوں میں وہ دیکھ چکے تھے کہ میں کس قدر بد دلحالی کے ساتھ عالی اور جمالی پر اعتراضات کرتا ہوں۔ اسی سے شاید انہیں غلط فہمی ہوئی۔ ہونے ان لوگوں نے گلڈ کو مت ہلی بنالیا ہے۔ فلاں افسر صاحب ہاری رہنمائی فرمائیں گے اور ہارا سا اگر پپ ان کا ساتھ دے گا۔ یہ سکر میڈر ایل چٹ گیا۔ میں نے کہا "دیکھو جی، گلڈ بنانے والوں کے خلاف میں ایک لفظ بھی نہیں سن سکتا۔ یہ تم نے کیا سادش پھیلائی ہے؟ وہ گئے مہتائے افسر، تو انہیں ادب اور ادیبوں سے کیا واسطہ؟ تمہیں شرم نہیں آتی کہ ادیب ہو کر ایک بے ادب کو گلڈ پر مسلط کرنا چاہتے ہو؟ وہ صاحب شرمندہ ہو کر معذرت کرتے ہوئے چلے گئے اور جا کر افسر صاحب کے سارے موتی پر ددیئے۔ اس کے بعد یہ سننے میں آیا کہ ان حضرات نے الیکشن ڈلٹنے کا فیصلہ کر لیا ہے بلکہ الیکشن میں سرے سے شریک ہی نہیں ہوں گے۔ میں نے کہا کاش وہ شریک ہو جاتے تو انہیں اپنی وقعت تو معلوم ہو جاتی۔ بات آئی گئی ہوئی۔ میں بھی اس واقعہ کو قبول کیا۔ چند روز بعد ہوا یہ کہ ایک چھوٹی سی ادبی تقریب میں وہ افسر صاحب اور ان کے ہوا خواہ شریک ہوئے۔ جمیل صاحب بھی وہاں ہائے گئے تھے۔ خبر نہیں کس سلسلے میں میرا ذکر نکال کر افسر صاحب نے کہا "وہ اوروں کو تو کہتے ہیں کہ اس کا ادب میں کنٹری بیوشن کیا ہے، مگر خود شاہد صاحب کا کنٹری بیوشن کیا ہے؟ ماتحتوں کی تو زبانیں کی ہوئی تھیں، بھلا کیسے بولتے، ایک صاحب نے ہتھیا ٹالنے کے لئے کہا "جمیل صاحب کے پوچھے: جمیل صاحب دپے تو ٹھنڈے مزاج کے آدمی ہیں مگر اسوقت تاؤ کھا گئے۔ ہلے جن کے منہ پر آنکلیں نہیں ہوتیں نہیں کچھ دکھائی نہیں دیتا" افسر صاحب نے کہا "پھر بھی۔ آخر ان کا کارنامہ کیا ہے؟" جمیل صاحب بے "جو لوگ اردو پڑھ سکتے ہیں وہ بھی جانتے ہیں کہ شاہد صاحب ۳۳ سال سے ساآی شائع کر رہے ہیں، انہوں نے سینکڑوں ادیب بنا ڈلے۔ آج کا شاہد ہی کوئی ادیب ایسا

موجود ان کا رہیں منت نہ ہو۔

مگر خود انہوں نے کیا لکھا ہے؟

"چالیس کے قریب تو انکی کتابیں اسوقت موجود ہیں۔ پانسو سے زیادہ اگلے مضامین چھپ چکے ہیں۔ اننی چیزیں وہ ریڈیو کیلئے لکھ چکے ہیں۔ ترجمہ کرنے میں خاص مہارت رکھتے ہیں۔ پورے تڑ اور خاک لکھنے میں تو انکا جواب ہی نہیں ہے۔ ان جیسی زبان لکھنے والا اب اور کوئی نہیں ہے۔ صاحب طرز ادیب ہیں۔ اب آپکو معلوم ہوا انکا کنٹری بیوشن کیا ہے؟ اپنی ادبی خدمات اور قابلیت کی وجہ سے مغربی پاکستان اور شرقی پاکستان کے ادبی اجتماعوں میں بلائے جاتے ہیں۔ اور تو اور تھائی لینڈ اور فلپینز میں ثقافت پاکستان پر لکچر دینے کیلئے پورے پاکستان کا شاہد صاحب ہی منتخب کر کے بھیجے گئے تھے۔ پورے پاکستان کے تمام زبانوں کے ادیبوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر دینا اور گلڈ کی خشت اول رکھنا بھی شاہد صاحب ہی کا کارنامہ ہے۔ آپ تو انکی کھپائی اور ٹوٹی جوتی دیکھتے ہیں۔ آپکو وہ بھل کیسے دکھائی دے سکتا؟ جو اس گڈرمی میں ٹھپا ہوا ہے۔

گرد بنید روز شہرہ چشم + چشمہ آفتاب را چہ گند؟

اجتماع بے مزہ ہو گیا۔ صاحب خاند روکتے ہی ہے۔ جمیل صاحب اٹھ کر چلے گئے مگر مجھ سے اس واقعہ کا ذکر جمیل صاحب نے نہیں کیا۔ دو ایک اور حضرات جو اس اجتماع میں شریک تھے انہوں نے مجھے ساری روداد سنائی۔ میں نے کہا جمیل صاحب، حتیٰ اس کو باطن سے اُلجھے۔ یہ تو وہ لوگ ہیں جن کے دلوں پر اور جنکے کانوں پر اور جنکی آنکھوں پر نمبریں لگی ہوئی ہیں۔ مجھے اس واقعہ کو تفصیل سے یوں بیان کرنا پڑا کہ اس سے جمیل صاحب کے کردار کا ایک خاص پہلو اجاگر ہوتا ہے۔

جمیل صاحب اچھے کھانے اور اچھے لباس کے شوقین ہیں۔ وجہ یہ کہ جامہ زیب آدنی ہیں۔ ہر لباس انپر پہتا ہے مزاج میں نفاس ہے جو نگلوں میں شائستگی کی صورت اختیار کرتی ہے۔ میں نے اُنکے منہ سے کئی کئی نہیں سنی جس گفتگو میں حصہ نہیں لینگے۔ بیٹھے جھینپتے رہیں گے۔ آدمی میں آخر کوئی عیب تو ہر دن فرشتے ہی کیا بڑے تھے؟ کبھی شراب نہ پیتا ہو سگریٹ تو پیئے، یہ بھی نہیں۔ ہاں پان البتہ

کھاتے ہیں اور بہت کھاتے ہیں مگر خاص اہتمام سے وہ دبی پان تو خیر میاں ہے یہ نہیں جو اگر
ہاتھ جھوٹ کر دس پر گریے تو چار ٹکڑے ہو جائے ہاں ساکھی اُس سے کچھ ملتا جلتا ہے اسکی
رگیں جھیلی جاتی ہیں مگر میں خوبصورت کی چاندی کی نیاری ہے کتنا کسی خاص طریقے سے پکا یا اور
چھانا جاتا ہے چھنے کی تیزی کم کرنے کیلئے دی کی آمیزش کی جاتی ہے۔ چھایا پڑائی ڈھونڈ کر
لائی جاتی ہے بھائی ایسے سڈول اور باریک کاٹ کر کسے بھرے رکھتی ہیں۔ چھ گھڑا الگ چھوٹا
زردہ اور قوام موجود۔ جہیل صاحب گئے بھر بھر کے زردہ کھاتے ہیں اور قوام چاٹتے رہتے ہیں۔ ڈاکٹر
نے جب سے منع کیا ہے کچھ کم کر دیا ہے۔ پانوں کی ڈبیا پہلے ساتھ رکھتے تھے۔ جب چاروں طرف
سے اس پر یوش مہرنے لگی تو ڈبیا ساتھ رکھنی چھوڑ دی۔ کراچی کے تمام اچھے تمبریوں کی دکانیں
اب نہیں معلوم ہیں۔ لائوس روڈ پر ایک روپے تک کا پان انہوں نے بھی کھلوا دیا ہے۔ مگر وہ پان تھا
الاچی سے لیکر مشک و عنبر تک اس میں موجود تھا اور در و درقی طلا چھیدہ۔ ایک دن راہ چلتے
چلتے انہیں پان کھانے کی حاجت ہو گئی۔ جو پہلا پناوڑی ملا اُس سے دو پان بولے۔ میں نے
جوڑ میں رکھا تو منہ کے ٹکڑے اڑ گئے۔ میں نے گھبرا کر پان والے سے کہا "دو ایک لوئیں تو دو"
جہیل صاحب نے کہا "لوئگ مت کھائیے بہت گرم ہوئی ہے۔ ایک لوئگ کھانا ایسا ہے
جیسے ساٹھ میگن کھائے۔" مجھے اُن کے اس بھولپن پر ہنسی چھوٹی۔ ضبط کر کے بولا "تی الحان
تو میں نے ایک سو ساٹھ میگن کھائے۔" بچارے خفیف ہو کر رہ گئے۔ بھولے آدمی کی
ہے بڑی مشکل!

جہیل صاحب کا تذکرہ حسینوں کی زلفت کی طرح دراز ہوتا چلا جا رہا ہے۔

ع لطیف بود حکایت دراز تر گفتیم

بڑی محبوب شخصیت ہے جہیل صاحب کی۔ جب صورت اور سیرت دونوں میں جمال
ہی جمال ہو تو کیسے مجال دُوری ہو سکتی ہے؟

اللہ جہیل و محبوب الجمال۔

شاہد احمد دہلوی

منزل بادشاہوں کا آفتاب جلال غروب ہو رہا تھا۔ دلی کے ہال قلعہ میں مغلوں
کی آخری شمع جھللا رہی تھی۔ بادشاہ کی حیثیت شاوشر پنج سے زیادہ نہ تھی۔ فرنگیوں سے
ایک لاکھ روپیہ ماہانہ پنشن ملتی تھی، وہ بھی اس شرط پر کہ ان کے بعد تاج تخت کا سلسلہ
ختم ہو جائے گا اور فرنگیوں کا اقتدار قائم ہو جائے گا۔ مگر بھتی مرے پیچھے بھی سوا لاکھ
من کا ہوتا ہے۔ اس مُردہ حالت میں بھی تیموری جاہ و جلال کا ذکر بہت کچھ باقی تھا۔
لال حویلی تہذیب و شائستگی کی علامت سمجھی جاتی تھی، اور شہر بہت کچھ اجڑ جانے پر بھی
علوم و فنون کا گہوارہ بنا ہوا تھا۔ بھانت بھانت سے لوگ کھینچ چلے آتے اور
اپنی مرادیں پاتے۔ شہر آبادی کے یہی شب و روز تھے کہ سات سال کا ایک لڑکا تحصیل علم
کے شوق میں جیسپور سے دلی آیا اور پنجابی کٹرے کی مسجد کے طالب علموں میں شامل
ہو گیا۔ دوسرے طالب علموں کی طرح یہ لڑکا بھی غصے کے گھر دس سے روٹی مانگ لاتا
اور روکھی سوکھی جو بھی میسر آتی خدا کا شکر ادا کر کے کھا لیتا۔ رات کو کرکڑا تے جاڑوں
میں مسجد کی صحنوں میں لپٹ کر سو جاتا۔ اگر کسی دن جلدی آنکھ نہ کھلتی تو مسجد کا ایک لات
رسید کرتا اور لڑکا لٹھکتا ہوا چلا جاتا اور ساتھ کے ساتھ صف بھی کچھ جاتی۔ دن بھر
اور رات گئے تک اس لڑکے کو بس پڑھنے سے کا تھا۔ علم کی لگن میں مبرو شکر سے
تمام سختیوں کو جھیلنا رہا۔ غریب کا بچہ اور کبھی کیا سکتا تھا؛ شوق اور ذہانت کے

پر اُسے اُڑانے لئے چلے گئے۔ مکتب سے نکل کر دلی کالج میں پہنچا اور میاں سے سند لینے کے بعد ترقی کی راہیں اُس پر کھل گئیں۔ بخود سے ہی عرصہ میں ڈپٹی کلکٹری کے عہدے پر جا پہنچا۔ اُس زمانے میں یہ آخری براہ عہدہ تھا جو فرنگی راج میں کسی دیسی آدمی کو مل سکتا تھا۔ اتنے ہی میں سرسالا جنگ نے انہیں جاپان کر حیدر آباد و بٹالیا اور یہ صاحب اپنی اعلیٰ کارکردگی کے باعث اُسے اپنے سے اُنچے مرتبوں تک پہنچنے والے نے عزت بھی دی اور بے تحاشا دولت بھی۔ اخلاقی اور مذہبی کتابیں لکھنے کی وجہ سے نیک نامی اور شہرت بھی ملی۔ آپ کبھی بھی یہ کون بزرگ تھے؟ یہ تھے ڈپٹی نذیر احمد جن کی کتابیں اور ترجمہ قرآن گھر گھر پڑھا جاتا ہے۔

ان ڈپٹی نذیر احمد کے اکھوتے بیٹے تھے بشیر الدین احمد جن کی ابتدائی تعلیم خود شفیق باپ کے سایہ میں ہوئی۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد میاں بشیر بخرن ملازمت دکن چلے گئے اور اوّل تعلقداری سے وظیفہ یاب ہوئے۔ یہ بھی اپنے نامی گرامی والد کی طرح بہت بڑے مُصنّف اور مُورخ تھے۔ ادبی اور اخلاقی کتابوں کے علاوہ دو ضخیم جلدوں میں تاریخ بجا پور اور تین بڑی جلدوں میں تاریخ دہلی لکھی۔ یہ اُن کے دو بڑے تحقیقی کارنامے ہیں۔ جب تک زندہ رہے ان کے ہاتھ سے کبھی قلم نہیں چھوڑا۔

میاں بشیر کی شادی سترہ اٹھارہ سال کی عمر میں دلی کے ایک معزز خاندان میں ہو گئی تھی۔ اللہ کا دیا سب کچھ موجود تھا مگر پندرہ سال تک کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ میاں بیوی تو اس محرومی پر کبھی مطمئن و قانع تھے مگر خاندان میں کٹھن پھر گئی اور دُمنہ جڑنے لگے۔ پھر مولوی نذیر احمد کے کان میں بھی صدائیں پڑنے لگیں۔ پہلی بیوی کی موجودگی میں نکاح ثانی کے وہ خلاف تھے مگر جب چاروں طرف سے اُن پر عزیزوں کا دباؤ پڑا۔ اور انہوں نے خاندان کا چراغ گل ہوتے دیکھا تو وہ بھی پسچ گئے۔ بیٹے اندر ہوں بڑا پیادہ ملا تھا۔ بیٹے سے کیسے کہیں کہ اپنی چیت بیوی پر سوکنے لے؟ میاں بشیر کی والدہ

سے کہا کہ تم سمجھاؤ۔ انہوں نے بیٹے کو چکار چکار کر دُعا مند کیا اور غریب مگر شریف خاندان کی ایک سیدانی سے چُپ چُپاتے اُن کا نکاح پڑھوا دیا۔ اللہ کی شان کہ ان سیدانی سے بھی دس سال تک اولاد نہیں ہوئی۔ بڑی دہن کی جن آئی اندر انہوں نے طعنوں تشنوں سے جانِ صنیق میں کر دی۔ جب معاملہ نزت پر پہنچ گیا تو چھوٹی دہن کی کوکھ ہری ہوئی۔ خاندان کے سُوکھے دھالوں میں پانی پڑ گیا۔ اللہ نے چاند سا بیٹا دیا۔ دونوں اس کی خوشی منائی گئی۔ ڈپٹی صاحب نے پوتے کا نام مندر احمد رکھا۔ اس کے بعد تو خدا کی دین ایسی ہوئی کہ یکے بعد دیگرے تین لڑکے ہوئے۔ سبیلے کا نام بشیر احمد اور سبیلے کا نام شاہد احمد رکھا گیا۔

اب ان سبیلے صاحبزادے میاں شاہد احمد کی مختصر سی سرگزشتِ حیات سنئے اور خود اپنی کی زبانی سنئے۔

میں ۱۶ مئی ۱۹۰۶ء کو دلی میں اپنے آبائی مکان میں پیدا ہوا۔ چار سال کی عمر سے پہلے کی باتوں کا مجھے ہوش نہیں ہے۔ ایک خواب کا سا خیال ہے کہ آبا حیدر آباد سے دلی آتے تو سب سے پہلے میں دادا آبا کی خدمت میں لے جاتے۔ آبا دادا آبا سے بگلیگر ہو کر رونے لگتے اور ہم حیران ہو کر انہیں تکتے رہتے۔ پھر دادا آبا ہمیں ایک ایک انٹرنی دیتے اور ہم چپکے سے دہاں سے کھسک لیتے۔ بس اور کچھ یاد نہیں ہے۔

جب میں چھ سال کا ہوا تو چھوٹی مہین صفیہ حیدر آباد میں پیدا ہوئی۔ اپنی دونوں آبا کو کسی ضروری کام سے دلی جانا پڑا۔ اور ہر آبا دلی روانہ ہوئے اور حراتاں کی طبیعت ایک ایک خراب ہوئی۔ اس کی اطلاع فوراً بذریعہ تارا آبا کو دی گئی۔ وہ اُنٹے قدموں دلی سے نوٹے۔ مگر جب حیدر آباد پہنچے تو آماں کا جنازہ صحن میں رکھا پایا۔ اچھا بچھا چھوڑ کر گئے تھے، یہ کیا ہوا؟ چکر کر گئے، یہ دے مٹنے کے کسی نے پک کر انہیں تھام لیا۔

آبا بڑے صبر و ضبط کے آدمی تھے۔ ۱۰ سو پتے رہے۔ اماں کو سپرد خاک کرنے کے بعد
آٹھ سو دن کا سیلاب ضبط کے بند کو بہا لے گیا اور وہ ہم بچوں کو گلے لگا کر روتے رہے۔
اس سے اُن کے دل کی بھڑاس نکل گئی، مگر ساری عمر جب بھی اُنہیں اماں کا خیال آ جاتا
تھا تو روتے لگتے تھے۔

اماں کی پوری کرنے کے لئے آبا نے ہم پر یورپین اور انگریجو انڈین گورنرس کھیں
اور ہمیں اچھے سے اچھے کاؤنٹ اسکولوں میں تعلیم دلوائی۔ مگر پر بھی ماسٹر پڑھانے آتے
اور آبا خود بھی ہمیں انگریزی اور اردو پڑھاتے تھے۔ پھر ایک دفعہ آبا دلی آئے تو میں مجتبیٰ
میں مولوی عبدالاحد کے ہاں ان کی ملاقات ڈاکٹر منیا الدین سے ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب نے
انہیں مشورہ دیا کہ بچوں کو علی گڑھ میں داخل کر دیا جائے۔ سترہ میں ہم تینوں بھائیوں کو
ایم۔ اے۔ اور اسکول علی گڑھ میں داخل کر دیا گیا۔ اُس زمانے میں بچوں کا بورڈنگ ظہور
دار تھا۔ تقریباً تین سال ہم نے علی گڑھ میں پڑھا۔ اس کے بعد عدم تعاون کی تحریک
نے زور پکڑا اور مولانا محمد علی نے جامعہ ملیہ علی گڑھ میں قائم کیا۔ آبا نے ہمیں علی گڑھ سے
اٹھالیا۔ وہ حیدر آباد سے فٹن لے کر دلی آ گئے تھے۔ ہمیں عربک اسکول میں داخل کر دیا۔

سترہ میں دلی سے میرٹھ پاس کرنے کے بعد میں نے لاہور جا کر ایٹ۔ سی کالج
میں داخلے لیا۔ وہاں سے ایٹ۔ ایس۔ سی (میدیکل) پاس کرنے کے بعد میڈیکل کالج
میں داخل ہوا۔ سڑی ہوئی لاشوں پر کام کرنے سے طبیعت اس قدر مگدور ہو رہی تھی
کہ ایک سال ہی میں وہاں سے بھاگ لیا۔ دلی آ کر میں نے انگریزی ادبیات میں
بی۔ اے (آنرز) کی ڈگری لی۔ اس سے ایک سال پہلے آبا کا انتقال فالج میں ہو گیا
تھا۔ وہ ہمارے لئے پچاس پچاس ہزار روپیہ نقد اور دو دوسو روپے ماہانہ کی جائداد
چھوڑ گئے تھے۔ اسی لئے مکے دھانے کو ہمیں کوئی فکر نہیں تھا۔ میں نے فارسی ادبیات
میں ایم۔ اے میں داخلے لیا۔ یہ سترہ کا ذکر ہے۔ میرے ایک رشتے کے بھانجے ہیں

انصار ناصر تھے جو میر ناصر علی صاحب صلائے عام کے پوتے ہیں۔ انہوں نے مجھے مشورہ
دیا کہ دلی سے ایک عمدہ ادبی ماہنامہ جاری کیا جائے۔ اپنی سمجھ میں بھی یہ بات آگئی اور بغیر
کسی تجربے یا مشورے کے جنوری سترہ میں ماہنامہ ساتی جاری کر دیا۔ کوئی چار پانچ سال
کی لٹاپٹی میں اس پرچے نے اپنی جگہ تو بنائی مگر میرے ماموں نے جو اس پرچے کا اہتمام
کرتے تھے، مجھے بتایا کہ اس پرچے پر پچیس تیس ہزار روپیہ ضائع ہو چکا ہے، اور اگر یہی
روکش رہی تو باقی روپیہ بھی یونہی نکل جائے گا۔ ادھر بھائیوں نے بھی لعنت طاعت
کی تو آنکھیں کھلیں۔ پرچے کا انتظام خود اپنے ہاتھ میں لیا اور معصرا دیوں کی کتہیں
چھاپی شروع کیں۔ ڈوہتا مہاکار و بار تر گیا اور سترہ میں ساتی بک ڈپو کی مالی حیثیت
دو لاکھ کی تھی۔ اور پندرہ ہزار روپیہ ادیبوں اور شاعروں کی طرٹ بطور شہکی باقی تھا۔
محاسبہ لیس ہڑی مشکل چیز ہے اور میرے لئے خود ستائی اس سے بھی زیادہ مشکل۔ لہذا
ایک کرم فرما کے دو خطوں کے اقتباسات درج کرتا ہوں تاکہ آپ کو میرے کچھ وہ
حالات بھی معلوم ہو جائیں جنہیں میں خود بیان نہیں کر سکتا۔ یہ خطوط راجہ مہدی علی خاں
کے ہیں اور حال ہی میں موصول ہوئے ہیں۔

”ہزاروں سال پہلے، جب آپ دلی سے کھو گئے تھے، اور آپ کی
زندگی کے بارے میں خدانخواستہ بُری بُری افواہیں پھیل رہی تھیں، یہاں کے
بہت سے دوست آپ کے لئے بے حد متفکر اور دست بدعا تھے، بہت
عرصے بعد ایک دن معلوم ہو گیا کہ آپ بفضلِ خدا خیریت سے ہیں اور پاکستا
میں ہیں۔ اس کے بعد میں مست اور بے فکر ہو کر فلمی دنیا کی مصروفیات
میں بہت بُری طرح کھو گیا۔ اور اُس وقت بھی کھو یا ہوا تھا۔ جب مجھے
عزیز دوست ملٹو کی موت کی خبر موصول ہوئی، مجھے یہ بدشیر مندی
مندی کہ اس دوران میں میں نے ملٹو کو بھی مرث دو ایک خط لکھے، اور وہ بھی

اُس کے خطوں کے جواب میں۔ سالہا سال گزر گئے لیکن میں نے پاکستان
یا ہندوستان کے کسی شاعر یا ادیب دوست کو کوئی خط نہ لکھا۔ آج سے
تقریباً ڈیڑھ سال قبل "بستر مرگ" پر میری ادبی زندگی کا دوبارہ آغاز ہوا۔
مجھے کچھ معلوم نہ تھا کہ پچھلے پرچوں میں سے کون سے دندہ ہیں کون سے مر گئے۔
اسی جستجو اور تلاش کے سلسلے میں معلوم ہوا کہ کراچی سے ساقی شائع ہو رہے۔
میرا حافظ ٹھیک نہیں رہا۔ میرا قیاس ہے کہ ایک خط میں نے آپ کو بھی
لکھا تھا۔ اس کے بعد میں پھر بھول گیا۔ ایک مرتبہ ایڈیٹر نقش کو بھی خط لکھا۔
نقش میرے نام جاری ہو گیا، شاید آپ ہی نے جاری کر لیا۔ یہ پتہ اب
بھی باقاعدگی سے میرے نام موصول ہوتا ہے۔ اور اپنی عالی ظرفی اور میری کم
ظرفی کا احساس مجھے دلاتا رہتا ہے۔ ایک دن نقش میں نقوش کے سلسلے میں
آپ کا مضمون پڑھا تو حافظ مجھے کئی سال پیچھے کی طرف لے گیا۔ دلی کی دوسری
پرانی یادیں تازہ ہونے کے علاوہ وہ گھر مایاں آنکھوں میں پھر گئیں جو کبھی آپ
کے پاس گزری تھیں۔ اور یکایک خیال آ گیا کہ جس طرح بعض دوسرے
شاعروں اور ادیبوں کے آپ کام آیا کرتے تھے، میری زندگی کا رخ
بدلنے میں بھی خدا کے بعد آپ ہی کا ہاتھ تھا۔ مجھے فلم انڈسٹری میں داخل
آپ کے معرفت ایک خط سے مل گیا، جو آپ نے میرے لئے مندرجہ مضمون کو لکھا
تھا۔ اسی قسم کے ایک سفارشی خط کی درخواست میں نے اپنے ماموں جناب
حامد علی خاں صاحب سے بھی کی تھی۔ اگرچہ انہیں ریڈیو میں لانے والا میں ہی
تھا، مگر انہوں نے مجھے سفارشی خط دینے سے انکار کر دیا تھا۔ آپ ہی میرے
کام آئے۔ آج میں جو کچھ ہوں وہ سب کچھ آپ کے طفیل سے حاصل کیا ہے۔
آپ کے اس احسان کا بدلہ نہی کبھی نہیں چکا سکتا۔

"اتنے عرصے کے بعد آپ کا گرامی نام موصول ہو کر بے حد مسرت کا
باعث ہوا۔ لیکن جب آپ کے اور ساقی کے حالات معلوم ہوئے تو میری
یہ تمام خوشی رنج و غم میں تبدیل ہو گئی۔ بہت دیر تک بلکہ بہت دنوں تک
میں پریشان و غم رہا، اور اس وقت بھی ہوں۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب کبھی کوئی ادیب کسی بہت بڑی مالی پریشانی
میں مبتلا ہوا، بھاگا ہوا آپ کے دروازے پر پہنچا اور منہتا ہوا واپس آ گیا
کہ میں اپنا مسودہ شاہد صاحب کو دے کر پیسے لے آیا ہوں۔ شاہد احمد
کا در ایک ایسا در تھا جس سے ہر وقت ضرورت مند ادیبوں کی ضرورتیں خدا
پوری کر دیا کرتا تھا۔ وہ "ڈنک" لٹ گیا۔ وہ "خزانہ" پا مال ہو گیا۔

مجھے وہ زمانہ بھی اچھی طرح یاد ہے جب میں دہلی ریڈیو پر اسٹاٹ
آرٹسٹ تھا۔ ایک مرتبہ میرے پاس کپڑے ختم ہو گئے تھے، کچھ مقررین بھی
تھا۔ میں مضرب کا مسودہ لے کر آپ کے پاس پہنچا۔ آپ نے پوچھا۔
"کیا چاہئے؟" میں نے کہا "میری ضرورتیں اس وقت تین سو روپے میں
پوری ہو جائیں گی۔ ایک منٹ کے توقف کے بغیر آپ نے تین سو روپے
لا کر مجھے دے دیئے۔ بحیثیت ایک پبلشر اور کاروباری آدمی کے آپ
کو عجیبے کہنا چاہئے تھا کہ بھائی دوسو لے لو، ڈھائی سو میں سودا ہو جائے لیکن
آپ نے مجھے فوراً وہ رقم دے دی۔ جب میں نے کہا "رسید" آپ نے
کہا: "پھر دیکھا جائے گا۔" اور آپ نے مجھ سے کبھی اس رسم کی رسد تک لینے
کی ضرورت نہ سمجھی۔

آج سے تقریباً پندرہ سولہ برس پہلے میں سو کی رقم اتنی حقیر نہیں

سمجھی جاتی تھی جتنی آج کل یہ رستم میرے بہت سے کاموں میں صرف ہوئی۔
غرض کہ سینکڑوں ادیبوں کے لئے شاہد احمد کا درجہ بس باہر تک
درجہ قائم بنا رہا وہی شاہد احمد آج خود ریڈیو میں اسٹارٹ آرٹسٹ ہے اور
صرف ساڑھے چار سو روپے ماہوار پارہا ہے۔ حالانکہ ایسے کئی ساڑھے چار
سو سو لوگ اس سے چھپیں کر لے جایا کرتے تھے۔ زندہ باد شاہد احمد جو
کبھی دلی کی رونق تھا، دلی کے ادب کا گہوارہ تھا، دلی کا "دربار" تھا،
دلی کا بادشاہ تھا۔ ہر شاعر مراد میب کے لبوں پر اس کا نام تھا۔ اس طرح
رہتا تھا کہ نام لینے والے یہ کہے بغیر نہ رہ سکتے تھے

زباں پہ بار خدا یا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے لطف نے بد سے مری زباں کے لئے

ہم لوگوں کی یہ بہت بڑی بستی ہے کہ دونوں ملکوں کا یہ صاحب طرز
انشا پرداز "واحد زباں داں" آج اس طرح "گوشہ نشینی" کی زندگی بسر کر
رہا ہے اور ہم لوگوں کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔ مٹی بھی آتی ہے اور
رونا بھی کہ شاہد احمد کا "مشغلہ روزگار" موسیقی کی تعلیم ہے۔ مجھے یوں معلوم
ہوتا ہے جیسے برادر شاہ ریڈیاں بچ رہا ہو یا شکیب پر نے "نان اور کباب"
کی دکان کھول لی ہو۔

میوزک کوئی گھٹیا چیز نہیں، میوزک سے کھپ لیتا گھٹیا ہن ہے
(میں خود میوزک ہی سے کماتا ہوں) لیکن میوزک کے جاننے والے تو ملک
میں اور لوگ بھی ہیں۔ شاہد احمد ہندوستان اور پاکستان میں صرف ایک
ہے۔ اس "صرف ایک" کی ہم سمجھ قدر نہیں کر رہے، اس "صرف ایک" کو
ہم نے نہیں پہچانا۔ اسی "صرف ایک" سے ہم نے فائدہ نہیں اٹھایا، اسی "صرف

ایک" کی عظمت سے ہم واقف نہیں۔

خیر، میرا مولیٰ کسی بہت ہی خوبصورت الماری میں رکھا ہوا کسی معمولی
طاق میں، اس کی قدر و قیمت یا اس کی عظمت میں اس سے کوئی فرق نہیں
پڑتا۔ اب بھی ہزاروں لوگ ایسے ہیں جن میں خود راجہ مہدی علی خاں جی
حقیر مستی بھی شامل ہے، جو شاہد احمد سے مصافحہ کر لینا بھی اپنے لئے باعث فخر
سمجھتے ہیں۔ بلکہ میری تو خدا سے دعا ہے کہ اے خدا اگر تو مجھے شاہد احمد جیسے
عظیم انسان، نیک دل، خدائے ترس انسان کے قدموں کی خاک کا درجہ
بھی عطا فرما دے تو میں کھوں گا مجھے عمر بھر کی عبادت کا حصہ زیادہ ملد
مل گیا۔

آپ میرے محسن ہیں۔ آپ کی وجہ سے میں فلم انڈسٹری میں آیا ہوں
خرید میں بے شمار دولت کمائی، نام پیدا کیا، اور مجھ خود غرض انسان نے
کبھی آپ کا شکر یہ تک ادا نہ کیا۔ مجھ میں اور شاہد احمد میں کتنا فرق ہے!
میری خدا سے دعا ہے کہ مرنے سے پہلے میں شاہد احمد جیسے بلند انسان
کو پہلے سے بھی زیادہ "اوپر کی بلندیوں" پر دیکھ لوں۔ بلندیوں سے میرا مطلب
دنیوی بلندیاں ہیں۔

شاہد صاحب میں آپ کے ان دوستوں میں سے ایک ہوں جو آپ
سے بہت کم ملے جو آپ کی صحبتوں میں بہت کم رہے ہوئے، لیکن ہمیشہ
دل و جان سے آپ کے گردیدہ رہے۔

شاہد بھائی، یقیناً مانئے، آپ اپنی بہت سی قیمتی چیزیں تو یہاں چھوڑ
گئے لیکن آپ کی ایک نہایت ادنیٰ سی چیز بھی یہاں رہ گئی جس کا شاید
آپ کو خیال تک نہیں۔ وہ چیز ہے راجہ مہدی علی خاں۔ کاش اس آدمی

کوہر کے قدموں کا قُرب حاصل ہو سکے۔

آپ کا گرامی نامہ پڑھ کر مجھ پر رقت طاری ہے اور کچھ میں نہیں آتا کہ اور کیا لکھوں۔

”مضراب“ کے حقوق کو ماننے پر اگر کسی شکرے ادا کر دوں گا تو آپ کے عظیم اثنان اخلاق کی توہین نہ جائے گی۔

آپ کے خط نے مجھے ۷۷۷ اور غیوط الخواس کر دیا ہے۔ خط لکھتے لکھتے بھی نروس ہوا جا رہا ہوں۔ جی چاہتا ہے کہ لکھتا ہی جاؤں، لیکن رقت اور افسوس کے جذبات پریشان کئے ہوئے رہے ہیں۔

یوں معلوم ہو رہا ہے جیسے ایک فقیر جلاوطن بہادر شاہ ظفر کو خط لکھ رہا ہے۔

دلی کا سارا کاروبار سسرے کے کشت و خون کی بھینٹ چڑھ گیا۔ اس دفتر راگدُور دو گواور اقصاء برد۔ ہمیں بیک مینی و دو گوش دلی سے نکلنا پڑا۔ پُرانے قلعہ میں تین دن پناہ لینے کے بعد ریل سے لاہور روانہ ہوئے۔ رات کو پشاور کے علاقے میں ریل پر حملہ ہوا۔ آدھی ریل کٹ گئی۔ ہم سخت جان تھے بچ گئے۔ بُرے حال ہائے دھپا دھپا لاہور پہنچے۔ یہاں کی فضا راس نہ آئی۔ دس مہینے بعد کراچی آ گئے۔ ساقی دوبارہ جا کر گیا، مگر اب اس کا نقصان کہاں سے بھرا جاتا؟ اسی تردد میں تھا کہ ریڈیو پاکستان نے میوڈک سپر دائزر کی خدمت پیش کی۔ شکرے کے ساتھ اسے قبول کیا۔ خدا جانے موسیقی کا شوق کہاں سے مجھے رگا۔ مولویوں کا خاندان، دُور دور تک گانے بجانے کا چرچا نہیں۔ مگر سُننے آئے ہیں کہ اولیا کے گھر بھوت پیدا ہو جاتے ہیں، شاید یہی بات ہو۔ سولہ سال کی عمر سے کلاسیکی موسیقی اچھے اُستادوں سے سیکھنی شروع کی تھی۔ خاندان والے

ناراض تھے کہ یہ کیا بیہودہ شوق لگایا ہے؟ میں خود بھی کبھی کبھی سوچتا تھا کہ موسیقی اور وہ بھی کلاسیکی موسیقی سے آخر حاصل کیا ہوگا؟ اب اندازہ ہوتا ہے کہ اگر میرے پاس یہ موسیقی کا علم دفن نہ ہوتا تو خدا جانے یہاں میرا حشر کیا ہوتا۔ ہاں تو سسرے سے آل انڈیا ریڈیو کے کئی اسٹیشنوں سے کلاسیکی موسیقی نشر کی کرنی شروع کر دی تھی مگر ایسے احمد کے نام سے۔ پاکستان آنے کے بعد یہ راز بھی راز نہ رہا۔ عر

گجائمانند آل رازے کو رسا زندہ مغلہا؟

اب ہمارا شمار ادب کے علاوہ موسیقی کے اُستادوں میں بھی ہوتا ہے عر ہمیں تفاوت رہ از کجاست تا بجنا!

میری زندگی کے دو پہلو ہیں: ادب اور موسیقی۔ میں خوش ہوں کہ میں نے اپنی دونوں کے علم دفن کی بُری بھلی خدمت کی اور خدا کے فضل سے نیک نامی کے ساتھ۔ اسی خدمت کی بُنیاد پر سیٹھ نے جب اپنے ممبر ملکوں کے لئے ششہ مقررین کی حکیم منظو کی تو پاکستان کے دانشوروں میں سے سب سے پہلے مجھے سسرے میں منتخب کیا کہ نقائی لینڈ اور فلی پنیز میں پاکستان کے کلچر پر ان ملکوں کے مشہور اداکاروں اور شہروں میں کچر دوں۔ مجھے اس پر فخر ہے کہ میں نے اس خدمت کو انجام دے کر اپنے ملک کی تہذیب و ثقافت سے دُور آفت وہ ملکوں کو متعارف کیا۔ سسرے میں خیر رنگالی کا ایک ثقافتی وفد ہندوستان گیا تھا۔ اس میں بھی میں نے پاکستانی ادب و موسیقی کی نمائندگی کرنے کا فخر حاصل کیا۔ لسانی، ادبی، اور موسیقی کے مذاکرات میں، منربی اور مشرقی پاکستان دونوں جگہ، مجھے شریک ہونے کا موقع اکثر دیا جاتا ہے۔ میں اسے نہ صرف اپنے لئے باعثِ عزت سمجھتا ہوں بلکہ اپنی قوم اور اپنے ملک کی خدمت حتی المقدور ان ذرائع سے کرنا اپنا فرض اور اپنے لئے سعادت سمجھتا ہوں۔

میری ساری عمر ادب اور ادیبوں کی خدمت کرتے گزری۔ سسرے کے ادیب

ناراض تھے کہ یہ کیا بیہودہ شوق لگایا ہے! میں خود بھی کبھی کبھی سوچتا تھا کہ موسیقی، اور وہ بھی کلاسیکی موسیقی سے آخر حاصل کیا ہوگا؟ اب اندازہ ہوتا ہے کہ اگر میرے پاس یہ موسیقی کا علم و فن نہ ہوتا تو خدا جانے یہاں میرا حشر کیا ہوتا۔ ہاں تو سسٹم سے آل انڈیا ریڈیو کے کئی اسٹیشنوں سے کلاسیکی موسیقی نشر بھی کرنی شروع کر دی تھی مگر ایسے احمد کے نام سے۔ پاکستان آنے کے بعد یہ راز بھی راز نہ رہا۔

گجوانند آل رازے کے بعد یہ راز بھی راز نہ رہا۔

اب ہمارا شمار ادب کے علاوہ موسیقی کے استادوں میں بھی ہوتا ہے عہد میں تفاوت رہا اور کجاست تا بحال!

میری زندگی کے دو پہلو ہیں: ادب اور موسیقی۔ میں خوش ہوں کہ میں نے اپنی دونوں کے علم و فن کی بڑی بھی خدمت کی اور خدا کے فضل سے نیک نامی کے ساتھ۔ اسی خدمت کی بنیاد پر سیٹونے جب اپنے ممبر ملکوں کے لئے لٹریچر مقررین کی اسکیم منظور کی تو پاکستان کے دانشوروں میں سے سب سے پہلے مجھے سہ۹۵ء میں منتخب کیا کہ نقائی لینڈ اور فلی پننر میں پاکستان کے کلچر پر ان ملکوں کے مشہور اداروں اور شہروں میں لکچر دوں۔ مجھے اس پر فخر ہے کہ میں نے اس خدمت کو انجام دے کر اپنے ملک کی تہذیب و ثقافت سے دور افتادہ ملکوں کو متعارف کیا۔ سہ۹۵ء میں خیر سگالی کا ایک ثقافتی وفد ہندوستان گیا تھا۔ اس میں بھی میں نے پاکستانی ادب و موسیقی کی نمائندگی کرنے کا فخر حاصل کیا۔ لسانی، ادبی، اور موسیقی کے مذاکرات میں، مغربی اور مشرقی پاکستان دونوں جگہ، مجھے شریک ہونے کا موقع اکثر دیا جاتا ہے۔ میں اسے نہ صرف اپنے لئے باعث عزت سمجھتا ہوں بلکہ اپنی قوم اور اپنے ملک کی خدمت حتی المقدور ان ذرائع سے کرنا اپنا فرض اور اپنے لئے سعادت سمجھتا ہوں۔

میری ساری عمر ادب اور ادیبوں کی خدمت کرتے گزری۔ سہ۹۵ء کے اوائل

میں جن آٹھ ادیبوں نے پاکستان رائٹرز گلڈ کا سنگ بنیاد رکھا ان میں سے ایک میں بھی ہوں۔ بلکہ مجھے کنونشن کے داعی اور صدر ہونے کی عزت بھی حاصل ہوئی۔

بہت گئی، مختصری رہی۔ اللہ توفیق دے کہ بقیہ عمر بھی اسی طرح بسر ہو جائے
شادم از زندگی خویش کہ کاسے کردم